''چہارسُو''

...... ''خداسب یادرکھتاہے'' ......

میں کہانیاں فلموں میں دیکھتاہوں۔ پڑھتاکم ہوں اورانہیں یادتو بالکل بھی نہیں رکھ پاتامگرابھی ایک کہانی نے خودکوپڑھواکردم لیاہے۔ یہ ایک ایسی کہانی معلوم ہوتی ہے جوسنانے سے زیادہ چھپانے کی کوشش میں لکھی گئی ہو۔ مجھے ایسالگاجیسے میں آگ بجھارہاہوں اورشعلے اِدھراُدھرسے جھانک رہے ہوں یا پھرگلدستہ بناتے ہوئے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑگئے ہوں۔ میں نے ایسی کہانی کبھی نہیں پڑھی جوہوتوایک انسان کی مگراس میں آدھے پاکستان کی نفسیاتی مشکلات درج ہوں۔ ہرکردارچندہی لفظوں میں سماکربھی مکمل ہو۔نہ آغازمیں لفاظی نہ انجام میں تام جھام مگربنت لاجواب۔ پلاٹ بے جھول اور کیفیت یہ کہ جیسے دل مٹھی میں آجائے۔ پھول مرجھانے کے لیے ہی کھلتے ہیں۔موت برحق ہے توپھرتوقعات کیوں؟ آخرانسانوں کوعشق ہوتاہی کیوں ہے؟انہیں یادکیوں نہیں رہتاکہ ریزہ ریزہ ہوکرجیناآسان نہیں لیکن بہرحال۔۔۔آپ خودپڑھیے''خداسب یادرکھتاہے''ایک ایساافسانہ ہے جسے آپ کبھی فراموش نہیں کرپائیں گے۔اس مختصرتحریرکایہ مطلب ہرگزنہیں کہ آصفہ نشاط کے تازہ افسانوی مجموعے''خداسب یادرکھتاہے''کے دیگرافسانے لائق توجہ نہیں ہرگزنہیں جناب ہرافسانہ اوراُس کابیان قاری کوحیران بھی کررہاہےاورسوچنے پرمجبوربھی۔

......محمداسحاق اسحاق

...... ماں ......

میں نے فرخندہ شمیم کاشعری مجموعہ دیکھااورپسندکیا۔پسندکی وجہ وہ زاویہ تھاجس سےاورجہاں سے میں نے اسے دیکھا۔ماں،ممتااورمحبت بھری دنیامیں ان تین نعمتوں کے برابرکوئی نعمت نہیں،یہی اس مجموعے کامرکزہ ہے۔فرخندہ شمیم کے ہاں محبت کی نعمت فردکی سطح پربھی ملے گی اوراوپراٹھتے ہوئےقومی و وطنی سطح پربھی۔فرخندہ جس طرح ذاتی طورپرلطیف،مہذب،خوش مزاج،سادہ اورروشن جبیں ہیں اس سب کی جھلک اُن کی آرزوؤں میں ملے گی جواُن کے شعرمیں ظہورپاتی ہیں۔حُبّ وطن مستقل ایک زیریں لہرکی صورت سب حوالوں میں یہاں ملے گیں۔فرخندہ کی زندگی اوراُن کی تخلیقات کے درمیان چولی دامن کاساتھ ہے۔تلخ ہونافرخندہ کونہ آیاتوفرخندہ کی شاعری میں طنزوتعریض کاکیسے گزرہوسکتاہے۔سوبعض ملکی شخصیات پرلکھنے کاموقع آیاتوانہوں نے صرف اچھائی اورسچائی ڈھونڈناپسندکیا۔

......پروفیسراحسان اکبر

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۳۰۰روپے، ریڈ بک،42-B،لوئرمال، لاہور

...... ہم نشینی ......

نویدسروش کی غزل میں پہلےرواں وقت نمودارہوتاہے پھران کی تخلیقی ذات سامنے آتی ہے۔ان کے اظہاراورابلاغ میں کوئی چیزرکاوٹ نہیں بنتی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھےان کی تخلیقی شخصیت زمانے کونئے تقاضوں کے مطابق تبدیل کرنے میں کوشاں نظرآتی ہے۔شایدیہ سندھ کی درویش دھرتی کے اثرات ہیں جو غزل کی امیجری میں ظاہرہوتے ہیں تودل پرمستقل اثرچھوڑجاتے ہیں۔میں کہہ سکتاہوں کہ اکیسویں صدی کی غزل کاایک روپ نویدسروش نئے رنگوں میں ہمارے سامنے لارہے ہیں۔ان کے غُرفہ غزل سے جوکرنیں اُبھررہی ہیں وہ نئے احساس کی آئینہ دارہیں۔میراتاثریہ بھی ہے کہ نویدسروش جب غمِ زمانہ سے دوچارہوں توان پرغزل اترتی ہےلیکن جب اپنی ذات کی درزوں میں سے جھانکیں توان پرنظم نازل ہوتی ہے۔ان کی نظم میں واحدمتکلم کاکردارنمایاں حیثیت رکھتاہےلیکن یہ کرداروقت کی خوشبومیں گم ہوجانے کی بجائےخوشبوکےاس پارجانے کی کوشش بھی کرتاہے۔بندہ بشرہونے کے ناتے ان کے ہاں کبھی کبھی معرکہ آرائی کاعنصربھی ابھرآتاہے۔یہ صورت پیداہوتی تووہ اس پرغالب آنے کی کوشش شروع کردیتے ہیں اورپھراپنی زندگی کورقصندہ کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔احساس کی یہ شاعری لطافت سے معمورہےاوراپنے آہنگ کی انفرادیت سے پہچانی جاتی ہے۔

......ڈاکٹرانورسدید

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۴۰۰روپے، رنگِ ادب، کراچی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۳'شمارہ:جولائی،اگست ۲۰۱۴ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرمسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِسالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ:1-D/537'ویسٹریج-III'راولپنڈی،پاکستان۔

فون:(+92)-51-5462495,5490181

فیکس:(+92)-5550886

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق------شعیب حیدر زیدی

تزئین------------عظمیٰ رشید

کمپوزنگ------------تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

باوا کے نام لکھنا----------ابراہیم عدیل ۵

براہِ راست------------گلزار جاوید ۶

سُکھ دی نیندر-------------فاری شا ۱۱

پرانی صحبتیں-------------محمود شام ۱۵

حقیقت پسند کہانی کار---------انتظار باقی ۱۷

وہ اور میں-------------مصطفیٰ کریم ۱۹

افسانوی ادب-----------ناصر عباس نیرّ ۲۱

باہر کا آدمی-------------صفدر علی شاہ ۲۴

ہمدردانہ حقیقت نگاری-------غلام شبیر اسد ۲۶

تنہائیوں کے درمیاں---------عامر عبداللہ ۲۸

دائروں سے باہر-----------پروین طارق ۲۹

باہر کا آدمی-------------حنیف باوا ۳۰

پرتوِ خیال--------------حنیف باوا ۳۲

اُنتیس مئی کو سلام-----------حنیف باوا ۳۴

محبت کے مظاہر-----------عطیہ سکندر علی ۴۰

خوفِ مکافات

منظر ایوبی، غالب عرفان۔ ۴۳

افسانے

پریت نہ جانے کوئے----------عذرا اصغر ۴۴

اندھے چاند کی صدا---------رخسانہ صولت ۴۸

اللہ کی زمین-------------نیلم احمد بشیر ۵۰

سجدۂ سہو--------------فرخندہ شمیم ۵۳

سچ بولنا سیکھو

مظفر حنفی، سرور انبالوی، معصوم شرقی، محمود الحسن، تشنہ بریلوی، حسن عسکری کاظمی، غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، خیال آفاقی، ۵۵
غلام مرتضیٰ راہی، انتظار باقی، سریوا ستورند، صفوت علی، سیفی سرونجی، مراق مرزا، زہیر کنجاہی، احسان احمد شیخ۔

افسانے

چکّر--------------احمد زین الدین ۶۳

صدر ضیاء------------نصرت بخاری ۶۷

پاگل--------------وقار مسعود خان ۶۹

افسانچے------------انوار انجم ۷۰

حسرتوں کا بوجھ

کرامت بخاری، شاہین زیدی، ظریف احسن، شگفتہ نازلی، انیس الرحمٰن، زاہدہ عابد حنا، نور زمان ناوک، احمد ظہور، منظور ثاقب، صابر عظیم آبادی، جہانگیر اشرف، تصور اقبال، انجم جاوید، نوید سروش، شائستہ سحر، مشتاق اعظمیٰ، اسد اعوان، سمیع نوید۔ ۷۲

ہوا کے دوش پر

ایک عام آدمی کی داستانِ حیات----فیروز عالم ۷۸

عراق جل رہا ہے

سفرنامے کا ایک باب---------سلمیٰ اعوان ۸۴

خوشبو کے سہرے

ندا فاضلی، محمود الحسن، یونس صابر، رؤف خیر، جاوید زیدی، پرویز شہریار، ریاض احمد، کاوش پرتاپ گڑھی، وشال کھُلر، شگفتہ نازلی، شاہد عزیز، حفیظ انجم۔ ۸۹

آئینۂ فن

منظر نگاری کا حاصل-------ڈاکٹر تقی عابدی ۹۷

نشانِ راہ

اوراقِ رخشندہ------------سید وارث شیر ۱۰۱

حیاتِ ابدی

خوشونت سنگھ اور نشاطیہ کلچر-------زبیر رضوی ۱۰۳

زمیں کھا گئی--------------کرشن نندہ ۱۰۵

بساطِ بشاشت

پہلا افسانچہ-------------قمر نقوی بخاری ۱۰۶

ایک صدی کا قصہ

اشوک کمار--------------دیپک کنول ۱۰۹

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین--------وقار جاوید ۱۱۴

''باوا کے نام لکھنا''

چاہت کی ہر کہانی باوا کے نام لکھنا
دریا کی یہ روانی باوا کے نام لکھنا

تیشے نے جس کے توڑی یہ رات کی سیاہی
ہر اک سحر سہانی باوا کے نام لکھنا

رہتا ہے بس دلوں میں ہوتا نہیں بیاں جو
اس غم کی ترجمانی باوا کے نام لکھنا

سب رنگ ہیں دھنک کے افسانے اس کے دیکھے
خوشبو کی راجدھانی باوا کے نام لکھنا

مانگی دعائیں مل کر گلشن میں طائروں نے
اک تازہ خوش بیانی باوا کے نام لکھنا

یہ چاند یہ ستارے پھولوں بھرے نظارے
اے میرے یار جانی باوا کے نام لکھنا

جس کے وجود میں ہیں پوشیدہ کائناتیں
اس لفظ کے معانی باوا کے نام لکھنا

کس کی یہ گفتگو کے جادو سے ہو گیا ہے
موسم کا رنگ دھانی باوا کے نام لکھنا

فن کی عدیل دنیا ایک بحرِ بے کراں ہے
اس کا نہیں ہے ثانی باوا کے نام لکھنا

ابراہیم عدیل (جھنگ)

○
○○
○☆○
○○○○

قرطاسِ اعزاز

☆○☆

حنیف باوا

☆○☆

کے نام

○○○○
○☆○
○○
○

براہِ راست ——

مٹی کی محبت میں افتخار عارف نے ناواجب قرض اُتار کر اردو ادب میں نئی طرح کا اضافہ کیا ہے۔ ہے کوئی، کوئی ہے! جو حنیف باوا کے وہ تمام قرض اُتارے جو علم و ادب کی محبت میں ہم سب پر واجب ہیں اور نہ جانے کب تک واجب رہیں گے! مگر نہیں، ہم لوگ شاید محنت، محبت، وفا، ایثار اور قربانی سے نا آشنا ہو چکے ہیں اور خدا معلوم کب تک رہیں گے؟ وقت کا بے آواز گردوں یہ گواہی ضرور دے گا:

کوہ کن نقّاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہوئے نہ پیدا آشنا

○

—— گلزار جاوید

☆ کچھ پُرکھوں کے بارے جان کاری دیجیے؟

☆☆ میرا تعلق مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کی تحصیل سمرالہ کے گاؤں ''چک سرائے'' سے تھا۔ میرے پرکھوں کا پیشہ پارچہ بافی تھا۔ مجھے اس پیشے کے بارے میں یہ تو معلوم نہیں کہ یہ کب ہمارے خاندان کا حصہ بنا لیکن اتنا ضرور دیکھا ہے کہ میرے دادا تاج الدین نے اس پیشے کو اپنے باپ دادا سے حاصل کر کے اسے عملی صورت دے رکھی تھی۔ وہ زمینی کھڈّی (جسے پنجابی میں ''کُمبھل'' کہتے تھے) پر کھدر کا کپڑا تیار کیا کرتے تھے۔ یہ کھدر اُن کا اپنا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ گاؤں کا کوئی نہ کوئی سکھ زمیندار اُنہیں دھاگا دے جایا کرتا اور میرے دادا اس دھاگے کو کئی مراحل سے گزار کر اُس کا کپڑا تیار کرتے اور انہیں دے دیتے اور اس کے عوض وہ میرے دادا کو گندم یا مکئی دے جایا کرتے۔ جب کبھی انہیں جنس کی اتنی زیادہ ضرورت نہ ہوتی تو وہ ان سے تیار شدہ کھدّر کی مزدوری پیسوں کی صورت میں طلب کرتے۔ اس طرح ان کے گھر کا نظام چلتا رہتا۔ میرے دادا کے پانچ بیٹے تھے جب وہ اس قدر محدود آمدنی میں پل کر جوان ہوئے تو انہوں نے بھی اسی پیشے کو اختیار کیا لیکن کچھ مدت کے بعد یہ زمینی کھڈّی (کُمبھل) دستی کھڈّی میں بدل گئی۔ اب یہ کھڈّی گڑھے سے نکل کر زمین کے سینے پر ایستادہ ہو گئی تھی۔ اب ہم زمینداروں کے مرہونِ منت نہیں رہے تھے۔ اب کھدّر کو چھوڑ کر بڑھیا قسم کا سوتی کپڑا تیار کرنے لگے تھے۔ اس سے اب ہمارا خاندان آسودہ حال ہو گیا تھا۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تک اسی دستی کھڈّی پر کپڑا تیار کرتے رہے پھر برقی کھڈّی (پاور لُومز) تک رسائی حاصل ہو گئی جو آج تک ہمارے خاندان کے کسی نہ کسی فرد کے تصرف میں ہے۔

☆ گلی، محلے اور سکول میں گزرے دنوں کی یادوں کو آواز دینے کی کوشش میں کیا ہاتھ آیا کرتا ہے؟

☆☆ ہمارا سکول ہمارے گاؤں ''چک سرائے'' سے دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ یہ خالصہ ہائی سکول تھا، جسے سکھوں کی ایک تنظیم چلایا کرتی تھی۔ یہ جسپالوں نامی گاؤں کے آخر میں واقع تھا۔ یہ دو حصّوں پر مشتمل تھا، ایک حصّہ پرائمری جماعتوں کے لیے تھا اور دوسرا حصّہ ہائی کلاسز کے لیے مختص تھا۔ پرائمری حصّے کے انچارج ماسٹر آتما رام تھے۔ وہ پہلی جماعت سے لے کر چہارم تک تنہا پڑھایا کرتے تھے۔ وہ بڑے شفیق تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے شاید ہی کسی طالب علم پر تشدّد کیا ہو۔ جب کسی بچے کو کبھی سبق میں مشکل پیش آتی تو وہ بڑے پیار سے اُسے اُس مشکل سے نکالتے۔ وہ بڑے وجیہہ اور سانولے رنگ کے مالک تھے۔ اُن کا نکلتا ہوا قد اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتا تھا وہ سدا کلین شیو رہا کرتے۔ اُن کا کتابی چہرہ اور چھریرا بدن، سفید کرتے اور سفید پاجامے میں بڑا پھبتا تھا۔ اُس دور میں آج کی طرح کتابوں کی بھرمار نہیں ہوا کرتی تھی اُس وقت کے استاد ایک کتاب، ایک تختی اور سلیٹ سے کام چلا لیا کرتے تھے۔

اُس وقت میرا طالب علمی کا زمانہ بڑی سادگی اور کسمپرسی سے گزرا۔ ایسی حالت میں بھلا ہم سے ایسے واقعات کہاں سرزد ہو سکتے تھے جنہیں آج تک یاد رکھا جاتا۔ ہم تو صبح ناک کی سیدھ سکول جاتے اُسی طرح ناک کی سیدھ میں واپس گھر آ جاتے۔ البتہ گاؤں کی وہ گلیاں جن میں چلتے پھرتے میرا بچپن گزرا، جہاں چاندنی راتوں میں ہم دوست مل کر ''لُکن میٹی''، ''کُکو کا ہنگڑے'' اور ''پیچو بکری'' کھیلتے۔ ان کچّی گلیوں کی دُھول نے بارہا میرے پاؤں کو چوما۔ جب میں اپنے خستہ حال مکان میں رہتے ہوئے چودہ برس کا ہوا تو ہمارے گاؤں کے ایک درزی کی نواسی ''دِیپو'' میرے دل میں ایسے بسی، پھر کبھی نہ نکل سکی۔ دِیپو سوہنی دیپو جب بھی اپنے تخیال آتی تو میرا تو جیسے گول گول ہرا ہو جاتا۔ وہ جب بھی اپنے

''نانکے'' گھر سے نکل کر اپنے ماموں کے گھر کی طرف جاتی تو مَیں اُس کے پیچھے پیچھے ہولیتا لیکن میں نے اُس سے بات کرنے کی کبھی جرأت نہ کی اس لیے کہ وہ سکھوں کے کھاتے پیتے گھرانے کی چشم و چراغ تھی اور میں ایک نِمانا سا غریب لڑکا۔ میں تو صرف اُس کے خوبصورت چہرہ کو دیکھ کر خوش ہولیا کرتا تھا۔ جب وہ ٹھمک ٹھمک کر چلتی تو میرا دل کِھل اُٹھتا، جب وہ اپنی سہیلی سے کوئی بات کرنے کے لیے لَب کھولتی تو اُس کی باریک سی آواز چوڑیوں کی چھن چھن کے مشابہ ہوتی۔ جسے سُن کر میرا اُن لبوں کو چومنے کو جی چاہنے لگتا لیکن میں ایسا کبھی نہ کر پاتا تھا۔ آج جب میں اَسّی سال کا ہو چکا ہوں لیکن آج جب بھی دِیپو میری یادوں کی پٹاری سے نکل کر میرے سامنے آتی ہے تو مجھے وہ آج بھی اُسی روپ میں دکھائی دیتی ہے جس روپ میں وہ اس وقت نظر آیا کرتی تھی۔ وہی سوہنا چہرہ، وہی بانکی چال، وہی چُوڑیوں کی طرح چھنکتی آواز۔

☆ تقسیم ہند کے وقت آپ مشرقی پنجاب میں مقیم تھے۔ اس حوالے سے کچھ آپ بیتی کچھ آنکھ بیتی سنائیے؟

☆☆ چونکہ ہم شہر لُدھیانہ سے قریباً بارہ کوس کے فاصلے پر گاؤں کے رہائشی تھے۔ اس لیے آزادی کے حصول کے لیے ہندوستان میں تحاریک چل رہی تھیں، اُن کا احوال ہمارے اس دور دراز کے گاؤں میں پہنچنا کارِدارد تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت خبروں کو دُور دُور تک پہنچانے کے ذرائع بہت کم تھے۔ ایک ذریعہ اخبار تھا اور دوسرا آل انڈیا ریڈیو تھا۔ لیکن ہمارے گاؤں میں ان دونوں ذرائع کا فقدان تھا۔ ہاں جب کبھی کوئی شخص کسی کام کے سلسلے میں لدھیانے جاتا تو وہاں سے کچھ معلومات حاصل کر کے لے آتا۔ میں چونکہ اُس وقت سنِ شعور کو نہیں پہنچا تھا اس لیے آزادی کے بارے میں میرے سامنے جو بھی بات ہوتی تو وہ میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ ہاں البتہ جب میں خود لدھیانے شہر اپنے ننھیال جاتا تو وہاں جو نعرے سُننے کو ملتے وہ کچھ یوں تھے؛

''نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر، لے کے رہیں گے پاکستان، پاکستان زندہ باد''

''بندے ماترم''

جو بولے سونہال، ست سری آکال، وغیرہ وغیرہ۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے کوئی ایک ماہ پیشتر ہم اپنا گاؤں چھوڑ کر اپنے ننھیال آ گئے تھے۔ میرے نانا شہر کے تیسرے ڈویژن میں قیام پذیر تھے، ہم وہاں پر رہنے لگے۔ تمام شہر پر خوف کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ہر فرد سہما سہما سا دکھائی دیتا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے لوگوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر یہ کشیدگی قتل و غارت گری میں کیا تبدیل ہوئی، شہر کی گلیوں محلوں میں خون بہنے لگا۔ جہاں پر ہندوؤں کی اکثریت تھی وہاں پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی، جہاں مسلمانوں کی بہتات تھی وہاں پر وہ اپنا کام دِکھا دیتے تھے۔ شہر میں مسلسل کرفیو کا نفاذ بھی رہا لیکن خون بہنا بند نہ ہوا۔ آخر ایک روز سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ تمام مسلمان اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنی تشریف کا ٹوکرا، بڑھے دریا کے کنارے لے جائیں، وہاں پر تمہارے لیے ایک کیمپ کا انتظام ہے۔ اگر کسی مسلمان نے گھر چھوڑنے پر تاخیر کی تو اُس کی زندگی کے ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ شہر کے تمام لوگ اس کیمپ میں آ گئے اور چند روز تکالیف سہنے کے بعد ہم لوگ ریل کے ذریعے پاکستان پہنچ گئے۔ ہاں یاد آیا کہ جب ہماری گاڑی پاکستان کی حدود میں داخل ہوئی تو ہماری جان میں جان آئی اور پاکستان کی حدود میں داخل ہونے کی خوشی میں نعرے لگانے لگے ''پاکستان زندہ باد'' پھر جب ہماری گاڑی نعروں کی گونج میں آگے بڑھی تو ہماری نظر اُس گاڑی پر پڑی جو پاکستان سے انڈیا جا رہی تھی اس میں جو بھی ہندو، سِکھ سوار تھے وہ بھی ہماری طرح سہمے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے گاڑی کے تمام ڈبوں میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ جب وہ گاڑی ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو ہماری طرف سے نعروں کی گونج میں اس قدر اضافہ ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن اُس گاڑی میں ہماری طرح کے جو شرنارتھی تھے وہ نعروں کو سُن کر شدید خوف زدہ ہو گئے، بالکل اُسی طرح جس طرح کے ہم امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر سکھوں کے نعرے، جو بَولے سونہال، ست سری آکال، سن کر ہوئے تھے۔

☆ ادب کی للک آپ کو کب اور کیونکر لگی؟

☆☆ میرے اندر سے جب اس خواہش نے سر اٹھایا کہ کیوں نہ میں کچھ ایسا کر دکھاؤں، جس کے ہونے سے میں دوسروں سے نمایاں نظر آؤں۔ چنانچہ میں نے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے پینٹنگ کا سہارا لیا لیکن جب میں نے دیکھا کہ مصوّری سے میری تخلیقی صلاحیت پوری طرح اُجاگر نہیں ہو پا رہی اور میں وہ کچھ تخلیق نہیں کر پا رہا جو میں کرنا چاہ رہا تھا بالآخر میں نے اپنی اس صلاحیت کا رُخ ادب کی طرف موڑ لیا چنانچہ میں نے برش کو ایک طرف دھر دیا اور ہاتھ میں قلم تھام کر کہانیاں تحریر کرنے لگا، سو آج تک میں اسی صِنف کی آبیاری میں لگا ہوا ہوں۔

☆ ابتدا میں کیا کچھ لکھا اور لوگوں کا ردِعمل کیسا رہا؟

☆☆ میں نے ابتدا میں کہانیاں اور انشائیے تحریر کیے، شاعری میں بھی تھوڑی بہت شُد بدھ پیدا کی۔ ابتدا میں شروع کیا ہوا سفر آج تک جاری ہے۔ باقی رہی بات لوگوں کے ردِّعمل کی تو بھائی! لوگ ادب پڑھتے کب ہیں کہ وہ اپنے ردِّ عمل کا اظہار کریں۔ اگر لوگوں سے آپ کی مراد نقاد ہیں تو ان کے ردِّعمل کے اظہار کو میرے بارے میں لکھے گئے مقالات اور مضامین میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

☆ آپ کے سر میں مغل بادشاہ کا دماغ ڈالنے سے مراد کیا ہے؟

☆☆ بھلا میرے سر میں کسی مغل بادشاہ کا دماغ کیسے سما سکتا ہے۔ جناب میرے سر میں تو میرا ہی دماغ ہے۔ اگر میرے سر میں مغل بادشاہ کا دماغ ہوتا تو میرا جو اتنا تخلیقی کام ہے وہ کیسے منظرِ عام پر لایا جا سکتا تھا۔

☆ سجاد حیدر آپ کو عام آدمی اور آپ کے کرداروں کو نچلی کلاس کے انسان کیوں کہتے ہیں؟

☆☆ حقیقت یہ ہے کہ سماج جن افراد سے ترتیب پاتا ہے، ہر آدمی/فرد اپنی شناخت کا معیار الگ رکھتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک تخلیق کار تمام سطحوں کے افراد کو زیرِ بحث لائے بلکہ تخلیق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ تخلیق کار صرف تخلیقی تقاضے پورے کرے۔ افراد کا طبقات میں منقسم ہونا بجائے خود تخلیق کار کے لیے ایک مضبوط موضوع ہے۔ ماحول میں جب کوئی واقعہ/حادثہ/سانحہ رُونما ہوتا ہے تو وہ ہر بندے کو کسی نہ کسی سطح پر متاثر کرتا ہے۔ ایک تخلیق کار جس سطح پر تاثر لیتا ہے وہ اُسے تخلیقی اُپج سے اُس واقعے کو لازوال فن پارہ بنا دیتا ہے۔ رہی بات آپ کے سوال کے نکتہ کی تو انسان فطری طور پر مظلوم کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے تو طبقات میں بٹے معاشرہ میں مظلوم کی دادرسی کرنا یا اُس سے اظہارِ ہمدردی کرنا، یہ ایک فطری عمل بن جاتا ہے۔ تخلیق کار تو سماج قبول کرداروں کو نام دیتا ہے اور کسی سانحہ کے رُونما نہ ہونے پر بھی از خود سانحہ تخلیق کرتا ہے اور اپنے فن کے ذریعے اُسے اَمر کر دیتا ہے۔

☆ اُن صاحب کا نام تو بتلایئے جن کے کہنے پر آپ نے اردو افسانہ نگاری کا آغاز کیا؟

☆☆ ایسا کوئی نام یا فن پارہ میرے مدِّ نظر نہیں تھا جس نے مجھے اردو افسانے کی تحریک دی ہو یا رغبت دلائی ہو۔ تخلیق کار کا خاصا یہ ہے کہ وہ کئی جہات میں سفر کرتا ہے جب ایک جہت سے جی اُوب جاتا ہے تو وہ دوسری سمت کو شادابی محسوس کرتے ہوئے اپنا زورِ قلم منواتا ہے۔

☆ آپ کے افسانوں میں دکھوں کا پٹارا کیوں کھل جاتا ہے؟

☆☆ ابتدا سے انسان دُکھوں کی آماجگاہ ہی تو رہا ہے۔ فلسفہ، منطق اور دیگر علوم آدمی کو انسان بنانے کی تگ و دو میں جہاں تک بھی پہنچے ہیں، ایک بات واضح ہے کہ دُکھ کا مداوا نہ ہوتا تھا نہ ہوا ہے۔ بلکہ دُکھ کو دولت قرار دے کر تشفی کا سامان کیا گیا۔ بلکہ درد و غم، سوز و ساز کے حامل افراد کو خاص مخلوق گردانا گیا۔ آپ کا سوال صرف میری کہانی کو حاوی نہیں ہے بلکہ اردو افسانے کی تاریخ دُکھوں کے بیان سے خالی نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہر کہانی کسی دُکھ کے نتیجے میں ظہور کرتی اور انجام پاتی ہے۔

☆ آپ کے افسانوں کا کینوس بھی مختصر ہوا کرتا ہے؟

☆☆ مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ سچی اور اچھی تخلیق کا کینوس ہمیشہ آفاقی سطح کا ہوتا ہے، یہ قرأت کے انداز پر منحصر ہے کہ قاری کہانی کے کن ابعاد تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اگر قرأت کے تقاضوں کو پورا کیا جائے تو ہر کہانی محدود کینوس کی حامل نہ ہوگی۔

☆ اس خیال میں کہاں تک صداقت ہے کہ آپ صنعتی اور سائنسی زندگی سے خوف زدہ ہیں؟

☆☆ میں صنعتی اور سائنسی زندگی سے خوف زدہ ہرگز نہیں ہوں بلکہ ان دو پہلوؤں نے انسان کے لیے جو مشکلات کھڑی کی ہیں اُن کو دیکھ کر دل میں ہول اٹھتے ہیں کہ اس طرزِ زیست نے جہاں انسانی قدروں کو پامال کیا ہے وہاں اقدارِ حیات کو بھی سبوتاژ کیا ہے۔ اقبالؔ نے سچ ہی تو کہا تھا:

ے ہے دل کے لیے موت، مشینوں کی حکومت

دراصل اس صورت حال نے انسانوں کے مابین پائے جانے والے احساس ہمدردی کو پامال کیا ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کے موضوعات میں جدت نہ ہونے کا گلہ بھی کرتے ہیں؟

☆☆ یہ اُن کا اپنا نکتہ نظر ہے۔ آپ نے بجا طور پر سچ فرمایا اور لوگوں کا ذکر کیا۔ لوگ خاص درجہ میں نہیں ہوتے جو خاص ہیں ان کو مجھ سے یا میری کہانی سے کوئی شکایت نہیں ہے اور ہو بھی تو مجھے اُن کی رائے کا احترام کرنا چاہیے۔ ادب کا تقاضا بھی یہی ہے کیوں کہ میں خود کو منوانے کے لیے سماجی اوزاروں کو استعمال نہیں کرتا بلکہ سارا دھیان اپنے کام پر دیتا ہوں۔

☆ معاشرے کے آسودہ حال طبقے کو آپ نے قطعی طور پر نظر انداز کر رکھا ہے؟

☆☆ آپ ذرا ٹھہر کر سوچیں تو میری کہانیاں اِنہی کی پیدا کردہ ہیں جنہوں نے عام آدمی کی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی آسودہ حالی کا سارا کریڈٹ اُن لوگوں کو جاتا ہے جو اپنی محنتوں سے تھکے جاتے ہیں مگر محنت کے عوض پہ اُسی طبقے کا اجارہ ہے۔

☆ آپ کے ہاں احساسِ لطیف سے پرہیز کی کیفیت بھی شدت سے محسوس کی جاتی ہے؟

☆☆ میرے خیال میں ایک تخلیق کار جب تک احساسِ لطیف کا روادار نہیں ہوتا تب تک وہ لطائفِ فن سے واقف نہیں ہوتا ہے۔ ہر کہانی کا ظہور احساس کی گہری سطح سے ہوتا ہے۔ کہانی کی مقبولیت کا انحصار اسی احساسِ لطیف پر ہوتا ہے جو قاری کو کہانی کے لطف و کرم سے ثمر بار کرتا ہے۔ بلاشبہ کہانی کی شعریات کا تقاضا بھی یہی ہے۔

☆ سردی کے موسم کا ذکر اس قدر شدت سے کیوں کیا کرتے ہیں؟

☆☆ اس لیے کہ میں ایک سچے مزدور کی طرح لمبی راتوں میں قلم کی بھرپور مزدوری کرتا ہوں اور ٹھنڈک کو ماحول میں اور اپنے احساس میں اترتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے بالعموم موسمِ سرما، تنہائیوں کے ساتھ ساتھ کئی موضوعات سے ثمر بار کرتا ہے اور جس سطح پر عام آدمی ٹھنڈک متاثر ہوتا ہے وہ کیفیت میرے حواس پر حاوی ہو جاتی ہے۔

☆ آپ افسانہ کا آغاز اپنی عدم وابستگی سے کرتے ہیں مگر اس اخفا کو زیادہ دیر نبھا نہیں پاتے؟

☆☆ تخلیق کار کوئی بھی کہانی تخلیق کرتے ہوئے اس احساس سے عاری ہوتا ہے کہ وہ کہاں تک اس میں شامل ہے یا نہیں ہے۔ میں نے کہانی کو اپنی ذات کا نوحہ نہیں بننے دیا بلکہ کہانی کے تقاضوں کے مطابق جو محسوس کیا ہے وہ برملا لکھا

ہے۔ اگر کہیں ایسی بات کا شائبہ ہو کہ کہنای کے جملہ کردار میری ذات سے وابستہ ہوں تو ایسا ہرگز نہیں ہے اور کسی بھی تخلیق کار سے ایسی توقع کرنی بھی نہیں چاہیے۔

☆ محمود شام حنیف باوا کو ادھوری کہانی سے تعبیر کیوں کرتے ہیں؟

☆☆ محمود شام کا اپنا خیال ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کے ساتھ گزرے ہوئے وقت اور اُن ادبی محفلوں میں ہونے والی بحث وتکرار کے نتیجے میں ایسا کوئی تاثر قائم کیا ہوا، اگر انہیں میری کہانی ادھوری محسوس ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کہانی کا کوئی پہلو گم شدہ ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کہانی جہاں انجام پاتی ہے وہاں حیرت سر اُٹھاتی ہے اور اسی حیرت کی زد میں آ کے انہوں نے یہ بات کہی ہو۔ یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ہر قاری کی توقعات سے کہانی مطابقت رکھتی ہو اگر وہ از خود کوئی معنی برآمد کرنے میں کامیاب نہ ہو تو اسے حق حاصل ہے جو چاہے کہے۔

☆ ایک زمانے میں بیانیہ کہانی لکھتے لکھتے آپ علامتی کہانی کی طرف بھی چلے گئے تھے؟

☆☆ یہ شعوری طور پر نہیں ہوتا ہے بلکہ عصری تقاضے غیر محسوس طور پر تخلیق کار کے لیے محرّک ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی نظریاتی وابستگی کو اہمیت نہیں دی ہے بلکہ ہمیشہ جو محسوس کیا ہے اُسے تخلیقی رنگ میں پیش کرنے کی جستجو کی ہے۔

☆ آپ نے افسانوں میں ''میں'' کا کردار تخلیق کر کے خود کو مظلوم بنانے کی کوشش بھی کی ہے؟

☆☆ واحد متکلم سے مراد کبھی بھی کہانی کار نہیں ہوتا بلکہ ''میں'' ایک فکری گروہ کی نمائندہ آواز کو کہا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نے ''میں'' سے ''حنیف باوا'' مراد لیا ہے تو مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔

☆ سماجی حقیقت نگاری اور صوفیانہ ہمدردانہ رویہ کس امر کا غماز ہے؟

☆☆ انسانوں کے مابین کئی طرح کے روّیے پائے جاتے ہیں۔ ہر تخلیق کار اپنے حسبِ حال روّیوں کو نشان زد کرتا ہے اور اُن کا محاکمہ کرتا ہے۔ ہر تخلیق کار بہر طور انسانیت کا ہمدرد ہوتا ہے اور اُن کے دکھوں کو اپنا درد سمجھتا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ وہ انسانوں کی ہمدردی کو بے دردی سے زیرِ قلم لائے اور حقیقت واضح ہو جانے پر اُس کا برملا اظہار نہ کرے۔ دہن دُریدہ حقیقت نگار ہونا مجھے کبھی پسند نہیں رہا ہے۔

☆ انشائیہ سے آپ کی ملاقات کس کے توسط سے ہوئی اور پہلا انشائیہ آپ نے کب تحریر کیا؟

☆☆ انشائیہ سے میری شناسائی ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے توسط سے ہوئی۔ میرا پہلا انشائیہ ''چاک'' تھا۔

☆ ناصر عباس نیّر کے خیال میں آپ اپنے انشائیوں میں ''ثقافتی نکتہ آفرینی'' پر بہت زور دیتے ہیں؟

☆☆ اصل بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے مطابق میری انشائیہ نگاری میں نکتہ طرازی کا ثقافتی پہلو زیادہ مضبوط ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں انشائیہ کے لیے جو بھی موضوع منتخب کرتا ہوں۔ اُس کے مروجہ معانی سے انحراف کر کے جب میں نئے معانی تلاش کرتا ہوں تو غیر شعوری طور پر ثقافتی نکتہ طرازی یا موضوع کے خفیہ معانی دَر آتے ہیں۔ فی طور پر میرے انشائیوں کا اعتبار و وقار ناقدین ہی صحیح طور پر جانتے ہیں۔

☆ آپ کی اکثر تخلیقات میں پنجابی سے ترجمہ لکھا ہوتا ہے ''گرمکھی'' زبان سے آپ کی آشنائی کب اور کس طور ہوئی اور اس زبان میں آپ کی استعداد کس معیار کی ہے؟

☆☆ آر۔ایس خالصہ ہائی سکول جسپالوں کے پرائمری حصّے کو پاس کر کے میں پانچویں جماعت میں پہنچا تو وہاں مجھے گورمکھی پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ لازمی مضمون کے طور پر پڑھنا پڑھ رہا تھا۔ قریباً ڈیڑھ سال کے عرصے میں مَیں نے اس میں کافی دسترس حاصل کر لی تھی۔ جب میں چھٹی جماعت میں تھا تو ہندوستان کا بٹوارا ہو گیا۔ جس کے نتیجہ میں ملکِ پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ ہم مشرقی پنجاب کو چھوڑ کر پاکستان میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں آ کر بھی میں نے گورمکھی پڑھنا ترک نہ کیا اور اس حوالہ سے مسلسل کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ نتیجتاً آج مجھے اس گورمکھی زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔

☆ اسلامی رجحان کے حامل لوگ پنجابی زبان اور ثقافت کو غیر مسلموں سے جب منسوب کرتے ہیں تو آپ کا ردِّعمل کیا ہوتا ہے؟

☆☆ اسلامی رجحان رکھنے والے جن لوگوں کی آپ بات کر رہے ہیں یا تو وہ نادان ہیں یا پھر پنجابی زبان کی مخالفت میں ایسی سوچ رکھنے پر مجبور ہیں۔ حالانکہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پنجابی زبان کے پہلے شاعر بابا فرید گنج شکر ہیں جو پکے مسلمان تھے۔ گورونانک دیو تو باباجی سے کئی سو سال بعد آئے ہیں۔ گورونانک دیو جی کے آنے کے بعد بھی بہت سے مسلمان صوفی شعراء نے شاعری کے انمول موتی پنجابی زبان کی ''جھولی'' میں ڈالے، باقی رہی میرے ردِّعمل کی بات تو میں ایسے لوگوں کی ان باتوں کو ردخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔

☆ اوّل یہ کہ جید اور ثقہ ناقدین نے آپ کو وہ توجہ نہیں دی جس کے آپ بجا طور پر حقدار تھے۔ دوئم یہ کہ آپ کی پنجابی شاعری کو سرے سے قابل ذکر نہیں گردانا جاتا؟

☆☆ اس ضمن میں صرف یہ کہوں گا کہ میں نے ہمیشہ اپنے کام پر توجہ دی ہے۔ صلے اور ستائش کی تمنّا سے خود کو دُور رکھا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں میرے کام نے بہت سے ناقدین کو اپنی طرف راغب کیا ہے اور انھوں نے اظہار بھی کیا۔ اور ایسے ناقدین نے بھی سراہا جن سے میری شناسائی کبھی نہیں رہی۔ میرے لیے نہایت خوش آئند امر ہے کہ جو کچھ بھی لکھا گیا ہے کسی بھی شخصی حوالے کے بغیر لکھا گیا ہے۔

☆ آپ کے خیال میں پنجابی زبان اور ادب کا ہمارے خطے میں

مستقبل کیا ہے؟

☆☆ پنجابی زبان کے مستقبل کو کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک پنجابی میں لکھنے والوں کے ہاتھوں میں قلم رہے گا، پنجابی زبان زندہ رہے گی۔

☆ (Ernest Heming Way) سے آپ کی ذہنی قربت اور اُن کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کرنے کا سلسلہ کب اور کس طور شروع ہوا نیز یہ کہ آپ اور کن غیر ملکی اہل قلم سے متاثر ہوئے اور اُس کا اظہار اپنی تخلیقات میں کس طرح کیا؟

☆☆ آرنسٹ ہیمنگوے (Ernest Heming way) میرا پسندیدہ کہانی کار ہے۔ ظاہر ہے جس سے تھوڑا بہت بھی لگاؤ ہو اُس سے ذہنی قربت تو ہو ہی جاتی ہے۔ ویسے بھی میں اُسے جدید دور کا منفرد افسانہ نگار سمجھتا ہوں۔ باقی رہی اس سوال کے دوسرے حصّہ کی بات تو اس حوالہ سے عرض یہ ہے کہ میں روسی ادب سے زیادہ متاثر ہوں، اس لیے کہ اس خطے کا ادب زندگی کے زیادہ قریب ہے ظاہر ہے جو ادب لوگوں کے قریب ہو کر ان کے دُکھوں کو موضوعِ سخن بنائے گا اس کے مطالعہ کا اثر کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی سطح پر لکھنے والے کی تحریر میں ضرور جھانکے گا۔

☆ انٹرویو کے اختتام پر اپنی ترقی پسندی کے رجحان اور تجربات کے علاوہ اس نظریہ سے وابستہ اُمیدوں سے آگاہ کیجیے؟

☆☆ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ہمیشہ کسی بھی نظریے کا طرف دار رجانب دار نہیں رہا ہوں۔ میرے سامنے کوئی بھی نظریاتی چارٹ نہیں رہا اور نہ ہی اُس سے امید وابستہ کی ہے اور نہ ہی اُس سے شعوری طور پر مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے جب بھی جو کچھ محسوس کیا ہے اُس کا برملا اظہار کیا ہے۔ ہاں یہ قاری یا نقاد پر منحصر ہے کہ وہ میری کہانی کے کوئی نظریاتی معانی جہت برآمد کرے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا ہے کہ میں نے کبھی کسی منشور کو مدِّنظر رکھ کر یا کسی کے کہے میں آ کر کوئی کہانی تخلیق کی ہو۔ میں نے ہمیشہ اپنی تنہائیوں سے جو کچھ کشید کیا ہے اُسے تخلیقی رنگ میں برملا پیش کیا ہے۔

☆ آپ کی فن وشخصیت پر اب تک کس نوعیت کا تحقیقی کام ہو چکا ہے اور کس درجے کے نصاب میں آپ کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں؟

☆☆ میری شخصیت اور فن پر ایم۔اے سطح کے دو مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ ایک اردو میں اور ایک پنجابی زبان میں ہے۔ یہ دونوں مقالات پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے لکھوائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد مضامین بھی ضبطِ تحریر میں لائے جا چکے ہیں۔ عنقریب ایم فل سطح کا تھسیز بھی منظر عام پر آنے والا ہے۔ نیز یہ میری ایک ایک پنجابی کہانی بی۔ اے اور ایم۔ اے سطح کے نصاب میں شامل ہے۔ ایم۔ اے (پنجابی) جی سی یونیورسٹی فیصل آباد، بی۔ اے، پنجاب یونیورسٹی لاہور اور بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان کے منظور شدہ نصاب میں میری کہانیاں شامل ہیں۔ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں میری پوری کتاب (چرخے دی موت/پنجابی کہانیاں) پڑھائی جا رہی ہے۔

☆ کچھ مستقبل کے حوالے سے منصوبوں اور ترجیحات کی بتلایئے اور اگر قارئین چہارسو کو کوئی پیغام دینا ہو تو وہ بھی بیان کیجیے؟

☆☆ مستقبل قریب میں میری آٹھویں کتاب آ رہی ہے جو گورمکھی سے اُردو تراجم پر مشتمل ہوگی۔ بعدازاں ایک پنجابی کتاب لانے کا اِرادہ رکھتا ہوں، اس میں رومی کہانیوں کے پنجابی تراجم ہوں گے۔ محترم اظہر جاوید کی پنجابی کہانیوں کی کتاب ''بڑی دیر ہوگئی'' کا اُردو ترجمہ جو رفتہ رفتہ پایہ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ اس کا پیش لفظ جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب تحریر فرمائیں گے۔ یہ کتاب بھی جلد یا بدیر قارئین کے مطالعہ میں ہوگی۔ ان منصوبوں کے ساتھ ساتھ میں پنجابی زبان میں ایک ناول بھی تحریر کر رہا ہوں جیسے ہی یہ مکمل ہوگا اسے چھپوانے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔

''چہارسو'' کے قارئین مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے اور باشعور ہیں۔ میرا پیغام یہ ہے کہ ادب کو مخلص لوگوں کی ضرورت رہی ہے اور اب تو اور زیادہ ضرورت ہے۔ لہٰذا جب بھی قلم اٹھائیں، خلوصِ نیت سے اپنے ہونے کا ثبوت دیں۔ پڑھیں تو سنجیدہ قرأت کے تقاضے پورے کریں۔ ادب کارِ خیر ہے اور اس خیر میں اپنی توانائیاں صرف کریں۔

☆

..... زندگی کی اُڑان .....

ڈاکٹر اسٹیفن کیلر کی قیادت میں نیشنل یونیورسٹی ریسرچ سکول آف آسٹریلیا کی ایک ٹیم نے گیارہ برس کی مسلسل کاوش کے بعد قدیم ترین ستارہ ''اسکائی میپر'' ٹیلی اسکوپ کی مدد سے دریافت کر لیا۔ اگر ہم یہ تصور کر لیں کہ ''بگ بینگ'' ہی ہماری کائنات کا نقطہ آغاز تھا تو یہ ستارہ 7.13 ارب سال پہلے ''بگ بینگ'' کے کچھ عرصہ بعد وجود میں آیا تھا۔ اب تک کا یہ قدیم ستارہ ہماری سرزمین سے چھ ہزار نوری سال کے فاصلے پر موجود ہے جو کائنات کے بارے بہت سی تفصیلات فراہم کر رہا ہے۔

○

''سُکھ دی نیندر''

(جناب حنیف باوادی پنجابی شاعری توں انتخاب)

فاری شا (اسلام آباد)

نعتیہ نظم

مکّے اتے مدینے دی
اوہناں گلیاں تے میں سِیس نواواں
جی کردا اے
جنہاں گلیاں تے
حضور ﷺ دا نت دا آونا جانا سی
اوہناں جُتیاں دے میں صدقے جاواں
جی کردا اے
جیہڑیاں
پاک پوِتر پیراں نوں
نِت چُمدیاں سن، سُکھ دیندیاں سن
اوس کملی نوں میں چُم لواں
جی کردا اے
جو سدا حضور ﷺ دے سنگ رہی
انگ رہی
اوہناں ہتھاں تے میں بوسے دیواں
جیہڑے سوہنے ہتھ
بھکھن بھانے پتھر ڈھونڈے کدی نہ تھکّے
جی کردا اے
جگ دے شہشاہواں دے شہشاہ دی کُٹیا ویکھاں
مہنکاں ونڈی دی کٹیاں تکّاں
جیہدے اگے
اُوچے محل منارے وی
سیس نواون
ایہہ وی میرا جی کردا اے
جو اوہدی ٹھنڈی چھاؤں دے اندر
سُکھ دی نیندر سوں کے ویکھاں
مڑ نہ پچھے بھوں کے ویکھاں

جی کردا اے
جی کردا اے
چندر مادے مکّھ توں سوہنے
مکّھ اوہدے نوں ویکھاں
رَج رَج کے ویکھاں
گج وَج کے ویکھاں
ہر پردا اوہدے ول جاندیاں وتھاں
اوکھیاں راہواں
میں شوہدے نوں مار مکایا
مار مکایا

○

ترِن نظماں

اوہ کڑی

اوس کڑی دا چِٹّا
جیٹھ ہاڑھ دی دُھپ
پر کی دسّاں
اوس کڑی دیاں اکھیاں دے وچ
اِک سائیں دی گُلّی ورگا نِگھ

سنجوگ

تُوں جد ملدی
میں کِھڑ جاندا
جد مُڑ جاندی
پت جھر دامَیں
اک پتّا ہوندا

اِکّ مِکّ

تُوں حسن دا
سُندر کوڑ
میں عشقے دا دُھخدا سچ
مڑ وی آ ؤ
اِنج رّل بہیے
رہوے نہ کوئی کچّ

○

مینوں دسّو

بھاں بھاں کردے کمرے دامیں
کلّم کلّا قیدی
لوکیں میرے بُو ہے کولوں
اَنّھی وادے بلّیاں وانگوں
چپ چپیتے لنگھ جاندے نیں
میں اوہناں نوں تکناں
پر اوہ نہیں ویہندے
نئیں پچھدے مینتھوں
قلم کاراویارا
کی حال اے تیرا
کیہڑے رنگیں وسدائیں
کچّے پکّے کمرے اندر
وانگ شدائیاں
ادریویں دی کیوں بُکّل مار کے رہنائیں
کیہڑیاں سوچاں تیرے اندر وسیاں
اوہ ایہہ پچھن تے میں دسّاں
بھلے لوکو
تہاڈے ای ہتھّوں میں نمانا
اکلاپے دالوہا ملّ کے بیٹھاں
تہانوں چھڈ کے
ہور میں دسّو
کیتھے جاواں
کیہدی ماں نوں ماسی آکھاں
کیہدی کندھ نال ٹکر ماراں
کیہڑا ابو ہاٹھوراں

○

سونامی دس

توں وی جگ چ
نہ کوئی بال ریا نا چھڈّیا
نہ کوئی بڈھا ٹھیرا
نہ کوئی گبھرو، نہ مٹیار
ماں دا نہ کوئی پتر چھڈیا
نہ پُتراں دی ماں
نہ کوئی چھوٹا وڈّا گھر توں
ڈھیر بناؤنوں ٹلیا
نہ کوئی رُکھ تے فصلاں چھڈیاں
نہ پکھّو ---
نہ پکھواں دے بوٹ
نہ کوئی بستی، شہر گراں تُوں
تھیہہ بناونوں ٹلیا
میں ایہہ پچھدا تینتھوں ظلمی
توں ایہہ ہنیر کمایا کیوں
تُوں تے آدم زاد نہیں سی
تیرے وچ ہنکارا کیوں آیا
ست سمندر پاروں آ گے
بگھیاڑاں دے آ گو وانگوں
توں کیوں ایڈا ظلم کمایا
توں تے آدم زاد نہیں سی
نہ توں دھرتی وسدا ''دو جارب''

○

میں رُکھڑا

میں رُکھڑا
اُجڑی جوہ دا
جیہدے سکّے، ساوے پتر
پت جھڑاں دے۔
ترکھّے بلیاں ہتھوں
آ دھ تی تے ڈگّے
ہُن میں سکھنا
سکیاں شاخاں
سکُے تن نل
ڈور بھوریاں وانگوں
کھڑا اکھلوتا
اگّے تے کدی پچھے
کدی کھبّے سجّے ویکھاں
ہے کوئی اجیہا
لیکھاں مارے میں ول جیہڑا
پیار دی جھاتی پاوے
میں ازلاں توں پریم دا بھُکھّا
محبتاں دا ترہایا
روہی بھوں دا جایا
میں اپنت دے
اوس تیکے نوں ترساں
جیہڑا میرے اندر روڑ کے
رُکھی تند حیاتی والی
ٹُٹن توں ہُن روکے
سکّن توں ہُن ٹھلے

○

ہُوک

اوس ور ہے تاں یارو
حیاتی والے ہر پینڈے تے
کنڈیاں نال ای واہ رہا اے
اس ور ہے تاں شالا ربّا
اپنے پیارے یار دے صدقے
معصوماں دے لہو دے صدقے
فاطمہ جائے۔
لعل دے صدقے
کربل والی
ہنجھو روندی شام دے صدقے
حیاتی والی ساریاں راہواں
کِھڑ کِھڑ ہسدے
مہکاں ونڈدے
پھلاں نال ای سجیاں دسن
شالا ربّا

سُنیہا

جے کڑیے توں
حیاتی والے جوڑے اندر
کوئی پُھل سجاؤنا چاہویں
تاں
اتھری ٹہنی اُتوں لاہ کے
کھڑیا گلاب سجا
اوہناں بندبلہیاں
تے بنداکھیاں دے پُھلاں نیں تاں
سُئیں گلّ تیرے نال
اہناں تاں اڑیے
ساری حیاتی
چُپ دی بُکل مار کے رہنا ایں
جے کڑیے توں
مری گل نہ منّی
مرے اکھراں نوں پرواں نہ کیتا
مڑ توں اڑیے
انہاں بنداکھیاں تے بندبلہیاں دے پھلاں وانگوں
ساری حیاتی
کِھڑ کِھڑ ہسوں
سِکدی رہیں گی

''پُرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں''

محمود شام
(کراچی)

کہانی انسان کی سب سے پرانی سہیلی ہے۔ صدیوں سے ساتھ ساتھ چلتی آ رہی ہے۔ کبھی ہم اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتے ہیں۔ کبھی یہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں انجانی دنیاؤں میں لے جاتی ہے۔ ہر گلی میں ہر لمحے کتنی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ دروازے، ڈیوڑھیاں، دریچے، کھڑکیاں، منڈیریں، ممٹیاں سب سے کہانیاں جھانکتی ہیں۔ قصّے کروٹیں بدلتے ہیں۔

حنیف باوا۔ خود ایک کہانی ہے۔ جو ابھی تک ادھوری ہے۔ وہ خود اسے لکھنے کی کوشش میں تھکن سے چُور ہو چکا ہے۔ جھنگ شہر، نیا شہر اس کہانی کو برسوں سے پڑھتے آ رہے ہیں۔ لیکن وہ بھی جب کوئی سرا نہیں ڈھونڈ پاتے تو وہ بھی اُجڑ جاتے ہیں۔ اور جب حنیف باوا کے گرد یہ بستیاں ویران ہونے لگتی ہیں تو اس کہانی کار کو اس اُڑتی گرد میں پھیلتے دھوئیں میں بہت سے ایسے چہرے نظر آنے لگتے ہیں جو اسے پکار پکار کر کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی کہانیوں کے کردار بناؤ۔

میں نے تو اپنے پہلے شعری مجموعے کا نام ہی ''چہرہ چہرہ میری کہانی'' رکھا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والی ان نظموں غزلوں میں میں بھی کہانیاں ہی تلاش کر رہا تھا۔ اب میرے سامنے حنیف باوا کی کچھ کہانیاں بڑے کروفر سے سجی ہوئی ہیں۔ ایک صدی درمیان میں آ گئی ہے۔ جھنگ کی زندگی سے بھرپور گلیوں میں ہم جب ادب کے کنوؤں میں جھانکتے تھے۔ کتنا شفاف اور میٹھا پانی ملتا تھا۔ اور جو بیل پانی نکالنے کے لیے جتے ہوتے تھے ان کی بند آنکھیں بہت خواب دکھاتی تھیں۔ اس وقت بھی ان کی کہانیاں بہت منہ زور ہوتی تھیں۔ ہماری گلیوں میں اداسی بکھیرتی ٹیاریں۔ زندگی کا بوجھ اٹھائے نوجوان ان کے افسانوں کا محور اور مرکز ہوتے تھے۔ اس وقت انسانی معاشرہ، جتنا سادہ، آسان اور کم رنگ تھا ایسی ہی سادگی ان کی تحریروں میں ہوتی تھی۔ ہم سب بڑے ادیبوں، شاعروں کو پڑھتے تھے پھر ان پر کھل کر بحث بھی کرتے تھے۔ بہت سی محفلیں یاد آ رہی ہیں۔ میونسپل کمیٹی کی لائبریری میں، کمپنی باغ میں، گورنمنٹ کالج میں، شارب انصاری کی بیٹھک میں، خیر الدین انصاری کے ڈرائنگ روم میں، بلال زبیری کے دفتر میں، ہماری ڈیوڑھی میں، انجمن فروغ ادب کی تنقیدی نشستیں ہوتی تھیں۔ میرے برادر بزرگ ڈاکٹر محمد خالد مسعود، پروفیسر محمد حیات خان سیال، پروفیسر تقی انجم، شیر افضل جعفری، جعفر طاہر، رام ریاض، معین تابش، طاہر سردھنوی، بیدل پانی پتی اور بہت سی مہربان ہستیاں بحث میں حصّہ لیتی تھیں۔

شعر کہنے والے بہت تھے لیکن نثر لکھنے والے حنیف باوا اور ایک دو بس۔

چیخوف، دوستو وسکی، ایڈگر ایلن پو، موپساں، کافکا، کرشن چندر، پریم چند، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو، سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی سب کا ذکر ہوتا تھا۔ کتابیں آپس میں منتقل ہوتی تھیں۔

آج جب یہ سب کچھ یاد آ رہا ہے:

پُرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

تو یہ کہانیاں میرے کان میں کہہ رہی ہیں۔ صحبتیں اب بھی اسی طرح حقیقت ہیں۔ کردار اسی طرح جیتے جاگتے ہیں۔ عذاب و ثواب کی خواہشوں میں ہلکان ہوتے ہیں۔ نیکی بدی کے شگوفے اسی طرح کِھل رہے ہیں۔

ان کہانیوں میں لکھنے والا وقت سے مقابلے کی دوڑ میں تھک کر کہیں بیٹھ نہیں گیا۔ وہ دوڑ رہا ہے۔ زمانے کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کا مشاہدہ اسی طرح زندہ ہے۔ آج کی تازہ حقیقتیں بھی اس کے افسانوں کا اسی طرح موضوع بنتی ہیں جیسے پرانی روایتیں برگد کے بوڑھے درخت، چڑیاں، طوطے، کبوتر ان سب سے اس کی محفل سجتی ہے۔

میں کوئی نقاد تو ہوں نہیں۔ اپنے آپ کو ادب کا ایک مسلسل قاری کہہ سکتا ہوں۔ جب بھی فرصت ملتی ہے بلکہ فرصت نکالتا ہوں کہ ادبی جریدے اور کتابیں پڑھ سکوں۔ افسانے میرے مطالعے کا خاص حصہ ہوں۔ کبھی کبھی میں اپنے حلقہ احباب میں اس دکھ کا اظہار کرتا ہوں کہ اب ہمارے گلی کوچے، کراچی کی شاہراہیں، بستیاں، محلے، کسی افسانے، ناول میں نظر نہیں آتی ہیں۔ کراچی کو انتظار حسین نہیں ملا۔ کوئی اے حمید اس کے حصے میں نہیں آیا۔ فیڈرل بی ایریا، گلشن اقبال، کورنگی، اورنگی، اتنا کچھ ہوتا ہے۔ خون بھی بہتا ہے۔ محبتیں بھی پروان چڑھتی ہیں۔ کہیں کسی چورنگی پر کوئی گرد میں اٹا آدمی دیکھتا ہوں تو کڑھتا رہتا ہوں کہ اپنے آپ میں گم اس شخص کا کسی افسانے میں کیوں ذکر نہیں آتا۔

خوش قسمت ہیں نوراں، فیقا، یوسف لطیف، عامر جاوید، رفیق حسین، فاطمہ، کرملّی جنہیں حنیف باوا مل گئے۔ اور یہ گمنام لوگ زندہ جاوید ہو گئے۔ آج کل بہت سے افسانہ نگار ایک ہی کہانی مختلف عنوانات کے تحت لکھ رہے ہیں۔ ایک سے موڈ، ماحول کیفیت، بیانیے میں بھی یکسانیت مگر حنیف باوا کے موضوعات میں بہت تنوع ہے۔ زندگی ان کے آس پاس جتنے مختلف رنگوں میں سامنے آتی ہے وہ بھی اپنی کہانیوں میں اتنے ہی رنگ بکھیرتے ہیں۔ ایسے موضوعات جنہیں عام طور پر افسانہ نگار، کہانیوں کے لیے پسند نہیں کرتے وہ

حنیف باوا کے ہاں بڑی شان سے خیال کے حرم میں داخل ہوتے ہیں۔ بہت پر اثر کہانی کے روپ میں باہر آتے ہیں۔

آج ہمارے ہاں سمندر پار پاکستانیوں کی محنت اور مشقت کے باعث ایک طرف تو گھرانوں میں کچھ خوشحالی اور آسودگی آئی ہے مگر وہیں کچھ سماجی، عمرانی، نفسیاتی مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں۔ زندگی کی سچائیاں چیخنے لگتی ہیں۔ بدن کا شور جب غالب آتا ہے تو آسودگی اور بلند معیار زندگی کی کرچیاں بکھرنے لگتی ہیں۔ ''ایک لمحے کی بات'' مجھے سب سے بہتر مکمل اور منہ بولتی کہانی لگتی ہے۔ اس میں افسانہ نگار کا تصور اور تخیل بھی اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور بیان پر قدرت بھی۔ بدن کی ضرورت کے حوالے سے شائستگی اور تہذیب کے حدود میں رہتے ہوئے ان کیفیات کو جس طرح رقم کیا گیا ہے اس سے کہانی کار پر رشک اور مرکزی کردار پہ ترس آنے لگتا ہے۔ یہ افسانہ مختصر کہانی Short Story کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔

آج کے دور میں مصنف کو اپنے گردوپیش میں جو بھی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ آج کی زندگی کے جو بھی ضروری اجزائے ترکیبی ہیں، جو کشاکش ہے جس میں اپنے کفیلوں کو بیرونِ ملک بھیجنے میں ادھر خاندان جن سماجی الجھنوں میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اور مقدس ریگ زاروں میں کام کرنے والا جن تنہائیوں کا شکار ہوتا ہے وہ مختلف کہانیوں میں بڑے متاثر کن انداز میں کہانی کا موضوع بنی ہیں۔ اپنے عہد کی سیاسی محرومیاں، محکومی کے تلخ حقائق، غیر ملکی استعمار کے مظالم سب ہی افسانوں میں مختلف کرداروں اور واقعات کی صورت میں ایسے سامنے لائے جاتے ہیں کہ آپ انہیں محسوس کر کے ہلکی ہلکی چبھن محسوس کرتے ہیں۔ سرد جنگ ختم ہو چکی۔ کمیونزم بنگال سے بھی رخصت ہو چکا لیکن طبقات میں تضادات، فاصلے اور کشمکش اسی طرح باقی ہے۔ یہ مشاہدہ آپ کو اکثر افسانوں میں دکھائی دے گا۔ ادیبوں میں بھی یہ طبقاتی اُونچ نیچ موجود ہے ''گھر پیارا گھر'' اور دھند میں گھری کتب اس کیفیت کی عکاسی ہیں۔ ''جمہوری چوک'' سائیکس غلام، ایک بھیانک خواب اپنی سیاسی تلخیوں کے قصے ہیں۔

''وہ اور میں'' بہت ہی معصوم کہانی ہے۔ ایک عجیب لطافت اور احساس ہر جملہ بہت کچھ کہتا ہوا۔

زیادہ تر مشاہدات تجربات اور محسوسات تو مجھے یہ احساس دلاتے رہے کہ لکھنے والا خود کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ مختلف کرداروں اور مقامات میں وہ اپنی شباہت محسوس کرتا ہے۔ کہیں کہیں قیام بھی کر لیتا ہے۔ نئی اقتصادی مجبوریوں، نئے سماجی ڈھانچوں نے ہماری روایات، رشتوں اور بندھنوں کو جس طرح شکست وریخت سے دوچار کیا ہے ''بھولا ہوا آدمی'' اس کی بھرپور تصویر ہے ''نہر کی پٹڑی'' کچھ کچھ علامتی کہانی کی طرف لے جاتی ہے ''کیہہ جاناں میں کون'' زندگی کی ایک اور کڑوی سچائی ہے۔ ''دائرے میں گھرے لوگ''، ''ایسا ہی ہوا تھا'' ان لوگوں کی کہانیاں ہیں جو کولہو کے بیل کی طرح اپنے دائرے میں گھوم رہے ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہم جو استعمار کے اتحادی بنے ہیں اس نے ہمارے سماج میں جن تضادات، محرومیوں، غیر ملکی مداخلتوں کے راستے کھولے ہیں۔ حنیف باوا اس جدید ترین غم دوراں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ مائیں نیں میں کینوں آکھاں ''جوگ'' دروازہ کھلا ہے فصیل پرانڈیکس چھتری ان حسیات کی داستانیں ہیں۔

بہت پرتاثیر کہانیاں ہیں۔ الفاظ بہت سادہ، زبان پرکامل عبور، ان کا پیرایۂ اظہار اور کہانی کو آگے لے کر چلنے کا ہنر بہت دل نشیں ہے، انہیں سماں باندھنا آتا ہے۔ اپنے اردگرد انگڑائیاں لیتی عریانیوں کو بھی وہ اٹھانے سے نہیں گھبراتے۔ انہیں سنوار نکھار کر ہمارے سامنے بٹھا دیتے ہیں، معاشرے میں تاریکی کے دیوتاؤں کو بھی وہ بے نقاب کرنے سے نہیں ڈرتے۔

میں حنیف باوا کو مبارکباد دوں گا کہ اردو افسانوی ادب میں یہ تصنیف ایک اہم اضافہ ہوگی۔ وہ کہانی کو بڑے پیار سے سنبھال کر رکھتے ہیں اور بہت نوک پلک سنوار کو کاغذ پر منتقل کرتے ہیں۔ اب وہ پریم چندر، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، اے حمید، غلام عباس، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انتظار حسین، زاہدہ حنا، شمشاد احمد، شہناز شورو اور طاہرہ اقبال کے قبیلے میں شامل ہو گئے ہیں۔

۔ ڈالر کی حکمرانی ۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں شدید کساد بازاری کے باعث بینکوں پر عوام کا اعتماد متزلزل ہو گیا جس کے ردِعمل میں بنک آف انگلینڈ نے کرنسی کے اعتبار سے گولڈ اسٹنڈرڈ معطل کر دیا۔ جس کی پیروی دیگر مغربی ممالک سمیت شمالی امریکہ نے بھی کی۔ اس دوران جب امریکی عوام نے بنکوں سے رقم کی بجائے سونے کے سکّے طلب کرنا شروع کیے تو امریکی صدر روز ویلٹ نے گولڈ ریزوا یکٹ نافذ کیا جسے 1935 میں ''گولڈ کلاز'' کے نام سے منظوری ملنے کے بعد ڈالر کی قدر 20.67 مقرر کی گئی جو کچھ عرصہ بعد یعنی 1935 میں 35 ڈالر فی اونس مقرر کر دی گئی۔

☆

حقیقت پسند کہانی کار

انتظار باقی

(جھنگ)

انسان نے جب لکھنا سیکھا ہوگا تو کہانی کی ابتدا ہوئی ہوگی۔اس طرح کہانی کسی بھی زبان کے ادب میں ابتدائی وکلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ بحیثیت ایک شاعر میں جانتا ہوں کہ شاعر کے لیے بھی اردگرد پھیلی کہانیوں سے پہلوتہی کرنا ناممکن ہے۔اور کئی دفعہ کئی شاہکار شعر کسی کہانی ہی کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کہانی تخلیقِ ادب میں ایک منبع کی حیثیت رکھتی ہے اور پھر کہانی بھی وہ جسے حنیف باوا جیسا عظیم تخلیق کار مل جائے۔

''تنہائیوں کے درمیان'' جو حنیف باوا کے اب تک کے لکھے افسانوں کا مجموعہ ہے اس میں بیالیس کہانیاں شامل ہیں اور ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔حنیف باوا نے جو ہمہ وقتی ادیب ہیں اپنی تمام عمر ادب کی آبیاری کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ ہمیشہ نئی سے نئی بات کی کھوج میں رہتے ہیں۔پنجابی کہانی ہو اردو کہانی، انشائیہ ہو یا ترجمہ یا آزاد نظم، ہر صنف میں حنیف باوا نے اپنا لوہا منوایا ہے اور عمر کے اس حصے میں بھی ولولہ سرد نہیں ہونے دیا اور کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ جمود کا شکار ہو گئے ہیں، ہمیشہ آگے سے آگے کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

حنیف باوا کا افسانہ پڑھتے ہوئے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ جیسے کسی فلم کا ایک ایسا سین پیش کیا گیا ہے جو فلم کی پوری کہانی سموئے ہوئے ہے۔حنیف باوا کا افسانہ پڑھتے ہوئے کبھی بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔ زبان وبیان کی سادگی، چشموں کی پاکیزگی لیے ہوتی ہے۔جس میں کبھی ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ بہاؤ مستقل جاری رہتا ہے لہٰذا تعفّن نزدیک نہیں پھٹکتا بلکہ روانی سے ایک ان جانی سی مہک محسوس ہوتی ہے جو دل ودماغ کو تر وتازہ رکھتی ہے۔

حنیف باوا اپنی کسی کہانی میں ناصح نظر نہیں آتے بلکہ اپنی قدرت اظہار سے قاری کے دل ودماغ میں ناقابلِ بیان حد تک اتر جاتے ہیں اور اپنا مافی الضمیر نقش کر دیتے ہیں۔کہانی پڑھتے ہوئے پہلا احساس سادگی کا ہوتا ہے لیکن یہ سادگی ان کے افسانوں کو یک پرتی یا سطحی نہیں بناتی بلکہ انہیں ایک پورا معنوی نظام عطا کرتی ہے جس میں معنی کی ایک پرت کھولتے ہی دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی پرت واضح ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔شاعری میں سہلِ ممتنع میں شعر کہنے والے کو خوبصورت شاعر مانا جاتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ حنیف باوا سہلِ ممتنع میں افسانہ لکھتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔

حنیف باوا کے افسانوں کے کردار کسی باہر کی دنیا سے درآمد شدہ نہیں ہیں بلکہ ان کے اپنے ماحول کے کردار ہیں جن کی بُنت بہت جامع اور جاندار ہے مانوس کرداروں کو جس منظر نگاری سے مربوط کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے اردگرد کے ماحول سے اجنبی نہیں ہوتی۔اپنے ہر افسانے میں وہ نئے کرداروں کو غیر محسوس انداز سے اس طرح داخل کرتے چلے جاتے ہیں کہ کبھی نامانوسیت پیدا نہیں ہوتی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری کا ان کرداروں سے روز کا رابطہ ہے، کبھی کبھی کسی کردار سے قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ یہ تو وہ خود ہے اور بیتے جانے والے واقعات تو اسی کی زندگی کا حصّہ ہیں۔

حنیف باوا ''ادب برائے ادب'' کی بجائے ''ادب برائے زندگی'' کے نظریہ کے حامل نظر آتے ہیں ان کے افسانوں میں انسان دوستی اور سماج دوستی کے علاوہ کسی اور نظریے کی چھاپ نظر نہیں آتی۔وہ انسانی زندگی کے گوں ناگوں مسائل اور انسانی کمزوریوں کی ایک جھلک دکھا کر آگے گزر جاتے ہیں۔ان کے افسانوں میں محبوب کی زلفِ گرہ گیر اور چشمِ ناز کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ وہ تو غربت کے جوہڑ میں کھلتے ہوئے کنول کو اپنا محبوب سمجھتے ہیں۔معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں سے پردہ اٹھاتے ہیں کہانی میں زندگی کے نشیب و فراز دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔معاشی وسماجی ناہمواریوں کے بندِ قبا کھولتے ہیں۔ان کے افسانوں میں موجود ہر کردار غربت کی چکّی میں پسا محسوس ہوتا ہے اگر کبھی انہوں نے امارت سے بوجھل کردار بھی پیش کیا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے اس کا مشاہدہ دور کھڑے ہو کر ہی کیا ہے جیسے ان کے ایک افسانے میں ایک خوبصورت غریب عورت کا کردار جو شادی کے ٹینٹوں کے پیچھے لگے ہوئے ضائع شدہ کھانے کے ڈھیر سے کھانا تلاش کرتی ہے اور اسے اندر جانے کی اجازت یا حوصلہ نہیں کہ وہ قریب سے امارت کا مشاہدہ کر سکے۔

حنیف باوا کی کہانیاں مشرقی رہن سہن کی عکاسی کرتی ہیں اور انہیں صحیح معنوں میں زمین کے بیٹے کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔وہ کہیں بھی خود کو اپنے ماحول سے آزاد نہیں کر پائے۔یہی چیز ان کی کہانیوں میں اثر آفرینی پیدا کرتی ہے اور کہانیوں میں موجود کئی اصطلاحات خاص طور پر مشرقی زندگی سے متعلق ہیں لیکن یہ چیز ان کے افسانوں کو زمان ومقام میں قید نہیں کرتی بلکہ ان کے لیے میدانِ عمل کو وسیع سے وسیع تر کرتی ہے جو ان کے افسانوں کا ایک خاص وصف ہے۔

اگر حنیف باوا کے افسانوں کا دنیا کی کسی بھی زبان میں کما حقہٗ ترجمہ کر کے وہاں کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو یقینی طور پر وہ اسے اپنے ماحول کی ہی کہانی سمجھیں گے اور کہیں اجنبیت محسوس نہیں کریں گے۔

حنیف باوا لکھتے وقت اپنے زمان ومقام سے اثر لیتے ہیں۔اگر ارد گرد کا ماحول خوشی کے شادیانے بجاتا ہے تو ان کا قلم بھی خوشی کی گل کاری کرتا

ہے اور اگر ماحول اداسی وحزن لیے ہوئے ہے تو یہی قلم اداسی اُگلتا ہوتا ہے لیکن کبھی خوشی میں نعرہ زن یا اداسی میں نوحہ کناں محسوس نہیں ہوتا اور اظہار کی یہ میانہ روی ان کا ایک اور خوبصورت وصف ہے۔ حنیف باوا کے کئی جملوں کی کاٹ قاری پر ایسا اثر کرتی ہے کہ وہ ان کی معنی آفرینی میں غرق ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال ان کے افسانے ''خود سے مکالمہ'' سے ماخوذ ہے جس میں وہ کہتے ہیں ''میری جیب الٹا وجود رکھتی ہے اور ہر وقت خالی خالی نظروں سے بلا مقصد ادھر اُدھر جھانکتی رہتی ہے''۔ یہ افسانہ ایک علامتی افسانہ ہے جس میں لحاف زندگی کی علامت ہے اور مکالمہ کرنے والا، انسان کی علامت ہے جسے ہر وقت برسرِ پیکار رہنا پڑتا ہے۔

ایک اور افسانہ ''سارنگی والا'' کا ایک اور جملہ سیدھا دل میں اتر جاتا ہے کہ ''اللہ دتہ ایک ایسے محلے میں رہتا ہے جہاں اس کا کچا گھر بلند و بالا عمارتوں میں گھرا ہوا تھا جو ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ عمارتوں کا قیدی ہو'' یہی ایک جملہ اس سارنگی والے جسے ایک ایسے فنکار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جس کا فن قریب المرگ ہے، اس کے سماجی رُتبے کا غماز ہے۔

افسانہ ''دروازہ کھلا ہے'' مصنف کی اپنی کہانی محسوس ہوتا ہے۔ جس میں Generation Gap کی اذیت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک اور افسانہ ''چھتر چھاؤں'' جس میں ماں کے ممتا بھرے کردار کو پیش کیا گیا ہے حنیف باوا کی اپنی کہانی محسوس ہوتا ہے جس میں ان کا کردار ابھر کر سامنے آیا ہے۔

افسانہ ''نہر کی پٹڑی'' میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ جب کوئی کسی سے مدد لینے کا عادی ہو جائے تو اس میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ فوت ہو جاتا ہے۔

افسانہ ''جمہوری چوک'' ایک علامتی افسانہ ہے جو اپنے اندر ایک پورا استعاراتی نظام لیے ہوئے ہے۔ جس میں واضح کیا گیا ہے کہ آزادی ملنے کے بعد بھی زندگی کی کڑواہٹ کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھ گئی ہے اس میں ''چھوٹا بچہ'' پاکستان کی علامت ہے۔

افسانہ ''زنجیر سے بندھا وجود'' خوبصورت منظر نگاری لیے ہوئے ہے۔ افسانہ ''ایک تھا حاکم'' میں آمریت و محکومیت کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے۔ الغرض حنیف باوا ایک حقیقت پسند افسانہ نگار کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

..... فلک آثار .....

پرتپال سنگھ بیتابؔ کے شعری افق کی دو اور پرتیں نہایت واضح اور غیر مبہم ہیں۔ ایک تو وہ جس میں وہ سطحی اور بادی النظر میں ظاہری اشیا کو ہمہ رخی منطق کے ذریعے اپنی گرفت میں لینے کی سعی کرتے ہیں اور دوسری وہ جس میں وہ غالبؔ کی طرح دشت تمنا کے دوسرے قدم کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں مناظر ان کی اپنی ذات کی تفہیم کے حوالے سے ان کے شعری دروبست میں بہت واضح اور روشن ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی رجائیت اس کلبۂ احزاں میں بھی قنوطیت کی بجائے مسرت کی خوشگوار زیریں مگر نامعلوم لہروں کے اثرات قبول کرتی ہے اور زندگی کی کم مائیگی کو ایک بے پناہ عشق انگیز احساس سے ممیز، پرت پال سنگھ بیتابؔ کا احاطہ رمز و شعر دنیاداری نہیں بلکہ دل داری ہے۔

.....کرشن کمار طور

دستیابی: سرسبز پبلی کیشنز، کھیارا روڈ، دھرم شالہ، بھارت۔

اپنوں کے درمیان اجنبی

یہ میری آوارگی کا خاصہ ہے یا میری فطرت کا تقاضا
اکثر کسی اُجاڑ کسی بیابان کی طرف نکل جاتا ہوں
اُدھر خوش رہتا ہوں جدھر کوئی نہ ہو
اور اگر ہو بھی تو کوئی اپنا نہ ہو
جب کبھی بھیڑ کے درمیان
میری چھٹی حس جاگ اُٹھتی ہے
تو مَیں کچھ ایسا ہو جاتا ہوں
جیسے میرے آس پاس کوئی نہ ہو بس تنہائی ہو
اس کیفیت میں
کوئی دِقّت باقی رہتی ہے نہ کوئی پریشانی
پھر ارد گرد کوئی اپنا ہو چاہے پرایا

(فلک آثار سے منتخبہ)

''وہ اور میں'' افسانے کی تفہیم

مصطفےٰ کریم
(یو۔کے)

گو افسانہ کیا؟ اس موضوع پر بہت ساری آراء ہیں۔لیکن مجھے چیخوف (Chekov) کا ہی نظریہ سب سے موزوں محسوس ہوتا ہے۔اس نے کہیں لکھا تھا۔۔۔افسانہ زندگی کی ایک قاش ہے اور یہ ہے بھی درست۔انسانی زندگی کے تمام ہشت صفت پہلو افسانے میں نہیں لائے جاسکتے۔سچ تو یہ ہے کہ ان کے لیے ناول بھی ناکافی ہے۔افسانے میں انسان کی زندگی کا صرف ایک رُخ اپنی ساری پیچیدگی کے ساتھ قاری کے سامنے لایا جاسکتا ہے۔افسانہ مختصر اور دو تین صفحات پر محیط لکھا جاسکتا ہے۔جیسا کہ رتن سنگھ کے افسانے یا رُوسی افسانہ نگار آئیزک بابل (Isaac Babel) کے افسانے ہوتے تھے یا زیرِ موضوع حنیف باوا کا افسانہ ہے۔افسانہ طویل بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ قدرت اللہ شہاب کا افسانہ ''یا خدا'' اور کرشن چندر کا افسانہ ''زندگی کے موڑ پر'' ہیں۔میری حقیر رائے میں افسانچے یا اس قسم کی دیگر لکھائی کو نظر انداز کر دیں تو بہتر ہوگا۔ورنہ پہیلی یا کہاوت یا Fables کو بھی افسانہ قرار دیا جائے گا۔اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں ایک صاحب نے دوسطری افسانوں کا مجموعہ شائع کیا ہے جس کی تعریف اردو ادب کے ایک اہم نقاد نے کی ہے۔اب رہا اسلوب کا سوال تو ناول یا افسانہ سبھی بیانیہ ہوتے ہیں۔کبھی کبھی سارا بیان مکالمے کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔اسلوب کو مؤثر بنانے کے لیے مصنف کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتا ہے۔

اس مختصر بیان کے بعد جب حنیف باوا کا افسانہ ''وہ اور میں'' زیرِ نگاہ آتا ہے تو سوچنا پڑتا ہے کہ اس میں آخر کون سا ایسا نکتہ ہے جس نے مجھے خامہ فرسائی پر مجبور کیا ہے۔چند مہینے پہلے ''الحمراء'' کے صفحات پر ارنسٹ ہیمنگ وے (Ernest Heming Way) کے افسانے کا وہ ترجمہ نظر آیا تھا جسے حنیف باوا نے کیا تھا۔یہ مختصر افسانہ صرف تین چار صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ہیمنگ وے نہ صرف عظیم ناول نگار بلکہ بڑا افسانہ نویس بھی تھا۔جب دنیا کے پانچ چھ عظیم افسانہ نگاروں کے نام لیے جاتے ہیں تو ان میں ہیمنگ وے کا نام بھی ضرور ہوتا ہے۔وہ افسانہ جس کا ترجمہ ''الحمراء'' میں شائع ہوا تھا ''اس کا اختصار'' کفایتِ لفظی اور انسانی بربریت کی ایک مثال بہت متاثر کرتا ہے۔

افسانے میں ایک دس برس کا بیمار لڑکا ہے جو یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ مرنے والا ہے۔اپنے خوف کا اظہار وہ اپنے باپ سے کرتا ہے۔جس پر بیٹے کی علالت، بے بسی اور ڈر کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ شکار کھیلنے چلا جاتا ہے۔افسانے میں بس اتنا ہی کچھ ہے۔کسی دانشور نے ہیمنگ وے کے افسانے کی بابت لکھا تھا کہ ان میں Tip of the iceberg نظر آتا ہے۔یعنی اس کا حجم سمندر کی سطح کے نیچے ہے جو نظر نہیں آتا۔افسانے میں بربریت پر کوئی اظہارِ رائے نہیں ہے اور یہ کہیں پر لکھا ہوا بھی نہیں ہے لیکن باپ کی بیمار بیٹے کی جانب درندگی انسانی جبلت کی وہ مثال ہے جو ہم سب میں ہوتی ہے اور جو ہمارے شب و روز میں دیکھنے والوں کو نظر آتی ہے۔

ممکن ہے ارنسٹ ہیمنگ وے کے اس افسانے پر قاری کی توجہ نہیں گئی ہو۔چونکہ وہ دن گزر گئے جب اردو دنیا میں افسانہ شعلہ بن کر آیا اور اس کی تیز روشنی سے یہ دنیا مدتوں روشن رہی۔عین ممکن ہے حنیف باوا کے افسانے ''وہ اور میں'' پر بھی پڑھنے والوں کی سرسری نگاہ پڑی ہو۔پہلی نگاہ میں اس میں کوئی اہم نکتہ نظر نہیں آتا۔

''وہ اور میں'' کا مرکزی کردار ایک ادیب ہے جو اپنے مکان کے باہر بیٹھا اپنے تخلیقی کاموں میں مصروف نظر آتا ہے۔اسے سڑک کا ہجوم، سڑک پر بھاگتی موٹریں اور موٹر رکشاؤں کا شور پریشان نہیں کرتیں اور نہ ہی بدلتے ہوئے دن کے لمحات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اس کی بیوی اور بچے ہیں۔الغرض اس کی زندگی ہر طرح مطمئن اور مسرور کُن ہے۔اگر اس کی توجہ کھنچتی ہے تو وہ ان بچوں کی جانب جو مقامی اسکول جا رہے ہوتے ہیں۔ان سب کے صاف ستھرے کپڑے اور ان سب کی معصومیت اُسے متاثر کرتی ہے۔ایک دن اس سڑک پر ادیب کو ایک خوبصورت عورت پانچ سالہ بچے کا ہاتھ تھامے اسکول کی جانب رواں نظر آتی ہے۔ادیب کے ذہن میں اس عورت کے دلکش نقوش چھا جاتے ہیں۔عورت اور ادیب کے درمیان کوئی مکالمہ نہیں ہوتا۔سڑک پر گزرتی حسین عورت ادیب کو جذبات سے ناواقف نظر آتی ہے۔دو مہینہ کے بعد اس عورت کا سڑک پر سے گزرا چانک ختم ہو جاتا ہے۔ادیب کی زندگی میں گزرتے ہوئے شب و روز اور عمر رفتہ کے ساتھ تغیرات آتے ہیں۔بچے جوان ہو کر دُور اپنے گھر بسا لیتے ہیں اور ادیب کی بیوی مر جاتی ہے۔گو وہ تنہا ہو جاتا ہے لیکن اسے ان سب کی کمی اتنی نہیں محسوس ہوتی جو اسے پریشان کرے۔وہ اپنے اسی گھر میں مقیم اور تخلیقی کاموں میں مصروف رہتا ہے لیکن اس کے دل سے اس عورت کی یاد کبھی نہیں مٹی تھی۔ضعیفی آ گئی ہے لیکن اس کے مشاغل وہی ہیں۔مصروفیتیں بھی اُس طرح ہیں۔اب بھی وہ گھر کے باہر بیٹھا لکھتا رہتا ہے۔سامنے کی سڑک پر اس کی نگاہ اکثر جاتی ہے۔جہاں شور وغل اسی طرح ہے اور معصوم بچے اپنے صاف ستھرے ملبوس میں اسکول جاتے نظر آتے ہیں۔ایک دن اسی سڑک پر اسے پھر ایک بچہ نظر آتا ہے جس کا ہاتھ اسی عورت نے تھام رکھا ہے جس کے حسن سے وہ کبھی متاثر ہوا تھا۔وہ بھی ضعیف ہو چکی ہے۔اس کا

ضعف اس کی جھکی کمر اور آہستہ خرامی سے ظاہر ہوتا ہے۔ مختصر مکالمے سے پتہ چل جاتا ہے کہ عورت اس بچے کی دادی ہے۔ عورت کو دیکھنے کے بعد ادیب کو اسی خوشی کا احساس ہوتا ہے جو روزِ اوّل اسے دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔ اور اب بھی وہ اسے ہر روز دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

حنیف باوا اگر چاہتے تو اس افسانے کو طول دے سکتے تھے۔ ''وہ اور میں'' میں عورت کو ایک غیر مرد کا اسے گھورنا بُرا لگ سکتا تھا۔ سڑک کے شور غل سے بے نیاز لکھتے رہنا عورت کو متجسس بنا سکتا تھا اور وہ اس کے لیے کشش بھی محسوس کر سکتی تھی۔ ان سب سے افسانے کے ارتقاء اور امکانات پر ضرب نہیں پڑتی۔ لیکن مصنف کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اپنے افسانے میں اس انس کو موضوع بنانا چاہتے تھے جو اس خلا کو بھرتا ہے جسے شادی شدہ مرد و عورت بھی اپنی زندگی میں محسوس کرتے ہیں۔ اس انس سے بے قرار ہو کر وہ کوئی آہ و بکا نہیں کرتے اور اس کا اظہار بھی کسی کے سامنے نہیں کرتے۔ اس انس کے دھیما پن اور معصومیت میں وہ تاثیر ہے جس پر وقت کے ساتھ کوئی ماندگی نہیں آتی۔ افسانے میں مصنف نے اس انس کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ افسانے کی آفاقیت اور تہہ داری اسے عمدہ بناتی ہے۔

☆

کشمکشِ زیست

پیدائش: سکول کے سرٹیفکیٹ کے مطابق، یکم جنوری ۱۹۳۶ء

نام: محمد حنیف

قلمی نام: حنیف باوا

والد: امام دین

والدہ: شریفاں بی بی

بھائی بہن: ایک چھوٹا بھائی تھا لیکن زندگی نے اُس کے ساتھ وفا نہ کی اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بہن کوئی نہیں

تعلیم: ایم۔اے پنجابی

ریعہ روزگار: کوئی نہیں۔ صرف تھوڑی سی پنشن اور اعزازیہ پر گزر اوقات ہے

اولاد: دو بیٹے (محمد انور اور یاسر حنیف) چار بیٹیاں۔ ان میں سے بڑی بیٹی اللہ کو پیاری ہو گئی

سیاحت: کوئی نہیں

انعامات و اعزازات: ابھی تک کوئی انعام نہیں ملا۔ البتہ مسعود کھدر پوش ٹرسٹ کی جانب سے ''پنجابی سیوک'' کے اعزاز سے نوازا گیا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے حصہ میں اور کوئی اعزاز نہیں آیا لیکن میرے لیے یہی سب سے بڑا اعزاز ہے کہ ادارہ چہارسو میرے حرفوں کو پذیرائی بخشتے ہوئے قرطاسِ اعزاز آراستہ کر رہا ہے۔

اردو کتب

۱۔ باہر کا آدمی (افسانے)، ۲۔ ''انصاری جو نمایاں ہوئے'' (مُنی خاکے)، ۳۔ دائروں سے باہر (انشائیے)، ۴۔ تنہائیوں کے درمیاں (افسانے)

پنجابی کتب

۱۔ چرخے دی موت (پنجابی کہانیاں)، ۲۔ کہانی (پنجابی کہانیاں)، ۳۔ دھوانکھیا ہویا آدمی (پنجابی کہانیاں)، ۴۔ ''مُن تائیں'' (پنجابی کہانیاں)

زیرِ طبع کتب

۱۔ ہرمن ہنسیے کے ناول ''سدھارتھا'' کا پنجابی رُوپ.....۲۔ گورمکھی کہانیوں کا اردو ترجمہ.....۳۔ غیر ملکی کہانیوں کے پنجابی تراجم

تھیسز اور مقالہ جات

۱۔ ''حنیف باوا دی کہانی کاری'' (پنجابی) نورین فاطمہ.....۲۔ حنیف باوا۔ حیات اور ادبی خدمات (اردو) محمد سجاد

☆

''افسانوی ادب میں قابلِ ذکر اضافہ''

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر
(لاہور)

حنیف باوا انڈو پاک میں لکھنے جانے والے پنجابی افسانے کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں، اردو انشائیے کی ایک محترم اور مقتدر شخصیت ہیں اور اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے۔

لگ بھگ دو دہائیوں سے وہ اردو کے صفِ اوّل کے رسائل میں اردو افسانے لکھ رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں انہوں نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز اردو افسانے سے کیا تھا مگر دو ایک افسانوں کے بعد وہ پنجابی کہانی کی طرف متوجہ ہوئے اور کم و بیش چار دہائیوں تک پنجابی کہانی کے ہو کر رہے۔ پنجابی ادبی بورڈ کی طرف سے ان کی پنجابی کہانیوں کے دو مجموعے ''چرخے دی موت'' اور ''کہانی'' کے نام سے چھپے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی نے پنجابی زبان وادب کے ڈگری سطح کے نصاب میں ان کے افسانے شامل کر رکھے ہیں۔ حنیف باوا نے اسّی کی دہائی کے آغاز میں اردو افسانے کی طرف مراجعت اختیار کی۔ یہ وہ دور تھا جب علاقائی اور تجریدی افسانہ ایک مقبول عام فیشن کے طور پر لکھا جا رہا تھا۔ کہانی غائب اور کردار مسخ شدہ تھے۔ وطنِ عزیز مارشل لاء کے منحوس سایوں کی گرفت میں آیا ہوا تھا۔ لبِ اظہار پر پابندی تھی۔ یہ صورتِ حال علامتی افسانے کے لیے خوب سازگار تھی۔ حنیف باوا کے اردو افسانوں کے موضوع، اسلوب اور تکنیک پر مذکورہ ادبی اور سیاسی فضا کے اثرات گہرے ہیں مگر یہ بات ابتدا میں ہی واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ حنیف باوا نے جہاں افسانے کے علامتی رجحان کا تتبع کیا ہے وہاں وہ اس ابہام بلکہ ہملیت کا شکار بالکل نہیں ہوئے جس کی زد میں اردو کے بیشتر علامتی افسانے تھے۔ طویل عرصے کی کہانی نویسی کی مشق اور ریاضت نے ان پر افسانہ کی بنیادی ساخت آشکار کی ہے چنانچہ انہوں نے افسانے میں علامت کو برتتے ہوئے نہ صرف فنی ہوش مندی کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ علامتی افسانے کے تخلیقی امکانات کا شعور حاصل کیا اور اس شعور کو اپنے اردو افسانے کی تعمیر میں صرف بھی کیا ہے جس سے ان کے افسانے تہ دار معنویت کے حامل ہو گئے ہیں۔

حنیف باوا نے علامتی افسانے بھی لکھے ہیں اور غیر علامتی بھی۔ تاہم اپنے غیر علامتی افسانوں میں بھی انہوں نے خود کو سادہ، اکہرے بیانیے تک محدود نہیں رکھا۔ پہلے چند باتیں ان کے علامتی افسانوں کے متعلق۔

معانی کی کثرت کو ممکن بناتی ہے بلکہ اشیاء و مظاہر کے درمیان نئے اور تازہ رشتے بھی دریافت تخلیق کرتی ہے اور آگہی کے نئے نئے چراغ روشن کرتی ہے۔ حنیف باوا کا فنِ افسانہ نگاری اتنا پختہ اور رچا ہوا ہے کہ وہ محض واقعہ، کردار یا صورتِ حال کے سادہ بیانیے پر اکتفا نہیں کرتے۔ ہر چند افسانہ بنیادی طور پر بیانیہ (Narrative) ہے مگر یہ خارجی حالات و واقعات اور اشخاص کی ہو بہو تصویر نہیں ہوتا۔ بیانیے کی تخلیقیت کا تقاضا ہے کہ یا تو کردار اور واقعات نئے سرے سے تخلیق کیے جائیں اور یوں زندگی کرنے کے نئے نئے تجربات اور امکانات کی جستجو کی جائے یا پھر معاشرے میں موجود کرداروں کو بیانیے میں کچھ اس طور ''برتا'' جائے کہ وہ معاشرتی اور تہذیبی کروٹوں کے نمائندہ بن جائیں۔ حنیف باوا نے افسانے کے ان دونوں فنی رموز سے کام لیا ہے۔

ان کے بیشتر علامتی افسانے اپنے مقصد کے اعتبار سے سیاسی ہیں مگر یہ محدود زمانی سیاسی صورتِ حال کے عکاس نہیں ہیں۔ اگرچہ انہوں نے بعض افسانے مارشل لاء دور میں لکھے جب اظہار کا بنیادی حق چھین لیا گیا تھا۔ ان افسانوں میں غیر معمولی جبر اور آمرانہ طرزِ حکمرانی اور ان کے انسانی سماج پر اثرات کو علامتی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے اور ایک لحاظ سے ضمیرِ فن کے احتجاج کو اوراقِ تاریخ میں ریکارڈ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسی طرح بعض افسانے دہشت گردی اور ظلم کے موضوع پر بھی انہوں نے لکھے ہیں ان میں احتجاج کا رنگ چوکھا ہے مگر انہوں نے نہ صرف احتجاج کو عوامی نعرہ بازی میں بدلنے نہیں دیا اور یوں فن کو حرمت اور اوّلیت دی ہے بلکہ انہوں نے ظالم اور غیر عادلانہ نظامِ معاشرت کو موضوعِ افسانہ بناتے ہوئے اپنی تخلیقی بصیرت بھی پیش کر دی ہے۔ ایک شاعر کی بصیرت تو جدا ہو سکتی ہے اور اس میں صوفی یا پیغمبر کا سا مکاشفہ بھی ہو سکتا ہے مگر ایک افسانہ نگار کی بصیرت اپنی معاشرتی اور تہذیبی صورتِ حال سے منسلک ہوتی ہے چنانچہ حنیف باوا کے ہاں جس بصیرت نے نئی مصنوعی جہات پیدا کی ہیں اور وہ اپنے معاشرتی تہذیبی ماحول سے مربوط ہے۔ اپنے افسانے ''پھول چہروں سے پھوٹتی روشنی'' میں انہوں نے ایک دہشت گرد کی قلبِ ماہیت کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ دہشت گرد کے ہاتھ میں دھماکہ خیز مواد سے بھرا ہوا بریف کیس ہے جسے وہ شہر کے انتہائی مصروف اور پُر رونق بازار میں کسی مناسب مقام پر رکھنے کے لیے گامزن ہے۔ اس کے آگے آگے ایک بچہ اور ماں ہیں۔ وہ جب بچے کی معصومیت اور ماں کی ممتا کو دیکھتا ہے تو اس کا دل پسیج جاتا ہے۔ بچہ انسانیت کا مستقبل ہے اور ماں اس مستقبل کی محافظ ہے۔ دہشت گرد پر جب یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے تو وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہے اور تیز قدموں سے بازار سے بہت دُور چلا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے اسے اس نیکی کا خمیازہ کسی کڑی سزا (جو موت بھی ہو سکتی ہے) کے طور پر بھگتنا پڑا ہوگا۔ افسانہ نگار کی جس بصیرت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بس یہی نہیں۔ غور کریں تو افسانہ نگار نے یہ بتانا چاہا ہے کہ دہشت گرد بھی ایک عام آدمی ہے جس نے اپنی آزادیٔ عمل کو کسی طاقتور اور ظالم کے ہاتھ کر دیا ہے مگر جس کے ارادے کی آزادی ابھی بھی اس کے اختیار میں ہے۔ افسانہ نگار کی بصیرت دو

باتوں کو مزید اجاگر کرتی ہے۔ایک یہ کہ ارادے کی آزادی میں ہی آدمی کا انسان ہونا پنہاں ہے۔ دوئم اسے بروئے کار لا کر انسان نہ صرف خود کو بلکہ اپنے باہر کو بھی بدل ڈالنے پر قادر ہے۔

حنیف باوا نے افسانوں میں ایسے کردار بھی پیش کیے ہیں جنہوں نے اپنی قوتِ عمل کے ساتھ ساتھ قوتِ ارادی کو بھی کسی آمر کے پاس گروی رکھ چھوڑا ہے۔''ایک تھا حاکم'' میں حنیف باوا نے ایک حد درجہ ظالم، مکار اور استحصال کار حاکم کا کردار تراشا ہے۔اس کی بستی کے لوگوں نے اپنے وجود کی آخری حدوں تک خود کو آقا کا فرماں بردار بنا رکھا ہے۔عمل کی آزادی سے محروم ہو کر آدمی کے وجود کا صرف ایک حصہ مفلوج ہوتا ہے مگر ارادے کی آزادی کے کھو جانے سے اس کا پورا وجود ناکارہ ہو جاتا ہے اور وہ محض مٹی کا پُتلا رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ''ایک تھا حاکم'' کی رعایا کا نہ کوئی مستقبل ہے نہ ماضی اور حال ایک مردہ لمحہ ہے۔افسانے کے آخر میں افسانہ نگار نے دکھایا ہے کہ جب بستی کے لوگ جنگ کا بگل بجنے پر دوڑتے ہیں تو ایک ضعیف العمر شخص، جس کے دل میں موت سے زیادہ اپنے حاکم کی ناراضگی کا ڈر ہے، ڈنڈا لے کر دوڑتا ہے مگر بپھرے ہوئے لوگوں کے پاؤں تلے آکر کچلا جاتا ہے اور کسی کو نہ اس کی پرواہ ہے نہ خبر۔حتیٰ کہ حاکم تک بھی اس کے جاں نثارانہ جذبے کی آنچ نہیں پہنچتی۔یہ بوڑھا شخص اس بستی کا ماضی ہے جسے یہ بستی بظاہر اپنی بقا کے جنون میں مسل ڈالتی ہے مگر نہیں جانتی کہ ماضی کو خاک میں ملانے سے وہ اپنی صورتِ حال کو بدلنے کے لیے انسپریشن کہاں سے حاصل کرے گی۔ایسے لوگوں کی زندگی افسانہ نگار کی نظر میں ایک دائرے میں مقید ہے۔ جہاں حبس اور گھٹن کے سوا کچھ نہیں۔اس دائرے سے باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے''انسان کی طاقت'' جس سے یہ لوگ محروم ہو چکے ہیں۔افسانہ نگار نے ایسے کرداروں کی پیشکش میں ایک طنزیہ رویہ روا رکھا ہے۔

جب انسان کا عمل یعنی باہر اور ارادہ یعنی باطن دونوں پابہ گِل ہوں تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس سوال کا جواب ان کے چند دوسرے افسانوں سے مِل جاتا ہے۔''ایک تھا حاکم'' اور ''فصیل پراِنڈیکس'' میں انہوں نے دکھایا ہے کہ بعض حالات میں ریاستی جبر اور حکمران کی انا اس کی ذمہ دار ہے اور بعض حالات میں تقدیر''دائرے میں گھرے لوگ'' میں انہوں نے تقدیر کو انسانی دُکھوں (جن میں غربت سرِفہرست ہے) کا باعث ٹھہرایا ہے۔اس افسانے میں تین نسلیں ایک جیسی حالت میں گرفتار رہتے ہوئے جیون بتاتی ہیں۔ وقت کی گزران ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں لاتی۔ وہ لوگ اپنی غربت کے دائرے سے نکلنے سے قاصر ہیں۔

یہاں یہ کہے بنا چارہ نہیں کہ افسانہ نگار کی یہ اپروچ جنوبی ایشیاء کی عمومی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال کی زائیدہ ہے۔اس خطے کی عوام نے گو اس صدی میں انگریزی استعمار سے آزادی حاصل کر لی مگر آزادی کے سارے ثمرات محدود حکمران طبقے اور ان کے حلیفوں کو ہی ملے ہیں۔ یہاں کی معاشرتی اور معاشی حالت میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔لہٰذا یہاں کی اکثریت کا مقدر ناخواندگی، بیماری اور غربت جیسے مسائل اور مصائب ہیں۔چنانچہ حنیف باوا کے ہاں تقدیر کے مفہوم میں کسی ماورائی اور مابعد الطبیعاتی ارادے سے زیادہ حاکم طبقے کی خواہشات سے پیدا ہونے والا''کلچر'' شامل ہے۔

حنیف باوا نے اپنے کئی افسانوں میں غربت کو موضوع بنایا ہے مگر ہر افسانے میں اس موضوع کی مختلف جہات کو خالص فنی انداز میں (اور علامت کو بروئے کار لاتے ہوئے) روشن کیا ہے۔''نہر کی پٹڑی'' کا مرکزی موضوع بھی یہی ہے مگر وہ غربت کے مارے ایک مزدور کا کردار پیش کرتے ہوئے اس کردار کی تہذیبی گہرائیوں میں اُترتے ہیں۔مشرق کی تہذیبی فضا میں مابعد الطبیعاتی عنصر بہت زیادہ ہے۔ یہاں کے عام افراد مشکل کا حل تدبیر اور تجزیے کے بجائے ماورائی ذریعے میں پانے کے خوگر ہیں۔''نہر کی پٹڑی'' کا بوڑھا مزدور نہر کے کنارے چل رہا ہے۔تھکا ہوا اور درماندہ ہے۔ ہاتھ خالی اور پاؤں بوجھل ہیں۔بیوی اور بچوں کی فکر کھائے جا رہی ہے۔شام کی پروائی، درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور نہر کے آہستہ خرام پانی سے مرتب ہونے والا سحر فطرت اس پر کارگر نہیں۔ وقت رُکا ہوا لگتا ہے مگر پھر اچانک ایک بزرگ ظاہر ہوتے ہیں اور اس کے خالی ہاتھوں پہ کچھ سکّے رکھ جاتے ہیں۔ بوڑھا مزدور خوش بھی ہوتا ہے اور حیران بھی کہ یہ فرشتہ غیبی ہے یا شیطان ہے۔اس کی مدد کی جارہی ہے یا آزمایا جا رہا ہے۔افسانہ نگار نے اس واقعہ کو نہ تو اہم قرار دیا ہے اور نہ ایک حقیقی واقعہ۔اس نے دراصل مشرقی انسان کی نفسیات سے پردہ اُٹھایا ہے اور اس کے اس ایقان کو پیش کیا ہے کہ جب زمین پر سارے راستے بند ہوں تو آسمان پر سے ایک راستہ وا ہوتا ہے۔ساختیاتی فکر کے مطابق انسانی داخلی واردات اس کے لسانی نظام کے تابع ہوتی ہے اور لسانی سسٹم ثقافتی کنونشنز سے متاثر ہو رہا ہے۔ یوں دیکھئے تو افسانہ نگار نے اس افسانے میں مشرقی ثقافتی نظام کی گہرائیوں کو مس کیا ہے۔ جس سے افسانے میں معنیاتی تہہ داری پیدا ہوئی ہے۔

افسانہ''سارنگی والا'' کا موضوع بھی غربت ہے۔افسانے میں غربت کے تناظر میں ایک اہم انسانی مسئلے کو اُبھارا گیا ہے۔ایک فنکار بیک وقت فن اور دُنیا کے ساتھ اپنے رشتے میں توازن کس طرح قائم رکھ سکتا ہے؟ تخلیقِ فن اور مظاہرۂ فن میں قدرت نے ایک ایسی سحر طراز لذت رکھ دی ہے کہ باقی ساری مسرتیں ہیچ لگتی ہیں نیز فن کی تکمیل (جو کبھی نہ رُکنے والا عمل ہے) گہری داخلیت اور مسلسل ریاض کا مطالبہ کرتی ہے جس سے فنکار کی سماجی ذمہ داریاں متاثر ہوتی ہیں۔اکثر فنکار کے باطن میں آمیزش بپا رہتی ہے، ایک طرف کعبۂ فن اسے کھینچتا ہے اور دوسری طرف کلیسائے دنیا اسے اپنی جانب بلاتا ہے۔''سارنگی والا'' میں سارنگی نواز دو بیٹیوں کا باپ اور ایک بیوی کا شوہر ہے اور بے حد غریب ہے۔خاندان کی معاشی کفالت کا انحصار سارنگی بجانے سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہے جو بہت معمولی ہے (کہ ہمارے معاشرے میں فن کی قدر ہی کتنی ہے؟) بیوی اسے یہ مزدوری چھوڑ کر کوئی

دوسرا ڈھنگ کا کام کرنے کو کہتی ہے مگر اس کے لیے فن کی لذت اتنی گہری اور پائیدار ہے کہ وہ اسے چھوڑنے سے قاصر ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اندر سے کٹھور ہو گیا ہے اور اسے اہل وعیال کی پرواہ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ایک رات جب وہ اپنے فن کے لاوارث ہو جانے (کہ وہ اپنے باپ کی طرح اپنے بیٹے کو یہ فن منتقل نہیں کر سکتا کہ بیٹا ہے ہی نہیں) کے اندیشوں میں گھرا، مضمحل سا ہوتا ہے اور بیٹی اسے چائے دینے آتی ہے تو اسے یہ خوش کن خیال آتا ہے کہ یہی بیٹی اس خاندان کے فنی ورثے کو اگلی نسلوں میں منتقل کرے گی۔ (غور کریں تو یہ خواہش، حیاتیاتی بقاء کی خواہش سے چنداں مختلف نہیں جس طرح آدمی اپنی اولاد میں خود کو زندہ باقی دیکھتا ہے اسی طرح وہ اپنے فن وہنر کو بھی اپنی آل اولاد میں جاری وساری دیکھنا چاہتا ہے) مگر جونہی اس کی نظر بیٹی کے سفید بالوں کی لٹ پر پڑتی ہے تو وہ سب بھول بھال کر بیٹی کے دُکھ میں کھو جاتا ہے اور اس کی پلکیں نم آلود ہو جاتی ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ بوڑھے سارنگی والا کے آنسو ندامت کے ہیں یا بے بسی کے۔

حنیف باوا نے گو کم افسانے لکھے ہیں مگر انہوں نے ان میں انسانی زندگی کے بعض بنیادی سوالات اور اہم سروکاروں کو جگہ دی ہے۔ مذکورہ بالا افسانے میں فن، فنکار اور دنیا کے تثلیثی رشتے کو موضوع بنایا گیا ہے جبکہ افسانہ ''جوگ'' میں یہی سوال انسان اور کائنات کے رشتے تک پھیل گیا ہے۔ ''سارنگی والا'' میں فن اور دنیا کی جو کشمکش ہے اور جس کا شکار فنکار ہے، ''جوگ'' میں اس کشمکش اور ثنویت کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مہاتما بدھ کو برگد کے نیچے جو نروان ملا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ خواہش سب دُکھوں کی جڑ ہے اور خواہش حواسِ دنیا کے تال میل سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا دُکھوں سے نجات کے لیے خواہش کو کچلنا اور خواہش کی افزائش کرنے والے ذرائع سے منہ موڑنا لازم ہے۔ مگر ''جوگ'' میں افسانہ نگار نے یہ بتایا ہے کہ من کی شانتی دنیا تیاگنے میں نہیں، دنیا سے ایک اخلاقی رشتہ قائم کرنے میں ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار کو گرو دیو ''دھیان کی خوشبو'' کے کھیتوں کو ایک کنویں کے ذریعے سینچنے کے کام پر لگاتے ہیں۔ من کی شانتی کی خواہش اور تلاش کا مارا ہوا یا مرکزی کردار حیران ہوتا ہے کہ گورو دیو نے اسے یہ کس کام پر لگا دیا ہے، نہ ہاتھ میں کشکول دیا ہے نہ بدن کو اذیتیں پہنچانے والی ریاضتوں کی تلقین کی ہے مگر چونکہ گورو اور چیلے کے روایتی تعلق میں یہ لازم ہے کہ چیلا بلا حیل وحجت گورو کے ہر فرمان کی بجا آوری کرے۔ اس لیے وہ ''دھیان کی خوشبو'' کی کنویں کے پانی اور اپنے جسم کے پسینے سے آبیاری کرتا رہتا ہے اور جب کھیت میں پھول آتے ہیں اور بستی کی مالنیں ان پھولوں کو چننے آتی ہیں تو گورو دیو جس کا بسیرا برگد کی گھنی چھاؤں میں ہے اسے جوگ دے دیتے ہیں۔ اسے اس کے کپڑے لوٹاتے ہوئے یہ لافانی جملے ادا کرتے ہیں:

''بچہ یہ لے اپنا جوگ، اسے اپنے تن سے جدا مت کرنا، اس لیے کہ اس سے اب تیرے من کو سدا شانتی ملتی رہے گی۔ اب تو جا اپنی دنیا میں واپس پلٹ جا۔ ہاں جانے سے پہلے آخری بار ان بچوں کے لیے گھوڑا بنتا جا جو برگد کے نیچے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔''

گویا من کی شانتی دُنیا اور کائنات سے بیک وقت ایک اخلاقی اور تخلیقی رشتہ قائم کرنے سے مشروط ہے۔ ''دھیان کی خوشبو'' کو سینچنا ایک کھیل ہے، یہ اپنے اندر غوطہ زن ہونے یا مراقبہ میں مبتلا ہونے کا عمل بھی ہے اور اس عمل کی خوشبو سے نوعِ انسانی کی مسرت میں اضافہ کرنا بھی ہے۔ اس عمل کی اوّل الذکر جہت روحانی اور تخلیقی اور آخر الذکر جہت اخلاقی ہے۔

یہ افسانہ اپنے موضوع، اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے اتنا اہم، خیال انگیز اور بصیرت افروز ہے کہ اردو افسانے کے کڑے انتخاب میں جگہ پانے کے قابل ہے۔

''باہر کا آدمی'' بھی اپنی نوعیت کا ایک انوکھا افسانہ ہے۔ باہر کا آدمی یعنی Outsider حنیف باوا کے کم از کم تین افسانوں میں روپ بدل بدل کر ظاہر ہوا ہے۔ ''ایک تھا حاکم'' میں یہ پاگل کے روپ میں آیا ہے جو لوگوں کی انفعالیت اور نام نہاد قناعت شعاری پر اُونچے اونچے قہقہے برساتا ہے۔ لوگ اس کے قہقہوں کے طنزیہ ورمزیہ رنگ کو دل ہی دل میں پہچان جاتے ہیں اور اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ ''فصیل پر انڈیکس'' میں یہ کردار رات کے گم سم اندھیرے میں سنگین بردار پہریدار کے پاس آتا ہے اور بڑی سرکار کے حکم سے جس فصیل کو شہر کے مثالی انڈیکس سے سجایا گیا ہوتا ہے اس کے اندر گھس جاتا ہے اور فصیل پر لرزہ طاری کر دیتا ہے اور ''باہر کا آدمی'' میں یہ outsider بستی کے ایک شخص کے جنازے کے جلوس میں اچانک ظاہر ہوتا ہے اور افسانے کے واحد متکلم سے مرنے والے کی موت کے سبب پر گفتگو کرتا ہے۔ وہ افسانے کے راوی پر اس آدمی کی موت کے راز کا آشکار کرتا ہے۔ وہ اشارۃً بتاتا ہے کہ اگر بستی کے ساتھ والے قادرے کے باغ کی خوشبوؤں سے بستی والوں کا تعلق قائم رہتا تو شاید یہ موت واقع نہ ہوتی۔ یہ باہر کا آدمی فطرت، حسنِ فطرت اور تخلیقی قوتوں سے کٹنے کے عمل کو خودکشی پر محمول کرتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے بین السطور ایک بار پھر انسانی ارادے کی موت کے مضمحل ہو جانے کو داخلی اور خارجی موت کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حنیف باوا نے اپنے افسانوں میں مَیں ایک ایسا منفرد کردار تخلیق کیا ہے جو عمومی انسانی صورتِ حال سے ہمیں ایک پیغمبر کی طرح آگاہ کرتا ہے اور اس صورت حال سے نجات پانے کی راہ سمجھاتا ہے۔ یہ کردار باہر کا آدمی اس لیے نہیں کہ یہ کسی دوسری دنیا سے آیا ہے۔ یہ ہماری ہی ذات کا ایک گمشدہ حصہ ہے جسے ہم نے اپنی کاہلی، انفعالیت، سطحیت پسندی اور لوبھ کرودھ کی وجہ سے کھو دیا ہے۔ مگر تخلیق کار چونکہ انسان کی باطنی، روحانی اقدار کا نمائندہ اور انسان کی کلیت کا محافظ ہوتا ہے اس لیے حنیف باوا نے اس کردار کی تخلیق اور بازیافت سے تخلیق کار کی بنیادی ذمہ داری نبھائی ہے۔

من حیث المجموع حنیف باوا کے افسانے موضوع، تکنیک اور اسلوب کی عظمت اور نئے پن کی وجہ سے اردو افسانوی ادب کی روایت میں ایک قابلِ ذکر اضافہ اور تاریخ میں دیر تک گونج پیدا کرنے کا موجب ہوں گے۔

باہر کا آدمی

پروفیسر صفدر علی شاہ
(جھنگ)

حنیف باوا عہد حاضر کے ایک ایسے فلکار ہیں جن کی تحریریں مشاہدے اور تجربے کا حسین امتزاج لئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے اردو افسانوی مجموعے ''باہر کا آدمی'' میں شامل چوبیس افسانوں دو ڈبڈبائی آنکھیں، خود سے مکالمہ، ایک حبس زدہ رات کے بعد، دروازہ کھلا ہے، دائرے میں گھرے لوگ، پھول چہروں سے پھوٹتی روشنی، فصیل پر انڈیکس، نہر کی پٹڑی، چھتری، سارنگی والا، چھتر چھاؤں، جمہوری چوک، جی سر، زنجیر سے بندھا وجود، کون چاہے گا اُسے، ایک تھا حاکم، روشنیوں سے اس طرف، جوگ، اجنبی، نشئی، فاصلے، موجی بابا، باہر کا آدمی اور کی جاناں میں کون میں سماج کے رویوں پر گہرے نشتر چلائے ہیں مگر وہ انسانی رویوں پر کڑھتے اور آگ بگولہ ہوتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسے منفی پہلو بھی انسان کی سرشت میں داخل ہیں۔ شعور کی آنکھ کھولنے کے ساتھ ہی انسان ہمیشہ خواب دیکھنے کا عادی رہا ہے۔ وہ خواب اور سراب کو مادی زندگی پر مسلط کرنے کا خواہشمند بھی ہے۔ حنیف باوا کے افسانوں کی ساری زندگی اسی کیفیت سے دوچار ہے اس لیے وہ اپنے کردار کا معاشی پس منظر سب سے پہلے تلاش کرتے ہیں۔ یہ ان کی انفرادیت ہے اور ساتھ ہی مخصوص نظریہ کے پرچار کے لیے کرداروں کے منہ میں اپنی زبان بھی رکھ دیتے ہیں۔ اس کا ہر کردار ماحول سے بے زار، نامعلوم سی آواز کا شکار، ذہنی کشمکش میں مبتلا، چاروں طرف کی دنیا سے پریشان، عصبی ہیجان کی کسل مندی پر مضطرب، احساس تنہائی سے دوچار اور ناسازگار ماحول کا پروردہ مجبور و محبوس ہے۔ حنیف باوا کا ہر افسانہ کسی ایک کردار کے گرد گھومتا ہے۔ اس طرح انہوں نے یک رخی تصویر کو ابھار کر یہ تاثر دیا ہے کہ یہاں صرف جبر اور بربریت کا راج ہے اور معاشرہ کی تہذیب و اقدار کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ یہ جزوی حقیقت تو ہے مگر اسے کلی حقیقت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے افسانوں کا کم و بیش سارا مواد شہری زندگی سے اکٹھا کیا گیا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ صنعتی، سائنسی اور مادی ترقی سے لرزاں ہیں۔ حالانکہ زندگی کا دوسرا روپ دیہاتوں میں بھی موجود ہے، انہیں امید کی کرن کہیں نہیں دکھائی دیتی۔ بیشتر افسانوں کا اختتام مایوسی کے الفاظ پر منتج ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں جو اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک مدت سے کچھ سوچ رہے ہیں جونہی وہ اہم لمحہ یا واقعہ ان کے سامنے آتا ہے تو وہیں سے ان کا افسانہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی ابتدائیں عمدہ فنی تاثر پیدا کرتی ہیں۔ پہلا افسانہ ''دو ڈبڈبائی آنکھیں'' کا ابتدائیہ دیکھئے:

> ''اس نے الوداع ہوتے وقت ان دو ڈبڈبائی آنکھوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں لیکن ان کی سماعت نے تو اپنے تمام کواڑ بند کئے ہوئے تھے۔''

ایک اور افسانہ ''چھتری'' کا ابتدائیہ بھی ملاحظہ ہو۔

> ''جب بھی وہ اپنے حصے کی ضروری اشیا، آٹا، دال، چاول، کپڑے لینے کے لیے کیمپ کے منشی کے پاس جاتی، وہ بڑی بڑی مونچھوں میں چھپے ہوئے ہونٹوں پر گرسنہ مسکراہٹ بکھیر کر کہتا، آؤ سوہنیو''۔

افسانہ ''فاصلے'' کا ابتدائی نمونہ بھی دیکھئے:

> ''دیکھ لو، حمید اور اس کی دلہن ہمیں کتنا پیچھے چھوڑ گئے ہیں''۔
>
> ''ہاں''۔۔۔ حمید کی ماں نے جیسے آہ بھری۔ ''وہ تو جیسے ہمارے ساتھ چل کے بالکل ہی خوش نہیں۔ ویسے تو انہوں نے شادی والے گھر ہی کہہ دیا تھا کہ ہم آج چلے جاتے ہیں آپ لوگ کل آ جانا''۔

تکنیک کے لحاظ سے ان کے افسانوں کی ابتدائی لائنیں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ وہ اس تجسس کو آخری قطار تک برقرار رکھتے ہیں۔ اس طرح وحدت تاثر کا عمدہ نمونہ سامنے آتا ہے۔ کہیں کہیں مصنف خود بھی کھل کر سامنے بھی آ جاتے ہیں اس طرح وہ اپنی ذات کو موضوع اور کردار سے لاتعلق نہیں رکھ سکے۔ آغاز تو عدم وابستگی سے کرتے ہیں مگر اسے پوری طرح نبھا نہیں سکتے۔ افسانہ نگاری میں یہ تکنیک خامی متصور ہوتی ہے مگر حنیف باوا نے فنی مہارت سے بیشتر مقامات پر خلوص کے ساتھ خوبی بنا دیا ہے۔ وہ افلاس کی تصویر میں عمدہ رنگ بھر کر بھی فطرت کے قریب رہتے ہیں۔ وہ دیومالائی کہانیوں کا حصہ نہیں بنتے۔ تکنیک کے لحاظ سے یہ افسانے بیانیہ ہیں۔ افسانہ ''زنجیر سے بندھا وجود'' کے درمیانے حصے سے ایک ٹکڑا دیکھیں:

> ''لیکن جب وہ لوگ ان کی باتوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں تو ان کی نظریں ان بوجھل جیبوں کو خالی کئے بغیر بے نیل و مرام واپس لوٹ آتیں''

آخری لائن میں افسانہ نگار تکنیک کے دوسرے پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں جو اس تاثر کو نمایاں کرتا ہے۔

> ''ملازم کی اس چیخ کو سن کر اس نے گلاس کو جھنجھلاہٹ کے ساتھ ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئی۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اس وقت اس پاگل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوتی تھیں''

حنیف باوا کی قلم پر گرفت مضبوط ہے۔ وہ ثقیل اور بوجھل الفاظ سے افسانے کا تانا بانا نہیں بنتے۔ وہ کردار کو اس کی اپنی زبان میں بات کرنے کا موقع بھی دیتے ہیں۔ ان افسانوں کے اسلوب میں ان کی نظریاتی وابستگی کارفرما ہے۔

حالانکہ ادب کو صرف ایک پہلو سے دیکھنا اور اسی پہلو کے لیے وقف کر دینا قابل ستائش رویہ نہیں ہے۔ ادب میں براہ راست عصری واقعات کا ہونا مناسب ہوتا ہے مگر روح عصر کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کے موضوعات میں کوئی جدت نہیں ہے بلکہ موضوعات میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ شاید اسی وجہ سے غربت وافلاس ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں جن کی گہری چھاپ اور اثرات ان کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ افسانوں کے کردار خود کو ایسے ماحول میں مقید پاتے ہیں جہاں پر وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں ہیں۔ یہ احساس محرومی ان کے افسانوں کا غالب رجحان ہے۔ اس کا کردار جنسیت زدہ نہیں ہے اور نہ ہی اندھیرے میں کسی کو پکڑنے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ افسانہ ''چھتری'' میں منشی کا کردار اس کی واضح مثال ہے۔ افسانوں کا مواد عزم اور بزدلی کے درمیان کھڑا ہو کر مایوسی کی طرف جھک جاتا ہے۔ اس میں تخیل کی سحر کاری جو فوری اپنا اثر دکھاتی ہے۔ یہیں سے افسانوں کی داخلی بنیادیں مستحکم ہو جاتی ہیں۔ کہیں کہیں یہ داخلیت خارجی عناصر کے احساس سے مدھم ہو جاتی ہے۔ حنیف باوا کے افسانوں میں انانیت اور برتری کا احساس نہیں پایا جاتا بلکہ ماحول کی ناسازگاری کا احساس، خارجی عناصر کی بے ترتیبی اور انتشار کے باعث خود کو اس وسیع دنیا میں ایک حقیر سی شے سمجھنے لگتا ہے۔ وہ واقعات کو جوں کا توں بیان کر کے روداد نویسی کی سرحدوں کو بھی چھونے لگ جاتے ہیں مگر فنی جا بکدستی سے الزام سے سراسر بچ نکلتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانے ''جمہوری چوک'' میں نام نہاد جمہوریت پسندوں کی قلعی کھول دی ہے۔ اس مجمع میں ایک بچہ امیدوں کا مرکز بنتا ہے جو اپنی کھلی آنکھ سے ان سارے کرتبوں کو دیکھ رہا ہے اور یہ سرکل بغیر کسی منطقی نتیجے پر پہنچے جاری دکھائی دیتا ہے۔ کوئی موہوم سی امید بھی نظر نہیں آتی۔ ان کا یہی رویہ افسانہ ''ایک تھا حاکم'' میں موجود ہے جہاں ظلم کی چکی میں پسنے والے حاکم کے خلاف بغاوت تو کجا ایک لفظ کی ادائیگی بھی دور کی بات ہے۔ اس کے خلاف سوچنے پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

حنیف باوا کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ماحول اور معاشرے کی عکاسی، کرداروں کی نفسیات سے واقفیت کا شعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ ان میں گہرائی میں ڈوب کر لکھنے کی عادت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی خوبیاں نمایاں ہیں۔ جو شخص اصل چہرے پر دوسرا چہرہ سجا کر اپنی دوہری شخصیت کے ساتھ باہر نکلتا ہے۔ افسانہ نگار اس کی خوب خبر لیتا ہے مگر وہ افسانہ نگار کی نشست سے اٹھ کر باغی اور محتسب نہیں بنتا۔ حنیف باوا نے افسانوں کو گہری علامتیت، تجریدیت اور رمزیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ دلچسپ اور سادہ اسلوب کی وجہ سے ابلاغ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہر اچھا افسانہ مشاہدے اور تخیل کی آمیزش سے ہی تکنیک کے ساتھ مل کر فن کی معراج حاصل کر رہا ہے۔ افکار کا وزن معلوم کرنے کے لیے احساس ہی بہترین ترازو ہے۔ ان کے افسانوں کو اس ترازو میں ڈالیں تو وزن دار ثابت ہوتے ہیں۔

جھوٹی باتیں

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودائی ہیں؟

ہیں لاکھوں روگ زمانے میں، کیوں عشق ہے رسوا بیچارا
ہیں اور بھی وجہیں وحشت کی، انسان کو رکھتیں دکھیارا
ہاں بے کل بے کل رہتا ہے، ہو پیت میں جس نے جی ہارا
پر شام سے لے کر صبح تلک یوں کون پھرے گا آوارہ؟
یہ باتیں۔۔۔۔۔۔

یہ بات عجیب سناتے ہو، وہ دنیا سے بے آس ہوئے
اک نام سنا اور غش کھایا، اک ذکر پہ آپ اداس ہوئے
وہ علم میں افلاطون سنے، وہ شعر میں تلسی داس ہوئے
وہ تیس برس کے ہوتے ہیں، وہ بی۔اے، ایم۔اے پاس ہوئے
یہ باتیں۔۔۔۔۔۔

گر عشق کیا ہے تب کیا ہے، کیوں شاد نہیں آباد نہیں
جو جان لیے بن ٹل نہ سکے، یہ ایسی بھی اُفتاد نہیں
یہ بات تو تم بھی مانو گے، وہ قیس نہیں فرہاد نہیں
کیا ہجر کا دارو مشکل ہے؟ کیا وصل کے نسخے یاد نہیں؟
یہ باتیں۔۔۔۔۔۔

وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے، تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لانبے گیسو ہیں، پہچان گئے پہچان گئے
ہاں ساتھ ہمارے انشا بھی اُس گھر میں تھے مہمان گئے
پر اس سے تو کچھ بات نہ کی، انجان رہے انجان گئے
یہ باتیں۔۔۔۔۔۔

جو ہم سے کہو ہم کرتے ہیں، کیا انشا کو سمجھانا ہے؟
اس لڑکی سے بھی کہہ لیں گے، گو اب کچھ اور زمانا ہے
یا چھوڑیں یا تکمیل کریں، یہ عشق ہے یا افسانہ ہے؟
یہ کیسا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسا تانا بانا ہے؟
یہ باتیں۔۔۔۔۔۔

ابنِ انشاء

ہمدردانہ حقیقت نگاری

غلام شبیر اسدؔ
(جھنگ)

بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں مشرقی ادب، مغربی سیاسی وسماجی تبدیلیوں سے نہ صرف آشنا ہوا بل کہ بڑی حد تک متاثر بھی ہوا۔ ان تبدیلیوں کے زیر اثر کرب ونشاط، خوف وامید کے بدلتے زاویوں سے ہیجان انگیز کیفیت سے دوچار ہوئے مشرقی ادباء شعرا کو روایت کے جبر سے آزادی کی نوید دینے کے ساتھ ساتھ اپنے داخل کو سنوارنے کے بجائے خارج کی ہنگامہ آرائیوں میں ضم ہونے اور سماجی حقیقتوں پر پھٹ پڑنے کے رویوں کو پروان چڑھایا۔ علاوہ ازیں نئے فکری منطقوں کی سمت جست بھرنے، خوشی وغم کے نئے اور خوش آئند لمحوں کی بازیافت کے تازہ کار رویے بھی سامنے آئے۔ تخیلاتی اور مابعد الطبیعیاتی اعتقادات کے بجائے پیش منظر میں موجود عوامل پر منطقی/عقلی زاویہ ہائے نگاہ کو بیشتر شعبہ ہائے حیات میں فروغ ملا، غور کریں تو ان معروضات کے پس منظر میں کر کے گارڈ، سارتر، ڈیکارٹ کے فلسفے (میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں)، ڈارون (کا نظریۂ ارتقا)، آئن سٹائن (نظریۂ انسانیت)، فرائیڈ، ژونگ، ایڈلر (انسانی سائیکی کا ماڈل)، کارل مارکس (مادی جدلیاتی تھیوری) اور ارنسٹ ہائزخ ہیکل (نیچرازم) ایسے نظریات کارفرما نظر آتے ہیں جن کی بدولت مذہب اور اس سے متعلق رسم ورواج پر موجود شکوک وشبہات میں اضافہ ہوا، حد سے بڑھی ہوئی عقل پرستی کا لازمی نتیجہ اخلاقیات وروایات کے انہدام کی صورت میں ظاہر ہوا۔۔۔ جہاں مابعد الطبیعاتی حقیقتوں کا نہ صرف بطلان کیا گیا وہاں ان میں موجود نقائص کو بھی نشان زد کیا گیا تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق، نیا زمانہ نئے صبح وشام پیدا کر، کی کیفیت سے گزرا۔ بہ الفاظ دیگر ''خود شعوریت'' اور ''جدیدیت'' کے فکری نظام بالعموم تھیوری کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ نیچریت (فطرت کے خارجی مظاہر کی بوقلمونی)، رومانیت (تخیل کی آزادی اور مروّجہ اخلاقیات سے گریز)، حقیقت نگاری (جس کا محور ادب میں عصری مسائل کو منجملہ جزئیات کے ساتھ بیان کرنا اور زندگی کی حقیقی الجھنوں کو طشتِ از بام کرنا تھا) اور ترقی پسندی (زندگی کی مادی تعبیر اور اس کی بنیاد پر ایک نئے سماج کی تعمیر وتشکیل) ایسی اصطلاحات نے مشرقی ادب کو یکسر نئے زاویے ہائے نظر عطا کیے۔ ان اصطلاحات ونظریات کی عمل داری ادب پر استخراجی اور استقرائی ہر دو انداز میں ہوئی، معاصرانہ حقیقتوں کی جدید تعبیرات کے ذریعے تو جیہہ پیش کی گئی دراصل مذکورہ معروضات جدیدیت کو فلسفیانہ بنیادیں بہم کرنے والے ہیں، جن کے مظاہر مغرب میں سترہویں صدی کے بعد رُونما ہوئے اور ہمارے ہاں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں ظاہر ہوئے۔ جدیدیت کے دعویٰ (عقل اور سائنسی علم کے ذریعے ہمہ گیر انسانی ترقی ممکن ہے) کے عقب میں مغربی فلاسفر کے افکار برسرِ پیکار نظر آتے ہیں انہیں افکار کی روشنی میں جدیدیت نے اپنے مہا بیانیے (عقل خود مختار ہے، موضوع اور معروض اور معروض لازماً جدا ہیں۔ انسانی عقل پر بھروسہ کر کے ترقی کی تمام منزلیں طے کی جا سکتی ہیں، سائنسی علم ہی حقیقی علم ہے، تمام مسائل کا حل ممکن ہے، آدمی خود مختار فرد ہے، مغربی تہذیب ماڈل تہذیب ہے) تشکیل دیئے انہی کے ذریعے مختلف اصناف ادب میں فکری تبدیلیاں ظاہر ہوئیں بالخصوص اُردو افسانہ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور پریم چند سماجی حقیقت نگاری کے پہلے شاہ کار کے طور پر سامنے آئے بے باک سماجی حقیقت نگاری منٹو کے قلم سے ظاہر ہوئی جب کہ انقلابی حقیقت نگاری کے بنیاد گزار کرشن چندر ثابت ہوئے۔ تاہم سماجی حقیقت نگاری نے خود کو تنقیدِ حیات تک محدود رکھا جب کہ ترقی پسند افسانہ نے سماج کو بدلنے کا دعویٰ کیا (اس دعویٰ میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا یہ فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے) یہ سب بجا مگر بعض افسانہ نویس ایسے بھی ہوئے جنہوں نے کسی بھی نظریے کو خود پر مسلط کرنے سے گریز کیا اور ماحول (ادبی ماحول) سے بے نیاز ہو کر تخلیقی واردات/خود پر گزری کیفیات کو افسانوی آہنگ دے کر منظر عام پر لاتے رہے۔ بلاشبہ حنیف باوا کا شمار ایسے ہی افسانہ نگاروں میں بے دریغ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ تخلیقی تقاضوں سے معمور افسانے پیش کیے جن کے مجموعی برتاؤ کا غالب حصہ سماجی حقیقت نگاری کی متنوع کیفیات کا صوفیانہ و ہمدردانہ اظہار ہے، صوفیانہ سے مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ انہوں نے بعض سماجی الجھنوں اور ثقافتی لرزشوں سے صرفِ نظر کیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے سماج کی دُکھتی رگوں پر ماہرانہ انداز میں ہاتھ رکھا ہے اور ایک نباض کی حیثیت سے ان دُکھوں کی ماہر طبیب کی طرح تشخیص کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی توجیہہ ومؤثر تجاویز اَن کہی کی صورت میں بھی پیش کی ہیں۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ایک تخلیق کار، تخلیق کے حوالے سے خود مکتفی ہو جاتا ہے اور از خود مسائلِ حیات پر ہر پہلو سے غور وفکر کرتا ہے۔ باوا صاحب نے ایک باشعور اور دردمند افسانہ نگار کی حیثیت سے افراد، اشیاء، محسوسات کے باطن میں اُتر کر سماج کی عکس بندی کی ہے، یہ عکس بندی فوٹو گرافی سے زیادہ پینٹنگ کے مصداق ہے جس کے رنگ، تخمل، بُردباری، غیر جارحانہ انداز، نہایت آہستگی اور اطمینان سے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں، تبھی تو ان کے افسانوں میں ماحول پوری جزئیات کے ساتھ سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ جمالیاتی قدروں کی وحدت ہو یا انسانی رِشتوں کا تقدس یا پھر نیک وبد کی فلسفیانہ جستجو، کہانی میں بیان کی سطح متصوفانہ آہنگ اور

رُوحانی کم و کیف سے ترتیب پاتی ہے۔انہوں نے عہدِ رواں کی بے چہرگی، گمشدگی، شناخت و عدم شناخت، جبر و اختیار کی متنوع صورتوں کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔علاوہ ازیں عدم تحفظ، لاحاصلی کا دُکھ، تنہائی، اقدارِ حیات کا زوال، ناقدری زمانہ، عمرانی تضادات، طبقاتی اونچ نیچ، نارسائی کا غم، تشکیک، ہوس زر، سیاسی و معاشی اتھل پتھل، بے رحمی، حالات کی سنگینی، مسائل، مشکلات اور مصائب کی ہنگامی نوعیت، محبت، منافقت، مہر و وفا، رُومان، انسان دوستی، ماورائی عناصر، ادراکِ باطن، ما بعد الطبیعاتی و رُوحانی عوامل، بے چارگی، گھٹن استحصال، نفرت، جبر و تشدد، اخلاقیات، ذہنی اُلجھاؤ، فراریت، فلاکت، مکانوں اور مکینوں کی سرگوشیاں، بے زبانی، اضطراب، مزاحمت ایسے متنوّع موضوعات بھی ان کی کہانیوں کی پہچان ہیں۔ فکری سطح پر ہر کہانی روایتی دائروں سے نکلتی نظر آتی ہے۔کردار سادہ سلجھے ہوئے، زندہ ذہنی و حسی شعور کے حامل تجرید کو تجسیم کرنے کے فن سے آشنا ہیں جو سماجی اُلجھنوں پر پھٹ پڑنے کے بجائے سنجیدہ فکر کے ذریعے حیرت زا کیفیات پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی جمع صورتوں کی شناور ہیں۔فنی سطح پر باوا صاحب کی کہانیاں تکنیک اور اسلوب کے حوالے سے الگ پہچان رکھتی ہیں۔منظر نگاری، ماحول بندی، مکالمہ نگاری اور پلاٹ سازی کا انداز روایت پرستی کے بجائے روایتی شعور کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد جست بھرتا نظر آتا ہے۔جس سے متشرح ہوتا ہے کہ باوا صاحب کا فن ایک زندہ، نامیاتی قدر ہے جو مسلسل نشو و نما کے مراحل طے کرتی ہے۔ان کا اصل وصف یہ ہے کہ وہ افسانویت کے تقاضوں کو ہر لحہ ملحوظ خاطر رکھتے ہیں، واقعہ یا خلقی واقعہ کے سپاٹ پن سے بچنے کے لیے واقعیت کو غیر محسوس انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ واقعتاً سچائی کا گمان ہوتا ہے علامت و استعارہ کے استعمال میں زمینی رشتوں کی بو باس جہاں غیر مانوسیت سے بچاتی ہے وہاں حقائق کی سمت رہنمائی کے اِشارے بھی کرتی ہے۔بلاشبہ باوا صاحب بصیرت و بصارت کے علاوہ کشف و گیان کے ذریعے معلومات کو تخلیقی تجربہ بنانے کے وہ ماہر افسانہ نگار ہیں جنہوں نے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے تا حال متعدد (پنجابی، جو مختلف بورڈز اور یونیورسٹیز کے نصابات میں شامل ہیں) اردو افسانے تخلیق کیے ہیں جن میں سے بیشتر مؤقر رسائل و جرائد کی زینت بنتے اور قارئین و ناقدین سے داد و تحسین پاتے رہے ہیں (تفصیل کا یہ محل نہیں) باوا صاحب ایسے تخلیق کار ہیں جن کا قلم ہمہ دم رواں دواں رہتا ہے۔ان کی شادابیِ طبع کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ سے بیزار ہوتے ہیں تو اردو افسانے لکھنے بیٹھ جاتے ہیں اور جب اردو سے سیر ہو جاتے ہیں تو پنجابی کہانی لکھنا شروع کر دیتے ہیں اگر کہانیوں سے جی بھر جائے تو نظم و نقد میں اظہار کرتے رہتے ہیں۔آئے روز ان کی ادبی کتابوں پر تبصرے اور تجزیے، جائزے اور افسانے شائع ہوتے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ آخر وہ آرام کب کرتے ہیں؟ اس حیرانی کا جواب ان کا ایک افسانہ پڑھتے ہوئے ملا کہ ''میں دنیا کی طرح کیسے آنکھیں بند کر لوں میں تو دنیا سے مختلف ہوں'' واقعی باوا صاحب عام تو کیا خاص میں بھی مختلف ہیں وجہ یہ کہ عمرِ عزیز کی آٹھویں دہائی میں اس قدر ادبی سرگرمی انہیں ہمیشہ جوان بنائے رکھتی ہے اور ناممکنات کو سر کرنے کی جستجو ان کو نئے جوش و عزم سے سرشار کیے رکھتی ہے ان کا کہنا ہے کہ ''ناممکن کو ممکن میں تبدیل کرنے کے لیے ناممکن کی اَنا کو قتل کرنا پڑتا ہے'' ناممکن (مادی خواہشات سے برگشتہ ہونا) کی انا کا قتل کرنا کس قدر مشکل ہے۔مگر باوا صاحب اس شکل سے خود کو واگزار کروا چکے ہیں بہ ایں وجہ وہ پنجابی اور اردو افسانہ میں قابلِ قدر اضافہ کر رہے ہیں۔جس طرح ''دھی''، ''ٹہنی اتلا پھل'' پنجابی افسانوں میں شاہکار مانے جاتے ہیں اسی طرح ''جوگ'' ان کا ایسا شاہکار افسانہ ہے جس نے انہیں اردو افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کیا ہے ان کے فن اور فکر کی رزم گاہ کا مردِ میدان افسانہ ہے ''جوگ'' بے معنویت اور سرابِ حیات (جدیدیت کے تقاضے) کا زندہ استعارہ اور لاجواب فن پارہ ہے جس پر ثقہ ناقدین نے ایجاب و تائید کی مہر ثبت کی ہے اس پر اب بھی مباحث جاری ہیں۔اس کی اختراعی اور تشکیلی حیثیت الگ پہچان رکھتی ہے، یہ کہانی سماج کی گزری اور گزر رہی زندگی کا آئینہ ہے۔بہر حال ''جوگ'' کے علامتی اور استعاراتی ابعاد کو سر کرنے کے متعدد مرحلے ابھی باقی ہیں۔تفہیم و تعبیر متعدد زاویے، منضبط و راست قرات کے منتظر ہیں۔اردو دان طبقہ کے لیے یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ باوا صاحب اب تک کے افسانوں کو ''تنہائیوں کے درمیان'' میں یکجا کر رہے ہیں۔

۔ کارِ نیک ۔

سعودی عرب کی ایک سترہ سالہ لڑکی نے نام اخفا میں رکھتے ہوئے اپنے والد سے ترکہ میں ملنے والے پچاس ملین ریال (قریب پندرہ ارب روپے) کا ایک چوتھائی حصہ ریاض شہر کی جنرل کوٹ سے منظوری کے بعد حاجت مندوں کو عطیہ کر دی ہے۔لڑکی کا کہنا یہ بھی ہے کہ والد سے ملنے والے ترکہ کی ایک چوتھائی رقم مساجد کی دیکھ مال، ناحق جیل میں ڈالے گئے قیدیوں کی رہائی، مدرسہ اور سکول کی تعمیر کے ساتھ بیماروں اور ناداروں پر خرچ کی جائے گی اور وقت کے ساتھ مزید رقم بھی اس کارِ نیک میں شامل کی جائے گی۔

☆

''تنہائیوں کے درمیاں''

عامر عبداللہ
(جھنگ)

یقیناً شعر مذکور مرزا اسداللہ غالب نے اپنی ذات کے حوالے سے اپنے دور کے ناقدِ سخن کو متوجہ کرنے کی غرض سے کہا ہوگا مگر ہمارے خیال میں آج کے عصری ادب میں فقیر منش ادیب، شاعر، افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور مترجم حنیف باوا کی نسبت بھی درست ثابت ہوتا ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

حنیف باوا کثیر الجہات ادبی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں تخلیق ادب کا وظیفہ سرانجام دیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مختلف اصنافِ ادب کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ انہوں نے افسانہ، انشائیہ، شخصی خاکہ نگاری اور نظم نگاری کو اپنایا اور سب اصناف میں قابل قدر کام کیا اور انہیں ایک معتبر تخلیق کار کے طور قبولیت نصیب ہوئی۔ اس کا ثبوت پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں آپ کی تخلیقات کا شاملِ نصاب ہونا بھی ہے اور آپ کی شخصیت اور فن پر مقالہ جات کا لکھا جانا بھی ہے۔ مذکورہ تمام اصنافِ ادب میں بہترین کام کے باوجود میرے خیال میں ان کی پہچان کا اہم ترین حوالہ صنف افسانہ ہے۔

حنیف باوا کا پہلا افسانوی مجموعہ ''باہر کا آدمی'' تھا جس میں شامل افسانوں سمیت کل ۴۲ افسانے ان کے تازہ افسانوی مجموعے ''تنہائیوں کے درمیاں'' میں شامل ہیں یہ ان کے اب تک کہ افسانوی سفر کی داستان ہے۔ اس کتاب کا نام کتاب کے مندرجات پورے طور پر حنیف باوا کی ذات کی تفہیم کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ نام ایک خاص تسلسل کا حصّہ ہے۔ وہ تسلسل جو ''باہر کا آدمی'' یا ''دھوانکھیا ہوا آدمی'' یا ''دائروں کے باہر'' اور ''تنہائیوں کے درمیاں'' کو ایک خاص نقطے پر متصل اور مربوط کرتے ہوئے ایک ایسے تخلیق کار کی کہانی سناتا ہے جو اپنے سماج کا حصہ ہونے کے باوجود اس سے الگ اور منفرد ہے۔ یہ تخلیق کار دراصل بنی نوعِ انسان کا وہ Self ہے جسے انسان نے خود سے الگ کر دیا ہے اور اسے تنہائیوں کے درمیاں کرب انگیز حالت میں چھوڑ دیا ہے۔ باوجود اس بے رخی اور بے اعتنائی کے وہ بنی نوع انسان کو حقیقت آشنا کرنے کے لیے اپنے ازلی فرض کی ادائیگی سے کوتاہی نہیں برتتا بلکہ مختلف مواقع پر دیوتا کی طرح پرگٹ ہو کر لوگوں کو ان کی خامی اور کجی سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی اصل سے ہم رشتہ ہونے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان کے ازلی دکھوں کا علاج اس کے پاس موجود ہے اور وہ حل فطرت سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں مضمر ہے خواہ وہ فطرت کائنات ہو یا فطرت وجود۔ بقول سہاتی نوزا؛

''فطرت جوہر اور خدا ایک ہی چیز کے نام ہیں''

مندرجہ بالا قول کو ذہن میں رکھتے ہوئے ''باہر کا آدمی'' یا ''جوگ'' جیسے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی فطرت، جوہر اور خدا کی یکجائی تو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہی فرد کو فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی طرف مائل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کو حنیف باوا کی افسانہ نگاری میں گیروارنگ دکھائی دیا تھا اس کی وجہ یہی ہے کہ حنیف باوا گوتم کی طرح فطرت سے ہم رشتہ ہونے اور نروان حاصل کرنے کے بعد ایک ارضی مخلوق کی طرح زندہ رہنے کے حق میں ہیں۔ ایک سچے تخلیق کار کا رویہ ہوتا بھی یہی ہے کہ وہ حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کے بعد حقیقت میں ضم ہونے کی بجائے حقیقت کے عرفان سمیت واپس اپنے جہان میں لوٹنا چاہتا ہے۔ حنیف باوا کے افسانے انسان دوستی کی مثال پیش کرتے ہیں اور انسان کے ازلی دکھوں کی داستان کہتے ہیں۔ ان کی تمنا یہ ہے کہ انسان کو مساویانہ حقوق ملیں۔ زندگی گزارنے کے لیے بنیادی ضروریاتِ زندگی میّسر آئیں اور استحصال کا خاتمہ ہو۔ جبر کے دور میں انہوں نے انسان دوستی کا اظہار اور مقتدر طبقوں کے ظالمانہ رویوں کے خلاف احتجاج علامتی انداز میں کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کا احتجاج سطحی نہیں بلکہ واردات کی گہرائی لیے ہوئے ہے اور ان کے لہو میں گھلنے کے بعد صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادوار جب ادب نعرہ بازی کی سطح پر پہنچ گیا اور نظریہ تخلیق پر حاوی ہو گیا تو ایسے میں بھی حنیف باوا نے نظریے سے وابستگی کے باوجود ادب کی ادبیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ انہیں ہمیشہ مقصدیت پر تخلیق کی تخلیقیت مقدم رہی ہے اور ریاستی جبر، طبقاتی تقسیم، غربت، اقدار کی زبوں حالی، زمانے کی بے حسی تخلیقی وجود کی بقا اور فن کی ناقدری جیسے موضوعات پر لکھتے ہوئے وہ ایک سچّے، کھرے اور سماج کے خفتہ و ظاہر اعمال کی تخلیقی سطح پر پورے فنی رچاؤ کے ساتھ پیش کرنے کے اہل تخلیق کار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔

حنیف باوا کی عمر اب اسّی برس سے زیادہ ہے۔ یہاں تک پہنچ کر اکثر تخلیق کار تھکن کا شکار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ فعال، متحرک اور توانا دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے مجھے کامل یقین ہے کہ ان کا تخلیقی فن کا سفر تا دیر پوری قدرت کے ساتھ جاری رہے گا اور وہ تیقن کے ساتھ غالب کی آواز سے ہم آواز ہو کر معمولی تصرف کے ساتھ یہ مصرعہ گنگنا سکتے ہیں:

ہیں اور بھی دنیا میں قلم ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ باوا کا ہے اندازِ بیاں اور

دائروں سے باہر

پروفیسر پروین طارق (راولپنڈی)

اردو انشائیہ کے موجودہ رنگ وروپ میں بعض ہم عصر انشائیہ نگار پیش پیش ہیں۔ان میں حنیف باوا کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔آپ انشائیہ فہمی کے مزاج سے پوری طرح واقف ہیں۔آپ کے بیشتر انشائیے اوراق'' کی زینت بنے ہیں،جن سے قاری اُن کے انشائیوں کے مزاج اور اسلوب کی شگفتگی سے کافی حد تک آشنا ہے۔

آج اُن کے انشائیوں کا مجموعہ ''دائروں سے باہر'' ہمارے ہاتھ میں ہے۔اس میں کل بیس انشائیے شامل ہیں جن میں سے بیشتر انشائیے فنِ انشائیہ نگاری پر پورے اُترتے ہیں۔

انگریزی ادب انشائیوں سے مالا مال ہے۔وہاں انفرادی رویہ ہی انشائیوں کی رُوح ہے۔ Leigh Hunt اپنے معرکہ آرا انشائیہ دریچہ (Window) میں ایسی خوبصورت فکری لہریں پیش کرتا ہے کہ قاری ارضی پستیوں سے بلند ہو کر آسمان کی رفعتوں کو چھونے لگتا ہے۔اپنے انفرادی رویہ کے تحت وہ قطرے میں کائناتِ کبریٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اور دریچہ کو اپنے لیے ایک تصویر کے فریم سے مشابہت دے کر اس میں چلتی پھرتی تصویروں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ایک ایسا تصویری فریم جس میں وہ کبھی اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتا ہے،کبھی بادلوں کے بجروں کو آسمانوں پر تیرتے دیکھتا ہے،اگر ہم اردو ادب کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کا جائزہ لیں تو کم وبیش سبھی کے ہاں یہ خوبی موجود ہے۔اگر ہم حنیف باوا کے انشائیوں کا جائزہ لیں تو اُن کے ہاں بھی یہ خوبی بدرجہ اُتم موجود ہے۔مثال کے طور پر اُن کے ایک انشائیہ ''جیب تراش'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''اگلے وقتوں میں جب کوئی جیب کاٹتا تھا تو سونے چاندی کے سکوں کی چیخ وپکار شروع ہو جاتی اور جیب تراش بے نیل ومرام لوٹ جاتا تھا لیکن آج کے دور میں جیب تراشتے وقت کوئی شور وغوغا نہیں ہوتا۔کاغذ ہیں کہ چپ کی چادر اوڑھ کر خود کو خاموشی سے جیب تراش کے حوالے کر دیتے ہیں۔ویسے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کاغذ کے زمانے سے سونے چاندی کا زمانہ کہیں بہتر تھا،جس طرح سونے چاندی کے سکے اپنے کھرے کھوٹے کا اعلان برملا کر دیا کرتے تھے۔بعینہ اس وقت معاشرے کا انسان اپنے باطن سے اُٹھتی ہوئی کسی بھی کھری یا کھوٹی آواز کو نہیں دباتا تھا لیکن جب سے کاغذ کا زمانہ آیا ہے انسان اپنے اندر سے اُٹھی ہوئی کسی بھی آواز کو خاطر میں نہیں لاتا۔بس دن رات اپنی جیب کی پرورش میں لگا رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب کوئی جیب تراش اس کی جیب کو اس کے وجود سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود کو تحت الثریٰ میں اُترتا محسوس کرتا ہے۔انسان کی اسی کمزوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی سیانے نے کہا ہے کہ جیب کو انسانی لباس سے کاٹ پھینکا جائے تو بہتر ہوگا۔''

انشائیہ نگار اشیاء مظاہر فطرت اور افراد کو عارفانہ نظر Mystic Vision سے دیکھتا ہے۔یہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جو ہماری وجدانی حالتوں کی تسکین کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انشائیہ میں افروایمائیت اور امیجری اس طرح استعمال ہوتی ہے جس طرح جدید نظم میں،جس طرح ہم جدید نظم کو بار بار پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔بعینہ انشائیہ کی پرتیں بھی بار بار پڑھنے ہی سے کھلتی ہیں۔

حنیف باوا کا انشائیہ ''چھتری'' ان کے فکر کی گہرائی،سلیس اندازِ بیان اور انکشافِ ذات کے عمل سے آراستہ ہے جس سے ان کی فنی کرامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ماں اور چھتری ایک ہی جذبے کے دو نام ہیں جس طرح ماں پیار کا امرت اُنڈیلتے وقت کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتی۔بعینہ چھتری بھی انسان کو سکھ پہنچاتے وقت اس سے دام وصول کرنے کا تقاضہ نہیں کرتی اگرچہ میرے گھر میں وہ چھتری تو موجود نہیں جسے انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے بازار سے خرید کر لاتا ہے اور اس سے کام لینے کے بعد پابندِ سلاسل کر کے کھونٹی پر لٹکا دیتا ہے بلکہ میرے گھر میں وہ چھتری ہے جو دنیا کے کسی بھی بازار میں بکنے کے لیے نہیں آتی۔میں نے اس چھتری کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور یہ وہ چھتری ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں کسی گھنے پیڑ کی طرح میرے سر پر ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔

پروفیسر جمیل آذر اپنی کتاب ''انشائیہ اور انفرادی سوچ'' میں ایک اچھے انشائیہ نگار کی تعریف اس انداز میں کرتے ہیں:

''فن ہی زندگی ہے جو مصنف کی ذات کے حوالے سے دیکھی جاتی ہے۔اس کہاوت کا اطلاق انشائیہ نگار پر مکمل طور پر ہوتا ہے۔انشائیہ نگار اپنا دماغ،اپنا دل اور اپنا فنی تجزیہ مہارت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے اور اپنے مخصوص عارفانہ رویہ سے زندگی کے مخفی معانی کو نہایت موثر انداز میں منکشف کرتا ہے۔'' حنیف باوا کا انشائیہ ''پرِ توِ خیال'' اس رنگ کا ترجمان ہے۔

''درختوں کے جھنڈ سے پرے'' ایک تیز ندی بہتی ہے۔میں اس کی جانب بڑھتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ جب تک پانی کناروں کی محافظت میں رہتا ہے اس کے قدم آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں اور جہاں یہ پانی کناروں سے بغاوت پر اُتر آتا ہے۔ندی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔یہی وہ لمحہ ہے جب یہ پانی اپنی اصل سے بچھڑ کر خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔زندگی بھی ایک تیز روندی ہے۔جب تک میں اس کے تند وتیز بہاؤ کے تھپیڑے کھاتے ہوئے اس کی پناہ میں ہوتا ہوں،راحت محسوس کرتا ہوں لیکن جب میں اس کے برعکس کوئی قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تو زندگی کی تمام تر ترش کیفیات میری جانب اُمڈ آتی ہیں اور مجھے اپنے حصار میں لینے کی سعی کرتی ہیں۔''

افسانہ

باہر کا آدمی

حنیف باوا

وہ ایک عجیب سا آدمی تھا، اس کی باتیں اُکھڑی اور کھُردری سی تھیں، وہ چہرے مہرے سے پڑھا لکھا بھی دکھائی دے رہا تھا۔

ہمارے گاؤں کا قبرستان تقریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا۔ قبرستان کی طرف جانے والا راستہ اس راہ سے پھوٹتا تھا جو قادرے کے طویل و عریض باغ کی جانب جاتا تھا۔ اس باغ میں پھلوں کے پیڑوں کے علاوہ گوں ناگوں پھولوں کے پودے بھی موجود تھے جو ہمہ وقت اپنے اردگرد کے ماحول میں خوشبوئیں گھولتے رہتے تھے۔ قادرے کے باغ اور ہمارے گاؤں کے قبرستان میں ویسے تو ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ تھا لیکن قادرے کے باغ کی اُور سے آنے والی تیز خوشبوئیں جب ہمارے قوتِ شامہ سے اٹھکیلیاں کرتیں تو ہمیں یہ فاصلہ کم ہوتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔

اس روز رات کے سات ساڑھے سات بجے ہوں گے۔ سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے چاروں جانب مکمل سکوت تھا۔ گاؤں کی تمام گلیاں سوگوار سی دکھائی دے رہی تھیں۔ مکانوں کے اندر جو دیے روشن تھے وہ اونگھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس روز کریم بخش کی ناگہانی موت نے سارے گاؤں کو ایک عجیب قسم کے صدمے سے دوچار کر رکھا تھا۔ اس وقت اس کا جنازہ اپنے تمام لواحقین کے ہمراہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ گاؤں کے باہر اس قدر سناٹا تھا کہ جنازے کے ساتھ جانے والے لوگوں کے ہونٹوں سے کلمۂ شہادت کا وِرد ادا ہو رہا تھا۔ وہ بھی اس سناٹے کی گھمبیرتا میں شگاف ڈالنے میں ناکام دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا حالانکہ ہولے ہولے چل رہی تھی لیکن پھر بھی وہ کپڑوں کے اندر گھس کر جسموں کو یخ بستہ کر رہی تھی۔ اس خنک ہوا کو محسوس کر کے جنازے کے شرکاء نے آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائیں۔ دیکھا کہ آسمان بادلوں سے ڈھکا پڑا تھا۔ ان بادلوں کے تیور دیکھ کر ہر کسی کا یہی خیال تھا کہ بارش کے برسنے میں اب کوئی زیادہ دیر نہیں۔

جنازہ ہولے ہولے قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ ہم لوگوں کے چہروں پر اداسیوں نے سائے ڈالے ہوئے تھے۔ میں تمام لوگوں کے پیچھے مرنے والے کی موت کے بارے میں سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک میں نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ کوئی اجنبی تھا۔ اس نے غلیظ کرتے اور پاجامے کے اوپر ایک گندہ سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ اس پاؤں میں جو مرمت شدہ جوتا تھا وہ بھی گرد سے اَٹا پڑا تھا۔ اس کے اس حلیے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی انتہائی دکھی انسان ہو اور اپنی مسافت کو چھوڑ کر اس جنازے میں شریک ہونے کے لیے آ گیا ہو لیکن جب میں نے اس پچاس برس کے شخص کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کا بغور جائزہ لیا تو مجھے وہ اپنا پہلا احساس باطل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''بھائی اس مرنے والے کو کیا ہو گیا تھا؟'' اس نے اپنے اُلجھے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔۔۔'' میں نے اس اجنبی کو مختصر سا جواب دیا۔ کیونکہ اس افسردہ ماحول میں کھل کر بات کرنا مجھے معیوب سا لگا تھا۔

''جب اسے کچھ نہیں ہوا تو پھر کیسے مر گیا۔۔۔'' وہ اپنی تمام تر توجہ میری جانب مبذول کر کے کہنے لگا۔

''خودکشی کر لی تھی اس نے۔۔۔'' میں نے پھر چھوٹا سا جواب دے کر اسے ٹرخانا چاہا۔

''خودکشی! لیکن کیوں۔۔۔؟'' اس نے ایسے حیران ہو کر پوچھا جیسے یہ اس کے لیے انوکھی بات ہو۔

''مجھے کیا معلوم۔۔۔''

''حیرت ہے! آپ کو نہیں معلوم؟''

''اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔۔۔ بس مجھے نہیں معلوم۔۔۔'' میں نے ذرا ترش روئی سے جواب دیا۔ ترش جواب سن کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن چند لمحوں کے بعد یکا یک وہ پھر بول پڑا۔

''اس کی جیب سے کوئی تحریر نکلی ہے؟''

''نہیں۔۔۔'' میں نے پھر مختصر سا جواب دیا۔

جنازہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سردی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی لیے اب اس نے مزید کوئی بات کرنے کی بجائے کوٹ کی اندرونی جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے ہونٹوں میں دبا کر کوٹ کی جیبوں کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ شاید وہ ماچس ڈھونڈ رہا تھا۔ جب اس کے دونوں ہاتھ جیبوں سے خالی لوٹ آئے تو وہ اشاروں اشاروں میں مجھ سے ماچس مانگنے لگا۔ میں چونکہ سگریٹ نہیں پیتا تھا اس لیے میرے پاس ماچس کے ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے بھی ہاتھ ہلا کر ماچس کے نہ ہونے کا اشارہ دے دیا۔ اب اس نے سگریٹ کو واپس جیب میں ڈالنے کی بجائے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں پکڑا اور سگریٹ کو بغیر سلگائے ہی بڑے عجیب انداز سے پہلے کش لگاتا اور پھر منہ آسمان کی طرف اُٹھا کر ہونٹوں کو دائرے کی شکل دیتا اور پھر سانس کو ایسے باہر نکالتا جیسے وہ دھوئیں کے مرغولے بنا رہا ہو۔ سگریٹ پینے کے اس عمل کو وہ بار بار دُہراتا رہا اور ساتھ ساتھ وہ اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو اپنے الجھے ہوئے بالوں میں پھیرتا جاتا تھا۔ اس کی ان حرکات سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ذہن کے اندر کچھ سوچیں ہیں جو باہر آنے کے لیے بے چین ہیں۔ آخر اس کی ان سوچوں نے اظہار کا راستہ ڈھونڈ ہی نکالا اور وہ خودکلامی کے سے انداز میں باتیں کرنا لگا۔ اب کی بارہ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر سامنے کی

طرف گھورے جارہا تھا اور بولے جارہا تھا۔

''کس قدر قابلِ رحم تھا یہ شخص بھی۔ اس باغ کی جانب سے آنے والی ہواؤں نے اسے تروتازہ کرنے کی کبھی تو کوشش کی ہوگی۔ ہاں ضرور کی ہوگی، لیکن اس کا کیا علاج کہ اس نے خود کو اپنے اندر محصور کرلیا ہوگا اور خوشبوؤں نے اس تک پہنچنے کی بہت کوشش کی ہوگی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی ہوں گی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ ان خوشبوؤں کو اپنے اندر آنے کی اجازت دے دیتا''

کتنی عجیب باتیں کررہا تھا، ابھی میں اس پر غور ہی کررہا تھا کہ آسمان پر بڑے زور سے بادل گرجا۔ بادل کی اس خوفناک گرج کو سن کر اس نے ان سوچوں کی ڈور کو منقطع کیا اور آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

''کتنا اچھا ہوا گر موسلا دھار بارش شروع ہوجائے۔''

''لیکن کیوں!'' میں نے تقریباً چیخ کر کہا اس لیے کہ اس روز ایک تو سردی بہت زیادہ تھی۔ دوسری اہم بات یہ کہ ہم میّت کے ہمراہ تھے۔ ایسے وقت میں بارش کی دعا مانگنا کہاں کی دانش مندی تھی۔ لیکن اس کے لیے تو یہ باتیں جیسے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ اسی لیے تو وہ میری خفگی کی پرواہ کیے بغیر پھر گویا ہوا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ بارش برسنے سے باغ کی طرف سے آنے والی خوشبوئیں دُھل کر تروتازہ ہوجائیں گی۔''

کتنی طرفہ سرشت کا مالک تھا وہ اجنبی بھی۔ بھلا کون ایسے اُداس ماحول میں اس طرح کی غیر متعلقہ باتیں کرتا ہے۔ جیسے وہ اجنبی کررہا تھا۔ پہلے تو میرا دل چاہا کہ میں اسے کچھ جھاڑ پلاؤں لیکن جب میں نے اس کی طرف ذرا غور سے دیکھا تو میرا سارا غصہ جاتا رہا۔ اس وقت وہ مجھے ایسے کی طرح لگا جو بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ ہو۔

اب بادلوں نے چھوٹی چھوٹی بوندوں کی شکل میں برسنا شروع کر دیا۔ ہم نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مینہ میں کچھ تیزی آجائے اور ہم قبرستان تک پہنچنے سے پہلے ہی بارش میں نہا جائیں۔ ہم نے اپنے قدم تیز کردیے لیکن جب ہم قبرستان کے قریب ہی سائیں اللہ دتہ کی جھونپڑی کے نزدیک پہنچے تو وہ چھوٹی چھوٹی بوندیں موسلا دھار بارش میں بدل گئیں۔ چنانچہ ہم نے میت کو سائیں کی جھونپڑی میں رکھا اور خود باہر برگد کے گھنے پیڑ کے نیچے سمٹ کر بیٹھ گئے۔ وہ اجنبی میرے پاس ہی براجمان تھا۔ ابھی بارش کا زور کم نہیں ہوا تھا کہ اجنبی نے اپنی نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور سائیں کے اردگرد سرسبز پیڑوں کی سمت غور سے دیکھنے لگا اور جب وہ سب پیڑوں کا بغور جائزہ لے چکا تو کہنے لگا:

''بھائی! آج رات کے بعد جب نئے سورج کا طلوع ہوگا تو بارش میں نہائے ہوئے یہ پیڑ کتنے دھلے دھلے اور نکھرے نکھرے دکھائی دیں گے اور دن کے اجالے میں ان پیڑوں کی خوشبو ہمارے دلوں کو کتنی اچھی لگے گی۔''

کچھ دیر کے لیے تو اس بوڑھے برگد نے اس طوفانِ بادوباراں کو اپنی چھاتی پر روکے رکھا لیکن آخر کب تک، جب اس کا سینہ بارش کے تھپیڑوں سے چھلنی ہوگیا تو ہم مینہ کے رک جانے کی دعائیں مانگنے لگے لیکن اس اجنبی کے ہاتھ دعا کے لیے نہیں اُٹھے وہ تو ایسے پرسکون بیٹھا تھا جیسے گوتم بدھ کا مجسمہ ہو مگر پھر بارش اچانک تھم گئی۔ وہاں پہنچ کر ہم نے میّت کو جنازہ گاہ کی محراب کے سامنے رکھا۔ اب جو لوگ وضو کر کے نہیں آئے تھے وہ وضو کرنے میں مصروف ہوگئے ہیں چونکہ میں گھر سے باوضو ہو کر آیا تھا اس لیے ایک طرف ہو کر کھڑا ہوگیا۔ وہ اجنبی بھی جلدی جلدی وضو سے فارغ ہو کر میرے پاس آگیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے تو خاموش رہا لیکن اچانک وہ اس خاموشی کو توڑ کر کہنے لگا:

''دیکھا بھائی! بارش نے ان خوشبوؤں کو کس قدر پاک کردیا ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے پہلے سانس کو زور سے اندر کی طرف کھینچا پھر آہستہ سے باہر نکالا۔

''آپ ذرا میری طرح انہیں سونگھ کر تو دیکھئے۔ دیکھئے کیسے ہمارے اندر کو معطر کیے دے رہی ہیں یہ خوشبوئیں۔۔۔''

اب کی بار بھی میں نے اس کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کی یہ باتیں میرے ذہن میں کافی دیر تک گردش کرتی رہیں۔

قبر نمازِ جنازہ ادا کرنے سے پہلے تیار ہوچکی تھی۔ جنازے سے فارغ ہو کر میت کو قبر کے پاس لایا گیا۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اسے قبر میں اتارا۔ پھر اس کی لحد کو پختہ اینٹوں سے بند کرنے کے بعد گورکنوں نے اس پر مٹی ڈالنا شروع کردی۔ مٹی ڈالنے کے اس عمل میں ہم لوگ بھی شریک ہوگئے۔ اس اجنبی نے بھی رسماً اس قبر پر مٹی کی دو تین مٹھیاں ڈالیں۔ کچھ دیر کے بعد قبر تیار ہوگئی۔ قبر پر اگربتیاں لگائی گئیں۔ جن کی خوشبو نے سارے ماحول کو بوجھل سا کردیا تھا۔ لیکن قبر پر نچھاور کیے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی مہک نے اس سوگوار ماحول کو قدرے ہلکا کرنے کی سعی کی جن میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو پارہی تھی۔ قبر پر پھول نچھاور کرنے کے بعد دعا مانگی گئی۔ اس کے بعد جب ہم لوگ مرنے والے کو قبر میں تنہا چھوڑ کر واپس آنے لگے تو اس اجنبی کے چہرے پر پہلی بار کچھ افسردگی کے آثار دکھائی دیے۔ جب ہم اس قبرستان کو کافی پیچھے چھوڑ آئے تو وہ اجنبی ایک لمبی آہ بھر کر کہنے لگا:

''آہ کتنا بھولا تھا یہ شخص بھی جو اپنی ہی سوچوں کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔''

وہ اتنی بات کہہ کر قادرے کے باغ کی طرف مڑ گیا۔ اب ہم اس اجنبی کے بغیر ہی واپس آرہے تھے۔ اس اجنبی کے بغیر جس کی باتیں کتنی کڑوی تھیں اور کتنی میٹھی۔ میں اس کی ان باتوں کے بارے میں سوچتا جارہا تھا کہ اچانک میرے کان میں سرگوشی ہوئی:

''بھائی! آپس کی بات ہے، بھلا یہ تو بتا کہ اس کی موت کو کس کھاتے میں تسلیم کریں گے؟'' لیکن اس سرگوشی کرنے والے کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ لیکن چلتے چلتے میں نے سوچا اگر وہ اجنبی اس وقت ہمارے ساتھ ہوتا تو وہ ضرور کہتا کہ یہ خوشبو کی موت نہیں تھی!

انشائیہ

پرتوِ خیال

حنیف باوا

ستر برسوں پر پھیلی میری زندگی کے اس سفر میں بہت سے پت جھڑ کے موسم بھی آئے لیکن میں نے اُنہیں اس خوشگوار احساس کے ساتھ گزار دیا کہ وہ سامنے چند لمحوں کی دوری پر بہار ہی تو ہے جو مجھ سے معانقہ کرنے کے لیے بے تاب کھڑی ہے۔ بلا میں کیوں ان کھردرے لمحوں کی قید میں رہوں! یہ ناموافق موسم میرے دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن میں پیار کا شیدائی کیسے ان کے ہاتھ آ سکتا ہوں! میں لپک کر فوراً بہار کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہوں۔ آج بھی جب میں پت جھڑ سے دامن بچا کر بہار کی اقلیم میں آ گیا ہوں تو پھر میں کیوں گھر کی چار دیواری میں محبوس ہو کر رہوں، کیوں نہ باہر نکل کر بہار سے حظ اُٹھاؤں!

ہمارے گھر سے بہت ہی کم دُوری پر درختوں کا ایک جُھنڈ ہے۔ اس میں زیادہ تر درخت سرسبز پتوں سے مالا مال ہیں اور جو باقی ہیں اُن میں بڑی تیزی سے کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ جو پیڑ چھتنار بنتے جا رہے ہیں اُن میں صبح صادق سے ہی چڑیوں کی چہکار شروع ہو جاتی ہے اور اس چہکار سے جو سُر نکلتے ہیں، وہ باہم آمیز ہو کر ایسے گیت کا روپ دھار لیتے ہیں جو بظاہر الفاظ سے مبّرا ہوتا ہے لیکن کانوں میں گیت سے بھی بڑھ کر مدھ بھرا رس گھولتا ہے۔ تاہم جو پیڑ ابھی کونپلوں کو زندگی سے متعارف کروا رہے ہیں، اُن کی ٹہنیوں سے کوئی سر تو برآمد نہیں ہوتا لیکن اُن کی ننھی منی سی کونپلیں ایک انوکھی بہار دکھاتی ہیں۔ اور اُن میں جو پیڑ زندگی کی لمبی مسافتیں طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں، وہ بظاہر بے ڈول، بے ڈھنگے سے لگتے ہیں لیکن اُن کے اندر کی جاذبیت اپنی ایک الگ خوبصورتی کو جنم دیتی ہے۔ اگر میں ان سرسبز و شاداب پیڑوں کو اِن بوڑھے درختوں سے الگ کر کے دیکھوں تو مجھے دُنیا میں ایک خاص قسم کے ادھورے پن کا احساس ہونے لگے گا۔

میں ہر روز جب صبح کی سیر کو نکلتا ہوں تو پہلے میں انہیں پیڑوں کی خوبصورتی سے لطف کشید کرتا ہوں، پھر آگے بڑھتا ہوں۔ آج کیا ہوا کہ ایک سانپ پانی کی لہر کی طرح بل کھاتے ہوئے میرے پاس سے گزرنے لگا۔ فوراً میرے پاؤں آگے بڑھنے کے بجائے وہیں رُک گئے۔ پہلے تو میں بہت خوفزدہ ہوا لیکن جب میں نے اُس کی کینچلی کو کسی مٹیار کی پلکاری کے روپ میں دیکھا تو میرے اندر کا خوف فوراً راحت میں بدل گیا اور مجھے وہ سانپ بہت سندر لگنے لگا۔ جب وہ سانپ زِگ زَیگ بنایت ہوئے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گیا تو نہ جانے کیوں میرے پاؤں آگے بڑھنے کے بجائے وہیں رُکے رہنے کی ضد کرنے لگے اور میں ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر، سہانے موسم کی ٹھنڈک اپنے اندر بھر سے اتارنے لگا۔ جب میں نے آنکھوں کو تر و تازہ کرنے کے لیے پیڑوں کی اُور جھانکا تو دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے پیڑ کی گود میں ایک ننھا سا آشیانہ ہے جس کی دہلیز پر بیٹھی ایک فاختہ اپنے لختِ جگر کی چونچ میں دانہ ڈال رہی ہے اور بچہ اپنے ننھے منے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے خوشی کا اظہار کر رہا ہے جیسے اُسے کوئی میٹھا پھل مل گیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں، اُسے ایسے ہی خوش ہونا چاہیے تھا جیسے وہ اس وقت ہو رہا ہے، کیونکہ ماں کا دیا ہوا یہی ایک دانہ اُس بچے کی پہلی پرواز میں مہمیز کا کام دے گا۔

درختوں کے جھنڈ سے پرے، ایک تیز ندی بہتی ہے۔ میں اُس کی جانب بڑھتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ جب تک اُس کا پانی کناروں کی محافظت میں رہتا ہے، اُس کے قدم آگے آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں اور جہاں یہ پانی کناروں سے بغاوت پر اُتر آتا ہے۔ ندی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب یہ پانی اصل سے بچھڑ کر خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ زندگی بھی ایک تیز روندی ہے، جب تک میں اس کے تند و تیز بہاؤ کے تھپیڑے کھاتے ہوئے اس کی پناہ میں ہوتا ہوں، راحت محسوس کرتا ہوں لیکن جب کبھی میں اس کے برعکس کوئی قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں زندگی کی تمام تر ترش کیفیات میری جانب اُمنڈ آتی ہیں اور مجھے اپنے حصار میں لینے کی سعی کرتی ہیں۔

ہمارے گھر کے سامنے والے مکان میں ایک منچلے نے چند کبوتر پال رکھے ہیں۔ سیر سے واپس آ کر میں گھر کے صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ جب اس منچلے کے کبوتروں کی غٹرغوں میرے کانوں میں رس گھولتی ہے تو میری نظریں اُس آواز کا پیچھا کرتے ہوئے سامنے کی دیوار کی طرف اٹھتی ہیں۔ دیکھتا ہوں کہ ایک کبوتر کبوتری کو رجھانے میں مصروف ہے وہ اس کے دامِ محبت میں پھنستی ہے یا نہیں یہاں اس کا تذکرہ کرنا پیار سے بھرے اس منظر کے بخیے اُدھیڑنے کے مترادف ہوگا۔ میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ کبوتر کی وہ غٹرغوں میرے بطون میں زندگی سے جڑے رہنے کے احساس کو کبھی مرنے نہیں دیتی۔ غٹرغوں کی یہ مدھر آواز کبھی میرے اندر سے بھی اٹھا کرتی تھی۔ میں بھی اس کی مدھرتا پر مچل جایا کرتا تھا، پھڑ پھڑایا کرتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آج بھی میرے اندر اِن تھکے ماندے اعضا نے اس غٹرغوں کا گلا دبا رکھا ہے۔ یہ آواز آج بھی میرے اندر سے اٹھی ہے۔ آج بھی یہ آواز مجھے مچلنے پر اکساتی ہے، پھڑ پھڑانے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن آج میں نے اس سندر آواز کو صرف رنگوں کی اس کہکشاں کی آب و تاب کو قائم رکھنے کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو زندگی نے مجھے ودیعت کر رکھی ہے۔ میرے اس جذبے کی گونج فطرت کے

بندھے ٹکے اصولوں کی پابند نہیں۔ یہ تو میرے حکم ہی پر پہلے اندر کے کواڑوں پر دستک دیتی ہے، پھر باہر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ کبوتر کی طرح میں سدا فطرت کے قوانین کی قید میں نہیں رہنا چاہتا۔ میں اس سے آزاد ہو کر اپنے طریقوں پر زندگی کی راہوں پر چلنے کا عادی ہوں۔ اگر انجانے میں میرا قدم راستے کی کسی کٹھنائی سے اُلجھ کر رہ جائے تو میں فطرت کو آواز دینے کی بجائے خود اس اُلجھن سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر میں کبھی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو پاتا تو کچھ لمحوں کے لیے ناامیدی کے گھیراؤ میں آ جاتا ہوں، لیکن میرے اندر کی جو روشن لکیر ہے وہ اس گھیرے کو آنِ واحد میں توڑ دیتی ہے اور میں پھر سے راستے کی سابقہ مسافرت میں آ جاتا ہوں، لیکن اب میں سفر کے دوران اس باہمت چیونٹی کے عظیم کردار کو آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا جو اپنے وجود سے بھی بھاری بوجھ اٹھائے گرتے پڑتے، لڑکھڑاتے، ٹھوکریں کھاتے، اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتی ہے اور اتنی سختیاں جھیلتے ہوئے بھی اپنے اثاثے سے کبھی دست بردار نہیں ہوتی جو اس کے دانتوں کی کڑی گرفت میں ہوتا ہے۔ میری بھی مقدور بھر یہی کوشش ہوتی ہے کہ میں زندگی کی دی ہوئی خوشیوں کو ہاتھ سے کبھی نہ جانے دوں لیکن کیا کروں انسان ہوں، بھٹک بھی تو سکتا ہوں!

☆

پروفیسر مامون ایمن کی تین کتب

مدحتِ خیر البشر: دورِ حاضر کے جن ادیبوں اور شاعروں نے معتبر دانشوروں اور نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے ان میں ایمنؔ صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے۔ آپ کلاسیکی ادب روایات کے امین اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ آپ نے اپنی متانتِ فکر اور سنجیدہ سنجی کے باعث دنیائے شعر و ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا ہے۔ حضرت مامون ایمنؔ نے جہاں صنفِ رباعی، صنفِ غزل اور دیگر اصنافِ سخن و فنِ تنقید نگاری میں کمال وفن اور دسترس کا لوہا منوایا ہے، وہیں میدانِ نعت گوئی میں بھی اپنے دلی جذبات اور محسوسات کو نہایت ہنرمندی، سنجیدگی اور پاکیزگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ (علامہ آفتاب احمد خان حسن پوری)

○●○

نیویارک میں اُردو غزل (شاعرات کا تذکرہ۔۲): جناب مامون ایمنؔ نے اپنے اس قابلِ قدر تحقیقی کام کے ذریعے نیویارک کی خواتین شاعرات کے نام اور کام کو محفوظ کر دیا ہے اور اسے کتابی شکل دے کر ایک اہم دستاویز میں بدل دیا ہے۔ اردو شاعری کی نئی بستیوں کا محقق مستقبل میں اس دستاویز سے ضرور فیض یاب ہوگا۔ اردو دان طبقہ اس کا اور اس تحقیقی کاوش کے لیے ہمیشہ جناب مامون ایمنؔ کا ممنونِ احسان رہے گا۔ (پروفیسر خالدہ ظہور)

○●○

عیار: پروفیسر مامون ایمنؔ کا تازہ شعری مجموعہ ''عیار'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ نظم، خود کلامی اور غزل۔ اس مجموعے میں شامل غیر مقفّٰی نظموں میں اعتمادِ ذات کا عنصر اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اعتمادِ ذات سے تخلیق کی ہوئی تخصیبات میں خواہ وہ سنگی و خشتی ہوں یا ذہن و ادبی اہرامِ مصر جیسی حدّتِ آفتاب سے بے نیاز اور گردِ صحرا سے بے خوف، دیرپا مضبوطی موجود ہوتی ہے جو انہیں مٹنے نہیں دیتی۔ موضوعات کے اعتبار سے یہ نظمیں غیر نمایاں استدلال کے ذریعے اس روایت کے استمرار کی کوشش ہے جو اردو شاعری کو وراثت میں ملتی ہے۔ اس کاوش کا سب سے خوبصورت، لطیف اور نازک پہلو یہی ہے کہ شاعر نے شعری لبادے میں ایک دقیق، علمی مقالے کو ''آفتاب آمد، دلیل آمد'' کے طور پر مباحث میں الجھے بغیر، ایک نمونے کی صورت میں، جیتی جاگتی دلیل بنا کر، شعری سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ (علامہ ذوالفقار آغا گل)

○●○

دستیابی: کلاسیک پبلیشرز، دی مال، لاہور۔

''انتیس مئی کوسلام''

لیکھک: دیوندرستیارتھی

گورمکھی سے ترجمہ: حنیف باوا

''بسکٹ وانگ بھُر بھُر جاندی پاژل مسکان''

اپنی شاعری میں اپنے ہرجنم دن پر گنگناتا ہوں۔

۲۹رمئی کومیرا سلام۔ یہ میرا جنم دن ہے۔

شہد میں سونے کا سُر مچوڈبوکر میری زبان پر''اوم'' لکھا گیا تھا۔اس خوشی میں کہ بڑے بھائی کے یوم پیدائش کے سات سال کے بعد میرا جنم ہوا تھا۔ مجھ سے تین برس بعد میرا چھوٹا بھائی ہمارے خاندان میں آ شامل ہوا تھا۔لیکن ہمارے گلی محلے کی عورتیں میری کو''دیوکی ماں'' کہہ کرہی پکارا کرتی تھیں۔

۲۹رمئی ۱۹۶۹ء

آج میں نے اپنی عمر کے ساٹھویں سال میں قدم رکھّا ہے۔

دوستو یہ بجائے خود کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ میں اُنسٹھ سالوں سے کشٹ کاٹ رہا ہوں۔

سُورجا مُورجا دھپ کڈھا
اَج ترِا منگنا بھلکے ویاہ
آ ؤن کے جنیتی کھان کے سواہ

دہلی میں بائیس سال بیت گئے یہیں پر میری داڑھی سفید ہوئی۔ سفید داڑھی آ ٹا خراب۔ جس شخص نے بیس سال لوگ گیتوں کی کھوج میں گزارے ہوں۔اس کی بھی کوئی مجبوری ہوسکتی ہے۔وہ بھی اوب سکتا ہے۔ایک عجب طرح کی بے چینی کا شکار۔اسی بے چینی کی ضِد تھی جس کے لیے میں نے دہلی میں بائیس سال بِتا دیے۔

او ہندوستان
تیرے ہل نیں لہُولہان
او ہندوستان
تیرا ڈِھڈّ قبر صدیاں دی
او ہندوستان
صدیاں دی بڈھی ٹھیری
بے شرم وِنجھلی وج وج
تیرے بلھیاں تے موئی

او ہندوستان

پیرِ تسمہ پا کی طرح ہمارا ماضی ہم پر سوار ہے۔ اُس سے پیچھا چھڑانے کے لیِے میں کشم کش اوراسی کشمکش کے ساتھ میرا گہرا تعلق رہا اور رہے گا۔

عمر رسیدہ ادیبوں سے میل ملاپ رکھنے کی بجائے میں نے نئے لکھنے والوں کے ساتھ رہنے کی عادت کومدت سے اپنایا ہوا ہے۔

گنتی کے لیے مشین آ چکی ہے جسے کمپیوٹر کہتے ہیں۔

مجھے پورا یقین ہے کہ ادیب مشین نہیں ہوتا۔لیکن ہمارے ادب کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ادیب گنتی گن گن کر وہی کچھ بتاتے ہیں جو کچھ ہم ہیں۔ جو کچھ ہمیں مل چکا ہے یا ہماری موجودگی میں ہے۔ ہماری نظروں کو جو کچھ اور جس طرح دیکھنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ ہمارے لیکھک بالکل اُسی طرح لکھ رہے ہیں۔ جو کچھ اور جس طرح سُننے، سونگھنے، لمس حاصل کرنے اور محسوس کرنے کی عادت ہمیں پڑ چکی ہے۔ بار بار اُسی کو دہرایا جا رہا ہے۔اسی لئی ہر لکھاری اپنی پہلی تحریر کو بار بار چھاپ رہا، نئے ناموں کے ساتھ۔ وہی کردار، وہی تخلیق کار، وہی کہانی ہے۔ وہی شاعری، گلی سڑی، جیسے ہم کوئی نئی راہ تلاش کرنے کی شکتی اور دیت کو کھو چکے ہوں۔ اکثر اوقات لگتا ہے کہ ہم گڑے مُردے اکھاڑ رہے ہیں۔

جے تکنے تیں گھاہ پتّیاں دی ہنجھو گُڑیے
تر ناپَیسی ساڈے نال

ہمارا دھیان اینٹیک چیزوں کو خراجِ تحسین دینے اور انہیں بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے خریدنے کی طرف زیادہ مائل رہتا ہے۔ یونیورسٹی کلاسیکی ادب کی پڑھائی اور کھوج میں ہی اپنی تمام توانائیاں صرف کر رہی ہے۔ نئے ادب کی جانب اس لیے دھیان نہیں جاتا کہ وہ آج کا ہے۔اور مجھے یہ شکایت ہے کہ نیا ادب بھی تو نیا نہیں رہا۔کافکا کو بھی یہی شکایت تھی کہ ہمارے سکول اور کالج ہماری نئی راہوں کے بڑے دشمن ہیں اور میں پرانے ذائقوں کی تجدید کو دُور سے سلام کرتا ہوں۔

دہلی میں مَیں نے نیم سرکاری اور سرکاری ملازمتیں کرتے ہوئے دس سال گزارے اور گذشتہ بارہ برسوں سے میں راستوں کی دُھول بنا ہوا ہوں۔

پچھلے بارہ برسوں کے دوران اپنی بڑی بیٹی کوتا وسومتی کو ایم۔اے ہندی کرنے کے بعد بابل کے گھر سے ڈولی میں بیٹھ کر پرائے گھر جاتے ہوئے دیکھا اور پھر یہ المیہ بھی اسی عرصے میں وقوع پذیر ہوا جب کوتا اپنی اکلوتی بیٹی کو چھوڑ کر خدا سے ملنے چلی گئی۔

کوتا کی موت کے بعد مجھے بدیس میں رہنا مزید پیارا لگنے لگا تھا۔ اس کی وفات سے پہلے ہی غیر ملک میں قیام سے دوستی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے یاد ہے، میں ایک رات کے لیے لاہور گیا۔ایک مشاعرے میں اپنا کلام

سنانے کے لیے لیکن میں چار ماہ لاہور اور کراچی میں گزارنے کے بعد واپس گیا۔ اس عرصے میں مَیں نے اپنے گھر والوں کو کوئی خط نہ لکھا۔ آخر میری پتنی کو خط تحریر کرنا پڑا۔ جواہر لعل نہرو کے نام۔ جب وہ خط پھرتے پھراتے کراچی میں انڈین ہائی کمشنر پہنچا۔ ہائی کمشنر کی پتنی نے کہا:

''ستیارتھی جی۔ میں عورت ذات کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ اب آپ گھر واپس آ کر اپنے بچوں سے ملیں''

میری گھر والی مجھے پھر سے گھر کی دہلیز پر دیکھ کر خندہ پیشانی سے ملی۔ تب تک وہ بھول چکی تھی کہ اُس نے غصے کے عالم میں طعنے دیا تھا۔ ''آپ زندہ مُردوں کے مماثل ہیں''

جولکھاری ایسی تخلیقات منظرِ عام پر نہ لائے جس سے اس کی بیوی کو چوکھی رائلٹی مل سکے اُس کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیے۔

سرکاری نوکری میں مجھے بارہ سو ماسک مل رہے تھے۔ معمولی سی بات پر غصّہ کھا کر میں اُس کو چھوڑ آیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ اب میرا کیا بنے گا۔

نوکری کی آمدنی سے ایک گھر تو ضرور تعمیر کیا لیکن اُس کے دو کمرے کرائے پر دینے پڑ گئے تھے تا کہ باورچی خانے کا چولہا جل سکے۔ جیسے جیسے مہنگائی بڑھتی گئی گھر کا چلانا مشکل ہوتا گیا۔ پبلی کیشن ڈویژن میں مَیں ''آجکل'' (ہندی) کا ایڈیٹر تھا۔ بعد ازاں پروڈیوسر بنا پھر میوزک کی نوکری آفر ہوئی (آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے) لیکن غصے میں مَیں نے اسے بھی قبول نہ کیا۔

خیال تھا کہ ایک لیکھک کو دو کشتیوں میں پاؤں نہیں رکھنے چاہئیں۔

یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے ملک میں بتیرا ادب پڑھنے والوں کی بہت کمی ہے۔

اب نانی یاد آ رہی ہے۔ جس طرح کی چیز بک سکتی ہے وہ میں لکھنا نہیں چاہتا۔ جس قسم کا لکھتا ہوں اس کے قاری انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ہیں۔ ایک کریلا دو جا نیم چڑھا۔ کچھ قلمکار میری تحریر کے بارے میں لطیفے گھڑنے یا شائع کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ ''گھوڑا بادشاہ'' کو زیادہ قاری نہیں مل سکیں گے یہ مجھے معلوم تھا لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اُس کا جنازہ اُس کی موت سے پہلے ہی اٹھا لیا جائے گا لطیفوں کے ذریعے۔

میں بھی بہت ڈھیٹ ہوں۔ اب بھی وہی کچھ لکھنے کا عزم کئے ہوئے ہوں جو میں اپنے سچے سُچے قلم کی وساطت سے دنیا کو دے سکتا ہوں۔

''ستلج تمہاری قسم'' لکھنا شروع کیا تھا خالص سوامی زندگی کی حدود میں۔ اگر شاعری رخصت نہ ہو گئی ہوتی تو ناول ادھورا نہ رہتا۔

''گھوڑا بادشاہ'' کے بعد ''گپھا''، ''شہرچ ڈبدا سمندر'' اور ''ہم صنم'' تین ناول پورے کر چکا ہوں۔ ''گپھا'' کے لیے اُتر پردیش کی سیاحت کی۔

نو ماہ ''ہم صنم'' کو تکمیل تک پہنچانے میں صرف ہوئے۔ اُسی سیاحت سے واپسی کے بعد حال ہی میں دہلی آیا ہوں۔ پہلے میں دہلی چھوڑ کر اجمیر گیا۔ اس شہر کو چالیس برس بعد دیکھا۔ اجمیر سے اُودے پور پہنچا جسے میں نے تیس برس بعد دیکھا تھا۔ اُودے پور سے احمد آباد جس کی جھلک پچیس سال گزرنے کے بعد دیکھی اور پھر چوتھا شہر بمبئی تھا جس کے درشن پورے بارہ سال بعد ہوئے۔

بمبئی پہنچنے تک پانچ سال کا عرصہ لگ گیا تھا اور بمبئی رُکنے کے ڈیڑھ ماہ بعد گھر والوں کو خط لکھا کہ خاکسار بمبئی میں براجمان ہے۔

اب گھر والی نے زور دینا شروع کر دیا کہ جلد گھر پہنچیں۔ پارُل اور الکا کے خطوط بھی آئے۔ میری بیٹیوں کو کچھ اُمید ہوئی کہ شاید باپُو کے ہاتھ ڈھیر ساری دولت آ سکے۔

آج سے اکتیس برس پہلے بمبئی میں مسلسل تین ماہ گزارنے کی یاد میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتی۔ اس کے بعد میں نے جب بھی بمبئی کی سیاحت کی ایک ماہ سے زائد وہاں رہنے کا موقع نہیں ملا۔ میں جب جب وہاں گیا ہفتہ دس دن گزار کر واپس آ گیا۔

میرے متعدد دوست بمبئی میں فلموں سے منسلک ہو گئے ہیں جن میں سے بمل رائے اور گورودت وفات پا چکے ہیں۔

میری کبھی یہ خواہش نہیں ہو گی کہ میں فلموں میں کام کروں البتہ یہ چاہت ضرور رہی کہ ''رتھ کے پہیے''، ''کٹھ پتلی''، ''برہم پتر''، ''دودھ''، ''گاچھ''، اور ''کتھا کہوا روشنی'' میں سے میرے کسی نہ کسی ہندی ناول پر فلم بنے۔

ایک بار بمبئی فلمی دنیا مجھ پر مہربان ہوتی دکھائی دی۔ بات ایک لاکھ ایگری منٹ سے شروع ہوئی۔ میں پہلے بہت خوش ہوا کہ جس شخص کو ابھی تک ساہتیہ اکادمی کی جانب سے پانچ ہزار کا انعام بھی نہیں ملا اُسے آنِ واحد میں ایک لاکھ روپے مل جائیں تو کیا بُرا ہے۔

ملیالم کومی شنکر کروپ کو اور بنگلا کے ادیب تارا شنکر بیز جی کو گیان پیٹھ کی جانب سے ایک ایک لاکھ بطور انعام مل چکے تھے۔ میں نے سوچا اگر مجھے فلمی دنیا کی جانب سے ایک لاکھ روپے مل جائیں تو میں سمجھوں گا کہ مجھے فلموں نے نہیں گیان پیٹھ نے یہ رقم دی ہے۔ میں آج تک فلمی دنیا کو آخری قبرستان تسلیم کرتا آیا ہوں۔

اگر ایک لاکھ قلمکاری سے ہی میسر آنا ہوتا تو میں شاید اُسے زہر مار کر بھی لیتا۔ لیکن اس میں یہ شرط عائد تھی کہ مجھے پردے اور سلولائیڈ کا اداکار بن کر بھی آنا پڑے گا۔ میرے انکار پر میرے ہی ایک مہربان پروڈیوسر نے مجھے سمجھایا کہ اداکار بن کر پردے پر آنے سے میری شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ میں نے پوچھا ''کیا سچ مچ میری اصلی داڑھی کی اتنی ضرورت ہے؟ آپ لوگ تو جس طرح کا میک اپ چاہیں کر سکتے ہیں۔''

پروڈیوسر نے کہا ''ہمیں تو خاص کر آپ کی ضرورت ہے''

میں سوچنے لگا۔

گھر والی اور بچوں سے ملنے کے بہانے جس روز میں دہلی کا ٹکٹ لے کر نیچے آیا تو نیچے لفٹ کے پاس مجھے پروڈیوسر کے درشن ہو گئے۔

''جلد واپس آ رہے ہیں نا آپ؟'' اُس نے پوچھا

''ہاں ہاں'' میں نے جواب دیا۔

ایک چینی اکھان ہے ''انسان دنیا میں کہیں بھی چلا جائے اُسے قبر کے لیے دو گز زمین مل ہی جاتی ہے''

بیوی نے کہا ''فلموں کو گولی مارو'' میں سمجھ گیا اور میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں لاکھ سوا لاکھ کی آمدنی کی طرف نہیں جاؤں گا۔ کوئی کچھ سوچتا رہے، کچھ بھی بننا چاہے لیکن ہم وہی کچھ بن سکتے ہیں جس کے لیے ہماری روایات ہمیں اُکساتی ہیں۔

عوامی زندگی کے لیے میرے اندر احساسات پھر سے جاگ رہے ہیں۔ اب بار بار میرے ذہن میں یہ سوچ ابھر رہی ہے کہ تخلیق وہی قابلِ قبول ہے جسے قاری سمجھ سکے۔ ہمارا قاری کون ہے، کہاں ہے؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں مَیں نے نہ جانے کتنے برسوں سے چھپنے سے پہلے ہر ایرے غیرے کو سنانے کا روگ پال رکھا ہے۔ جس کی جو بھی رائے ہو میں اسے کچی پنسل سے نوٹ کر لیتا ہوں۔ میری جیب میں ربر موجود رہتی ہے۔ جو رائے قابلِ عمل نہیں ہوتی اُسی روز میں اُسے سڑک پر چلتے ہوئے ربر سے مٹا دیتا ہوں آخری فیصلہ لکھاری کا اپنا من ہی کرتا ہے۔

رچنا بارہ مصالحوں کی چاٹ نہیں ہے۔ جیسے کہ ہماری فلمیں ہوتی ہیں۔ میں رچنا کو مرنے والوں کی منڈی بھی نہیں گردانتا۔ تحریر وہی جو زمانے سے لڑ سکے۔ مطلب یہ کہ جو لکھت آج لکھی اور کل پرانی ہو گئی ہو۔ (پرانی سے مراد باسی) اُس کا کیا فائدہ۔ نقاد اپنا فرض پورا نہیں کر رہے۔ وہ ہمارے ہی کندھوں پر کھڑے ہو کر یہ کہتے ہیں۔

''ہمارے پاؤں کے نیچے زمین نہیں ہے''

اسی لیے ہمیں اپنا نقاد خود بننا پڑتا ہے۔

جب میں دہلی میں ہوتا ہوں تو جیسے ہی گھر سے پاؤں باہر ہوا تو میں گیارہ بجے تک گھر نہیں لوٹتا۔ گھر والوں کو کوئی عندیہ نہیں ہوتا کہ میں دن کے وقت کہاں کہاں بھٹکتا پھروں گا۔ اس کا تو مجھے بھی پتا نہیں ہوتا۔

دراصل میرا ہر دن آوارہ گردی کا دن ہوتا ہے۔

زیادہ خوشی اُن کے ساتھ مل کر ہوتی ہے جو لیکھک نہیں ہوتے۔ قاری ہوتے ہیں یا قاری بننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ لیکھک دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے سے دل بہت اُتاولا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر بندہ اپنی تخلیقات کے پیمانے سے محظ آپ ہی کو نہیں بلکہ تمام کو ناپ رہا ہوتا ہے۔

کتابوں کی اپنی دنیا ہے۔ کبھی میں گورکی کو پڑھ رہا ہوتا ہوں، کبھی ٹالسٹائی کو، کبھی چیخوف کو اور کبھی دوستووسکی کو۔ یہ چار قلمکار وہ چار درویش ہیں جن کے ساتھ میں آوارہ گردی کی ہر بات کا اشتراک کر سکتا ہوں۔

کافکا، کامیو اور سارتر۔ یہ تین اور طرح کے ادیب ہیں۔ انہوں نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ ردی کی کتابوں والا میرا سب سے بڑا دوست ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ کھرا سونا کوڑیوں کے بھاؤ دے دیتا ہے بلکہ اس لیے کہ اُس کے پاس ملکی اور غیر ملکی ادیبوں کی کتابیں ایک دوسری کے قریب پڑی مل جاتی ہیں۔

کوئی کتاب یا رسالہ میں آج تک پورا نہیں پڑھ سکا۔ گھر والی اکثر کہتی ہے ''پہلے کتابیں یا رسالے کم تھے۔ آگ میں جھونکنے کے لیے مزید اُٹھا لائے ہو''۔

کونسا پیکٹ کس وقت کہاں رکھا گیا ہمارے گھر کے اس اندھیر کھاتے میں نہیں پتا چل سکتا۔ میری لائبریری میں کتنی کتابیں اور کتنے رسائل موجود ہیں اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ اگر کوئی مجھے اپنی ہی کتاب اپنی ذاتی لائبریری میں تلاش کرنی پڑے تو اس کا ملنا میرے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ یہاں میری کتابوں کو بھی روپوش ہونے کی عادت پڑ گئی ہے۔ کبھی کبھار میں سوچتا ہوں کہ جیسے ہی میری آنکھیں بند ہوں گی میری لائبریری ردّی کے بھاؤ بک جائے گی۔

کبھی دیمک اپنا کام دکھانے لگ جاتی ہے۔ اس بیچاری کو بھی کوئی کیوں دوش دے اسے بھی تو اپنی خوراک پوری کرنا ہوتی ہے۔ یہ نہ اچھی کتاب دیکھتی ہے نہ بُری۔ نہ دیس کا میگزین اور نہ بدیسی۔ اپنی خوراک پیدا کرتے ہوئے کسی بھی کتاب یا رسالے سے رعایت نہیں برتتی۔

جب کبھی کسی بک سٹال پر کوئی کتاب پسند آ جاتی ہے تو میں اسے جھٹ خرید لیتا ہوں بھلے ہی مجھے علم ہوتا ہے کہ اس کی ایک ادھ کاپی میری لائبریری میں ضرور ہو گی۔ سوچتا ہوں اُسے ڈھونڈنے کی مصیبت کون پالے۔

کبھی غیر ملکی فلم کے پردے پر اُن شہروں کی سیاحت کا لطف اُٹھاتا رہتا ہوں جہاں پہنچ کر خصوصی درشن کی تانیک مزید بڑھتی ہے۔ کبھی کسی غیر ملکی سیّاح یا کسی بدیسی ایجنسی کی مدد سے کسی نہ کسی غیر ملکی زبان کے ادبی خدوخال سے دل کی گہرائیوں سے پہچان کر لیتا ہوں۔

لِکھاں میں اپنی جیوتی چھڈ کے سارے پیار
مینوں وی خود پسند ہے گورے تینڈا وچار

میں یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے پڑھنا کیسے سیکھا نہ یہ کہ مجھے لکھنے کا چسکا کیسے پڑا۔ ایک بات میں ضرور عرض کروں گا کہ میرا ایک ایڈیٹر متر میری کہانی ''اِکنّی'' کی یاد دلاتے ہوئے بار بار پُوچھ چکا ہے۔

''ستیارتھی جی.....اب آپ اِکنّی جیسی کہانی کیوں نہیں لکھتے؟''

وہ تو میں نے ۱۹۴۱ء میں ہی لکھ لی تھی اور اب ۱۹۶۸ء گزر رہا ہے۔ کیا میں ستائیس سال کے بعد بھی ستائیس سال پہلے جیسا ہی لکھوں؟ تو پھر لیکھک

کی کیا ضرورت ہے کسی کمپیوٹر سے ہی کام چلایا جاسکتا ہے۔

سیالے دی دُھپ ہتھ ودھاوے گھڑی کندھ تے
پاڑل دی ماں نے لکائی جنگن
دھودھا کے چٹی ساڑھی
آئی دھُپ پر اوہنی جیویں پاڑل دی ماں
پاڑل بچے ماری تاڑی

میں اس بار بمبئی سے واپس آیا تو پاڑل نے پوچھا ''پتاجی! آپ کی وہ کہانی کہاں پڑی ہے ''کنچن مٹی کھائی''؟''

میں نے کہا۔ یہیں کہیں پڑی ہوگی۔

اُس نے ''آجکل'' (ہندی) کا وہ شمارہ ڈھونڈ لیا جس میں یہ کہانی چھپی تھی ایڈیٹر نے اُس کے نام میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے کنچن مائی کر دیا تھا اور کہانی کی نصف طاقت تو نام کے بدلنے سے ہی جاتی رہی۔

میں نے پاڑل سے وعدہ کیا کہ میرا کہانیوں کا اگلا مجموعہ پنجابی کا ہوگا۔ کنچن مٹی کھائی اُس کی دیدی ''کوتا'' کی موت سے متاثر ہو کر تحریر کی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ پاڑل کو سات برس پہلے کی رچنا بھولی نہیں۔ میں نے سوچا یہ اُس کہانی کی شکتی کا ثبوت ہے۔

دھ تیے نی سمجھا گنگ نُوں
جد کھدیاں نہ کرے پئی انج
بھکھاں نال کی آکھے ہاسا

اپنی کچھ نئی شاعری سنانے کے بعد کلکتہ کی سیاحت کی بات شروع کی جہاں وہ ایک ادبی اُکٹھ میں شامل ہونے کے لیے گیا تھا۔ صدر نے ہر ایک مقرر کو پندرہ منٹوں سے زائد وقت نہ دیا اور خود پون گھنٹہ نہ جانے کس کس کتاب کے حوالے دے دے کر سامعین کو بور کرتا رہا۔ یہ حوالے خاص کر سنسکرت کے تھے۔ ہر نام نے آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے کہا ''ستیارتھی جی! میں مزید بور نہ ہوسکا تو میں نے تیکھی آواز سے کہا جناب صدر! آپ کب تک ہمیں بور کرتے رہیں گے؟ جو کام آپ کر رہے ہیں وہ تو کمپیوٹر بھی کرسکتا ہے۔ اگر آپ نہیں مانتے تو نہ سہی تو پھر آپ سنسکرت بولتے جایئے میں گوربانی سناتا جاؤں گا''۔ اور میٹنگ برخواست ہوگئی۔

پاڑل میری بچی
میرا مستقبل رنگین
جد بجھ جاوے گا ایہہ دیوا
جد مٹی، مٹی وچ رلسی
تیری نکی اُنگل پھڑ کے
میں وی کھڑا رہیا ہوواں گا
میں وی تر رہا ہوواں گا
ہورا گانہہ
جتھے مینوں کوئی اڈیکے

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس وقت اپنی شاعری کے حوالے دے دے کر میں نے خوامخواہ بور کرنے کا حق کیوں لے لیا ہے۔ جو کام گراموفون یا کمپیوٹر کرسکتا ہے وہ فنکار کو نہیں کرنا چاہیے۔

جو دہلی میں چھوڑ کر گیا تھا وہ نو ماہ کے بعد کافی بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میرا ریڈیو دوست پوچھتا ہے ''ستیارتھی جی اپنا کوٹ بمبئی چھوڑ آئے؟ کُرتے پاجامے کے بغیر تو آپ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے اور بوٹ کہاں گئے؟ یہ سنہری فیتوں والی چپل خوبصورت ہے لیکن۔۔۔''؟

کہتے ہیں کہ لمبا کوٹ میری شخصیت کا حصّہ ہے۔

ہم ہنس پڑے کھِل کھلا کر۔

باتوں باتوں میں سردار گوربخش سنگھ جی کا ذکر آجاتا ہے جنہیں ایک دفعہ نو یوگ پریس میں اچکن کے بغیر دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔

او بادشاہو۔ او درویشو۔ اے ادیبو۔ لمبا کوٹ اب آپ کا بندھن ہے۔ دیر تک رہنے والا بندھن۔ آپ کوٹ کے بغیر آدھے ادیب لگتے ہیں۔ گستاخی معاف۔ وعدہ کریں کہ آئندہ آپ ہمارے پریس پر کُرتے اور پاجامے میں نہیں آئیں گے اور ہمارے کمپوزروں اور مشین مینوں کا بھرم نہیں توڑیں گے اور خاص کر استاد رونق سنگھ جی کو مایوس نہیں کریں گے جو آپ کو ۱۹۳۶ء سے لمبے کوٹ میں دیکھتے آرہے ہیں اور ایک اور بات اُستاد جی کے آپ سے دو مطالبات ہیں۔ پہلا یہ کہ استاد صاحب کے لیے ایک لمبا کوٹ منگوا دیں اور دوسرا یہ کہ ''آرسی'' میں اُن کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ ذکر ضرور کریں کہ پینسٹھ سال کا ہونے کے بعد ان کے دانت آگئے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں ''سردار پریتم سنگھ جی آپ دیکھتے جائیں میں تمام دوستوں اور پریمیوں کا ہی نہیں خود اپنا بھرم بھی قائم رکھوں گا۔ ابھی تو میں آدھا آدمی ہوں کیوں کہ میں ابھی اپنی عمر کے نصف حصّے میں پہنچا ہوں۔ میری عمر سو سال تک جائے گی۔ شائد میری خواہش پوری ہوجائے۔ پوری ایک سو بیس سال۔''

میں تنہائی میں اکثر سوچتا ہوں کیا سچ مُچ لمبے کوٹ کے ساتھ میرا اتنا ہی گٹھ جوڑ ہوگیا ہے جتنا کہ لمبی داڑھی اور لمبے بالوں کا۔ کبھی کبھی سکول جاتا ہوا بچہ مجھے رابندر ناتھ ٹیگور سمجھ کے مذاق کر جاتا ہے۔ متعدد بار کوئی نوجوان بھی اسی قسم کا مذاق کر جاتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔۔۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔۔۔ ابتدا میں مجھے بہت غصّہ آتا تھا اب سوچتا ہوں اُن کا یہ حق انہیں حاصل رہنا چاہیے بچوں کو بھی اور نوجوانوں کو بھی۔

میں نے کئی بار فیصلہ کیا کہ آج کے بعد میں کسی کو بھی اُن چھپی تحریر نہیں سناؤں گا۔ لیکن یہ فیصلہ برقرار نہ رہتا۔ پہلی بار سعادت حسن منٹو نے ۱۹۴۱ء میں میرا مذاق اُڑایا تھا کہ میں خوامخواہ لوگوں کو اپنی تخلیقات سنانے بیٹھ جاتا ہوں۔

اُسے میں نے جواب دیا تھا ''لوگوں نے مجھ سے لوگ گیت لکھوائے تو کیا اب میں انہیں اپنی کہانیاں سنا کراُن کا قرض نہیں اتار سکتا''۔

اٹھائیس سال پرانے لطیفے کی لاش کو میرے چند دوستوں نے کاندھوں پر اٹھا کر گھومنے کی عادت نہ جانے کیوں پال رکھی ہے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں کہتا ہوں ''دوستو کیوں منٹو کے تراشے ہوئے بے کار لطیفے اُٹھائے پھرتے ہو۔ کوئی اپنا ہنر دکھاؤ۔ کوئی اپنا لطیفہ تراشو جو میرے ماضی کا سہارا بنے''

سورج ساڈا محرم بن کے

آگ دے پیالے لیایا

کبھی میں سوچتا تھا کہ کتنی فضول اور بدصورت ہے میری زندگی، نہ مندر، نہ مسجد، گوردوارہ نہ گرجا گھر، میری رسائی ہے تو میرے پڑھنے لکھنے والے کمرے تک ۔ یہاں سے اٹھ کر میں سو جاتا ہوں اور جاگنے کے بعد ہوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر پھر اپنے اڈّے پر آ کر مجبوس ہو جاتا ہوں۔ میرا کام یہی ہے کہ میں کاغذ کالے کئے جاؤں۔

اگر میں نے بطور ایڈیٹر دس ایک سال کام نہ کیا ہوتا تو میرے اندر مدیرانہ صلاحیت پیدا نہ ہوتی۔ اب میری مدیرانہ سوجھ بُوجھ جہاں میری مدد کرتی ہے وہاں یہ میری دشمن بھی بن جاتی ہے کیونکہ مجھے میری تخلیقات بمشکل پسند آتی ہیں۔ بار بار ایک ہی تخلیق ضبطِ تحریر میں لانے کی عادت میرے اندر کے نقاد اور ایڈیٹر سے خوف کا نتیجہ ہے۔

سُر چوں سُر ٹُرے

مُر لیہے نی ہوا تُرے

کبھی گرما گرم بحث سے اور کبھی حسن کی خاموش حرارت میں سے فن پارہ جنم لیتا ہے۔ مرحومین کے خط ضرور پڑھیں۔ میں تو گورکی کے خطوط کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

''اپنی شریک حیات کو تو آپ چھ چھ ماہ خط نہیں لکھتے''

''آئندہ خیال رکھوں گا'' میں نے جناب پریتم سنگھ سے وعدہ کرتا ہوں۔

اے اوشا جو رنگلی پُونی لے

رنگلی وینی تے

تند کڈھے دریاؤ

اوشا کے جیسے خدوخال تھے اُس کے جسے کبھی میں نے پریت نگر میں دیکھا تھا۔ خوشبو جیسی کومل، لمس جیسی خوشبودار۔ اُس کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں تھیں یا پھر اس کا گورا رنگ ہی اُس کے حسن کی سچی گواہی تھا۔ آج سے تیرہ برس پیشتر میں اُسے بمبئی میں ملا تھا۔ لیکن یہ افسوس میرے دامن گیر رہا کہ میں اُس کی فوٹو نہ کھینچ سکا۔ اپنے رولی فلیکس سے۔ اس بار بھی میں بمبئی میں اُس کی فوٹو حاصل کرنے کا تردد نہ کر سکا کیونکہ رولی فلیکس میرے پاس نہیں تھا۔

کسی دوست کے ساتھ جب بات کرتے ہوئے میں نے کہا ادب میں فوٹو گرافک اپروچ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بات میری بیوی نے سن لی اور میرا کیمرا کہیں چھپا دیا۔ ابھی ابھی سردار پریتم نے یہ دُکھ بھری خبر سنائی ''جنے وقت اب اس دنیا میں نہیں رہی''

ایدھر لا رب ایدھر، اودھر لا اودھر

برفانی جو ہاتیرا

مہنیاں تک بھڑ یا تھیسی

دوستی کے دروازے بھی کئی بار کھلتے ہیں اور کئی بار بند ہوتے ہیں۔

اکثر اوقات میں سوچتا ہوں مجھے ایک ہی زبان میں لکھنا چاہیے تھا۔ پنجابی میں میری پہلی کتاب چھپی ۱۹۴۶ء میں۔ پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو، ہندی اور انگریزی میں لکھنے کا شوق پیدا کئے رکھا۔ انگریزی سے تو پیچھا چھوٹتا جا رہا ہے لیکن اردو اور ہندی سے ابھی تک چمٹا ہوا ہوں۔ اردو سے بڑا گہرا رشتہ ہے یہی میری تعلیم کا ذریعہ تھا۔ اور ہندی کے ساتھ اپنے تعلق کو کیسے فضول کہوں۔ میری سب سے زیادہ کتابیں اسی زبان میں ہیں۔

میں ہاں راہی پیریں چکّر

اسّا ملیاں ورگاں دے سدے

ہُن میرا دل سنداتے پھر سندا

میری ناجو نار سدا تیار

چلّے جدھر میں چلداں تے سرُ دھنداں

بھاویں کدی کدی اوہ تک کے

ہُن لمیرے سفروں اک کے

آکھے میں نہیں جانا

وے کیوں کریں دھگانا

میں بھُلّی ویاہ کر کے وے من پچھوتانا

میں کبھی اس زعم میں مبتلا نہیں ہوا کہ میں کوئی قابلِ قدر لکھاری ہوں۔ گوئٹے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اُس کی کامیابی کا راز اُس کی ٪۹۵ محنت پر ہے باقی ۵ فیصد کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں۔ میرے بطون میں صلاحیت ضرور ہے لیکن پانچ فیصد سے کم ہی ہوگی۔

میں محنت سے کبھی نہیں کتراتا۔ سوچتا ہوں کہ محنت کی عادت نعمت ہے یا مصیبت۔

میں جو کچھ بھی ہوں اپنی بیوی ریکھا کے باعث ہوں۔ ریکھا کے جنم کا نام ہے شانتی۔ شانتی کو تبدیل کر کے میں نے جے وَنتی کر دیا ہے۔ پھر یہ نام بھی پسند نہ آیا تو اپنی پتلون کا نام ریکھا رکھ دیا۔

اپنی کہانیوں کے مجموعے ''چائے کا رنگ'' کے بارے میں میں نے لکھا تھا۔

تیسری بار تیرا نام بدل کر
تیسرے ویاہ کا مزہ لے رہا ہوں
ہاں بڑھا دو چائے کا پیالہ میری اُور ریکھا ڈارلنگ
میں اپنے گھر میں اَن پے انگ گیسٹ کی طرح رہتا ہوں۔ نہ راشن لانے کی فکر نہ دودھ لانے کا جھنجھٹ۔

ہمارے گھر میں دو تین کرائے دار رہتے ہیں۔ کرایہ وصول کرنے کا کام میں نے اپنے ذمہ نہیں لیا۔ میں کبھی اپنے بوٹ نہیں خریدتا نہ کوٹ کے لیے کپڑا نہ تیل نہ کنگھی۔ خود خریدوں تو پیسے دینے پڑیں گے۔ لکھنے کے لیے کاغذ بھی ریکھا ہی خرید کر لائے تو لائے اور پارکر اِنک بھی، اور اگر فونٹین پین گُم ہو جائے تو اُسے وہی خرید کر لائے۔ میرے والد صاحب کہا کرتے تھے ''ہم تو بارات کے ساتھ آئے ہوئے باراتی ہیں''۔ میں نے بھی کچھ اسی طرح کی خوش مزاجی اور آرام طلبی اپنا رکھی ہے۔

بمبئی سے گھر پہنچنے پر میں نے اپنی بیٹیوں کو پاس بلا کر کہا ''اپنی ممّی کو بلاؤ''۔ بیٹیوں کی ممّی آ گئی تو میں نے کہا ''مجھے مبارک باد دو کہ آج میں ساٹھ سال کا ہو رہا ہوں'' لیکن یقین رکھیں کہ ابھی میں آدھا آدمی ہوں۔ مطلب یہ کر لیں کہ میں نے ابھی آدھی عمر ہی بسر کی ہے۔ چائے آئی کچھ نمکین اور ساتھ کچھ مٹھائی بھی۔ میری بیوی نے مجھ سے کاغذ پر تحریری وعدہ لیا کہ میں اب کبھی بمبئی نہیں جاؤں گا۔

میں نے پارُل سے پوچھا۔ تاراشنکر بنیر جی کا گن دیوتا کہاں تک پڑھ لیا ہے۔

اُس نے کہا ''میں نے اسے ابھی ابھی ختم کیا ہے''

میں نے پوچھا ''کیسا لگا''

اس نے خوش ہو کر کہا ''بہت اچھا''

میں نے کہا ''تمہیں معلوم ہے پارُل کہ بنگال کی دیہاتی زندگی کے دائرے میں لکھا ہوا یہ ناول تمہیں کیوں اتنا پسند ہے؟''

اس نے کہا ''بتائیں''

میں نے کہا اس لئے کہ میں گاؤں کا ہی جم پل ہوں۔ میری رگوں میں گاؤں کا خون دوڑ رہا ہے اور تمہاری رگوں میں میرا لہو۔ اُس نے کہا ''پِتا جی مجھے گاؤں تو دکھلا لاؤ جن کے بارے میں تاراشنکر نے یہ ناول تحریر کیا ہے۔

''الکا تو اپنے کالج کی پارٹی سے لطف اندوز ہو کر آئی ہے۔ میں تو بنگال جاؤں گی''۔

میں نے کہا ''تو نہیں جانتی پارُل کہ ہم نے کہاں کہاں جانا ہے۔ کتنا اچھا ہے کہ پہلے بنگال کی باری آئے گی۔ بچیاں اور اُن کی ممّی سونے کے لیے صحن میں چلی گئیں اور میں نے اپنے نئے ناول ''ہم صنم'' کا مسودہ پڑھنا شروع کیا جس کا ایک ایک حرف میرے ماضی کی سوگندھ کھا رہا ہے۔

☆

چہرہ
چہرہ
کہانیاں
(خاکہ نما مضامین)

ادبی دنیا میں احمد زین الدین کی شناخت ان کی افسانہ نویسی ہے۔ وہ ایک پیدائشی قلم کار ہیں۔ افسانہ روایتی ہو یا جدید، کہانی اس کی اساس ہو یا علامت، افسانہ نگار میں چند باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ انسانی فطرت اور نفسیات پر اس کی گرفت مضبوط ہو، وہ کرداروں کے تعامل (Inneraction) کا راز جانتا ہو، اسے اپنے قاری پر اعتماد ہو اور کہانی کی کڑیوں کو جوڑتے ہوئے وہ صحیح انتخاب سے کام لے کہ کہاں جزئیات نگاری ضروری ہے، کہاں صرف اشاروں سے کام لیا جائے اور کہاں ایسا خلا چھوڑا جائے جسے قاری پُر کر سکے اور افسانہ ایسی جگہ ختم ہو کہ ایک سے زیادہ ''خاتمے'' ممکن ہوں اور قاری اپنے طور پر کہانی کو منطقی انجام تک پہنچائے۔ اس طویل جملہ معترضہ (یہ جملۂ معترضہ بھی کیسی مفید چیز ہے لکھنے والوں کے گریز و انحراف کے لیے) کے لیے آپ کی خدمت میں معذرت بھی نہیں پیش کر سکتا کہ یہ میرے نزدیک ضروری تھا۔ میرے عرض کرنے کا مدعا صرف یہ ہے کہ زین کے افسانوں اور مضامین میں کئی عناصر مشترک ہیں اور ادبی مضمون نگاری کا یہ انداز ہمارے ہاں آج بھی نیا اور دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

......سیّد محمد ابوالخیر کشفی

قیمت: ۳۵۰ روپے، صفحات: دوسو چوبیس مجلد

دستیابی: زین پبلی کیشنز، کراچی۔

محبت کے مظاہر

عطیہ سکندر علی
(سکھر)

حنیف باوا افسانے کا بڑا نام ہے وہ صرف نام ہی کے نہیں بلکہ کام کے بھی بڑے آدمی ہیں۔

بانو قدسیہ (لاہور)

باوا کی چند کہانیاں پڑھ کر میں گویا ان سے مل لیا ہوں اور اپنی سوال جواب کی خواہش پوری کر لی ہے۔ باوا آپ واقعی باوا ہیں؟ لگتا ہے آپ ہر وقت کچھ نہ کچھ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کیا؟ کیا بتاؤں کیا؟ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یاد نہیں رہتا۔ کیا؟ پھر بھی ڈھونڈتے چلے جانا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اپنے اندر اپنے سوا کیا ملے گا؟ نہیں بابا منش جو ہی کھوتا ہے اپنے خارج میں ''اور جو بھی اسے ملتا ہے'' خارج میں ہی۔ ہم سانس بھی اسی لیے لیتے ہیں کہ باہر کی ہوا بھیتر لے جائیں۔ مگر آپ تیاگی ہیں باوا۔ تیاگی تو آنکھیں موند کر اپنے اندر پڑا رہتا ہے۔ بھوگ ہی تیاگ ہے۔ ''اندر پڑا رہوں تو کہانیاں کیسے لکھوں؟ کہانیاں لکھ پڑھ کر ہی زندگی کیونکر بھوگی جا سکتی ہے؟ حنیف باوا نے اپنی خاموش استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا گویا یہ کہنے کے لیے کہ اس کا جواب تو تمہیں خود آپ ہی دینا ہوگا۔

جوگندر پال (دہلی، بھارت)

حنیف باوا پنجابی افسانے کا ایک بڑا نام ہے۔ لیکن انہوں نے اردو افسانے سے بھی اغماض نہیں برتا۔ وہ فرزند زمین ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں میں جھنگ کی مٹی کی باس موجود ہے۔ ان کی معروضیت جب اپنا جادو جگاتی ہے تو موضوعیت پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اور زندگی کی حقیقت تخلیقی حسن سے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ ان کے کردار ان کے گرد و پیش کے جانے پہچانے کردار ہیں اور ان میں حنیف باوا کی اپنی ذات کا عکس بھی موجود ہے۔ چنانچہ باہر کے آدمی میں اندر کے آدمی کے نقوش زیادہ نظر آتے ہیں۔ حنیف باوا کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ افسانے کے وسیلے سے ہمیں کسی غیر متوقع صورت حال سے آشنا نہیں کرتے بلکہ جب متوقع انکشاف رونما ہوتا ہے تو زندگی کی حقیقی معنویت اشکار ہو جاتی ہے جسے ہم نے فراموش کر رکھا تھا۔

حنیف باوا کے افسانے پڑھ کر جو فضا مرتب ہوئی ہے مجھے اس کا رنگ نظر آتا ہے۔ توقع ہے کہ اس کتاب کے افسانے دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ حنیف باوا کی انفرادیت تسلیم کی جائے گی۔

انور سدید (لاہور)

سب سے پہلے میں نے آپ کا وہ افسانہ پڑھا جو آپ نے اپنی والدہ محترمہ کے متعلق لکھا تھا۔ کتنا خلوص اور کتنی محبت تھی اس میں۔ اس نے مجھے آپ کو اور آپ کی تحریروں کو سمجھنے میں بڑی مدد کی۔ آپ کی تحریروں سے ایک تاثر ملتا ہے کہ لکھنے والا چیزوں کو ذہن کے علاوہ دل کے روزن سے بھی دیکھتا ہے۔ ایسا اسلوب تحریر اور فکری رجحان ادب کو بہت تقویت پہنچاتا ہے۔

غلام جیلانی اصغر (●)

آپ کے افسانوں میں مجھے جو بات سب سے اچھی لگی کہ ان کا خمیر اپنی مٹی سے اٹھا ہے۔ سب کردار اپنے ہیں۔ مانوس اور دُکھ سکھ بانٹنے والے۔ فنکار کا فن قاری سے ہمکلام نہ ہو تو اپنی توقیر کھو دیتا ہے۔ آپ کے افسانے ایسے باوقار ہیں کہ نہ صرف قاری سے ہمکلام ہوتے ہیں بلکہ اس کے دُکھ درد بھی بانٹتے ہیں جو فن پارہ قاری کا دُکھ بانٹے وہ اپنے عہد کا بڑا فن پارہ کہلاتا ہے۔ یہ رائے کسی نقاد کی ہے نہ محقق کی، ایک دُور افتادہ گاؤں میں رہنے والے افسانہ نگار محمد حامد سراج کی ہے۔ جسے افسانوں سے محبت ہے۔

محمد حامد سراج (میانوالی)

باوا جی قد و قامت کے لحاظ سے اتنے ہیں جتنے ہونے چاہئیں۔ ان کو تخلیق کرتے ہوئے اللہ میاں نے کسی قسم کی فضول خرچی سے کام نہیں لیا۔ مگر دماغ دیتے ہوئے ان کے ساتھ بہت رعایت برتی ہے۔ کسی مغل بادشاہ کا دماغ اُٹھا کر ان کی کھوپڑی میں ڈال دیا۔ اتنی چھوٹی کھوپڑی اور اتنا بھاری دماغ اُٹھانا ان کے لیے وبال جان بنتا جا رہا ہے۔ جب یہ ٹیچر تھے تو روزانہ ہیڈ ماسٹر سے جھگڑنا ان کا معمول تھا۔ جب کلاس میں ہوتے تو طلباء کو اپنے مخصوص مزاج کا ذائقہ چکھاتے رہتے تھے۔ شروع میں پنجابی افسانے کو اپنی منزل سمجھا اور بہت شہرت حاصل کر لی۔ پھر کسی کے مشورے سے اردو میں افسانہ نگاری شروع کر دی۔ یہاں بھی اچھی کارکردگی دکھائی۔ پھر میں نے ان کو انشائیہ نگاری کی راہ پر ڈال دیا۔ اب اردو انشائیہ میں ایک مقام حاصل کر کے بیٹھے ہیں۔ روز ازل سے مالی مشکلات کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ ان کو ناداری ایسی پسند آئی ہے کہ اب اگر خوشحالی ان کے پاؤں بھی پڑے تو یہ اس کو اپنی بہو بنانا پسند نہیں کریں گے۔ جھنگ میں خیر الدین انصاری مرحوم کے بعد میرے سب سے بڑے مخالف یہی ہیں۔ یہ مجھے کسی شاہی خاندان کا طرف دار سمجھتے ہیں۔ جس سے اس کی ازل سے مخالفت چلی آ رہی ہے۔ قسمت اچھی تھی ریاض رام کے ہتھے نہیں چڑھے۔ ورنہ دال چینی کے بھاؤ کا پتہ چل جاتا۔ میں نے کئی دفعہ ریاض رام سے کہا تھا ان سرخوں (حنیف باوا اور خیر الدین انصاری) کو اپنی کھونٹی کی چند ضربوں سے مستفیض کرو۔ وہ یہ نیک کام جلدی کرنا بھی چاہتے تھے مگر موت نے موقع نہیں دیا۔

انجم نیازی (سرگودھا)

حنیف باوا کے افسانوں میں گھنیری زلفوں یا قوتی لبوں، لانبی

پلکوں، سروقد، چمکدار دندان، نزاکت سے بل کھاتی کمر، آواز کا لوچ اور مستانہ چال کا ذکر نہیں ملتا۔ کیچڑ میں لتھڑا ہوا حسن، پھولوں سے کاندھوں پر سواری کرتے پتھر، محنت کش لوگ، زندگی کے کھردرے راستے حقائق کے تپتے ہوئے صحراؤں کا ذکر ملتا ہے۔

حنیف باوا کا اپنی دھرتی سے گہرا سمبندھ ہونے کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں دیس کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔

حنیف باوا اپنی آنکھیں کھلی اور اُن کا ذہن موجودات عالم اور مظاہر فطرت کے بارے میں غور وفکر کرتا رہتا ہے وہ اشیاء، مناظر اور واقعات (جن کو ہم حاشیے پر جگہ دینے کے عادی ہیں) کے بطون میں اتر کر ان کی دور رس نگاہ اور فعال ذہن خام مال لاد کر جب افسانے کے قالب میں ڈھالتا ہے تو ایک خوبصورت افسانہ صفحہ قرطاس پر چم چم کرنے لگتا ہے اور ہمیں ان کی قوتِ مشاہدہ پر رشک آنے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ یقیناً اردو افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

شفیع ہمدم (فیصل آباد)

''تنہائیوں کے درمیاں'' کی اشاعت اور عطائے بے بہا پر آپ کا دلی طور پر ممنون ہوں۔ آپ کی تخلیقات کا میں ایک خاموش قاری ہوں آپ سے زبانی گفتگو تو ہوتی رہتی ہے تاہم خط لکھنے کا شاید یہ پہلا موقع ہے۔ میں نے محسوس یہ کیا ہے کہ آپ کے افسانوں میں آپ کی شخصیت بہرحال موجود ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تحریریں اپنے عہد کی ترجمان بن گئی ہیں۔ عصری حسّیت کی پیشکش کے بغیر ظاہر ہے کامیاب افسانہ نہیں لکھا جاسکتا ہے۔ ادیب کو خلاؤں کے بجائے زمینی حقائق کو مدِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ آپ کے افسانے اس دھرتی کے روشن ذرّوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ روشن ذرّے جن کے سامنے سورج کی آب وتاب کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

ڈاکٹر شبیر احمد قادری (فیصل آباد)

حنیف باوا مشاہدات کو پینٹ کرنے والا کامیاب افسانہ نگار ہے۔ اس افسانہ نگار کے تمام افسانے اس معاشرے میں رہنے والے مختلف کرداروں کے چال چلن پر مبنی ہیں۔ کہیں بے راہ روی کا ذکر ہے تو کہیں جنسی مسائل کا، کہیں ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے تو کہیں مظلوم کی حمایت میں الفاظ کے سہارے وکالت کی گئی ہے۔ کہیں اسلام سے دوری کے سبب ہونے والی ناہمواری کا بیان ہے تو کہیں غیر فطری افعال سے ہونے والے نقصانات کا شمار کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں معاشرتی رسم ورواج کی غلط روی بھی ہے اور سماج میں جنم لینے والے انوکھے واقعات بھی۔ ان کے افسانے پڑھنے سے نہ صرف دنیا میں ہونے والے عجائب وغرائب کی معلومات ہوتی ہے بلکہ ان لوگوں کے چہرے بھی بے نقاب ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے چہرے پر کئی چہرے لگا رکھے ہیں۔ ان کے چند افسانوں میں ان لوگوں کے کرداروں کو بھی سولی پر چڑھایا گیا ہے جو مقدس رشتوں کو پامال کرتے ہیں۔ اپنی ہوس کے آگے کسی شخص کا تقدس قائم نہیں رکھتے۔ وہ نہ تو عمروں کا فرق ملحوظ رکھتے ہیں اور نہ رنگ ونسل وذات پات کا خیال کرتے ہیں۔ حنیف باوا نے زیادہ تر افسانوں میں ضمیر فروش لوگوں کا نوحہ بیان کیا ہے۔ ضمیر فروش، نہ تو معاشرے کے لیے مفید ہوتے ہیں، نہ محبِ وطن ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی گھر کی آب وہوا اور خوش گوار فضا ان کی لالچی طبیعت اور ہوس ناکی سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ حنیف باوا نے انسان کی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے کتابوں سے زیادہ انسانی چہروں کو پڑھا ہے۔ جبھی تو وہ اپنے افسانوں میں بے ثبات دنیا کے مختلف رنگ بھرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اختر ہاشمی (؟)

حنیف باوا کے افسانوی کردار عمرانی روایات کی عکاسی کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے افسانوی کرداروں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے انہیں ان کرداروں کے لیے کسی گپھا میں اُترنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ کردار اُنہیں اپنے آس پاس ہی دیکھائی دیتے رہے۔ اپنے تخلیقی حافظے کی بنیاد پر انہوں نے افسانوی کرداروں کو حقیقی منظر نامے کے قریب کر دیا ہے۔ ان کے افسانوی کرداروں کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ کسی خاص عہد سے تعلق نہیں رکھتے۔ اپنے کرداروں کی سماجی حوالے سے اس طرح بنت کرتے ہیں کہ ہر کردار کی لفظیات، لہجہ اور شناخت دوسرے کرداروں سے مختلف ہوتی ہے۔ یعنی ایک کھیت میں کام کرنے والے اور ایک دفتر میں کام کرنے والے کا انداز مختلف ہونا چاہیے جو کہ حنیف باوا کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ متحرک کردار اپنے آپ کو develop کرتا ہے، وہ کوئی الماری میں رکھا ہوا شوپیس نہیں ہے کہ جب چاہا اُسے نکال کر صاف کر دیا اور پھر دوبارہ اُسے الماری کی زینت بنا دیا۔ جب کوئی مکالمہ ہو تو دوسرے کردار کو اُس کے سامنے لایا جائے اور پھر وہ اپنا ''کردار نبھا'' کر چلا جائے۔

عابد خورشید (سرگودھا)

اگر چند جملوں میں حنیف باوا کی افسانہ نگاری پر تبصرہ مطلوب ہو تو اتنا کہنا کافی ہوگا کہ حنیف باوا فطرت سے کہانی کہنے کا ہنر لے کر آئے ہیں۔ کہانی کی دیوی اُن پر مہربان ہے۔ وہ اپنے کمرے، ایگل کے پن، پرانی میز، بازار۔۔۔ اور بازار میں نظر آنے والے کسی بھی شخص میں اتر کر اپنی کہانی نکال لاتے ہیں۔

حنیف باوا کہانی کا زیادہ خیال رکھتے ہیں، لفظوں کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔ لیکن اس بے اعتنائی سے کہانی کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ البتہ ایسے قارئین کو ضرور صدمہ پہنچتا ہے جو کہانی سے زیادہ لفظوں کے برتاؤ کو اہم سمجھتے ہیں۔ اصل کہانی سے زیادہ لفظوں سے بننے والی کہانیاں سننے میں محو رہتے ہیں۔

جان عالم (؟)

Hanif Bawa migrated from East Punjab in 1947 and settled in Jhang where he has been an active literary figure since the mid 50s. Jhang was mainly dominated by writers writing in Urdu like the late Sher Afzal jafri, Ghulam Muhammad Rangeen, Sahibzada Riffat Sultan, Irfan Chughtai, Jafer Tahir, Bilal Zubairi,Riaz Ram etc. but because of the rich literary and cultural past of the district the revival of punjab immediately caught the imagination of these writers and intellectuals. Hanif Bawa was among those who totally devoted themselves to Punjabi writer Prof. Sharib, Khairuddin Ansari, Abdul Ghafar Azhar, Prof. Sami Ullah Qurashi, Bilal Zubairi and Mumtaz Bloch who joined him late.

Sajjad Haider says that Bawa never philosophises on any situation neither does he create any artificial complex. He just narrates a commonplace situation and his character mostly belong to the lower classes. He uses the narrative which reminds one of the old style of story-telling He tries to pinpoint the rural-urban contradictions and the bitter differences between different stes of social classes.

Shafqat Tanvir Mirza (●)

☆

..... تیزاب میں تیرتے پھول .....

خدائے عزّ وجل تو جاوداں کرتا ہے لفظوں کو
مظفؔر اپنی ہر تخلیق تیرے نام کرتا ہے
(مظفؔر حنفی)

ان غزلوں کو صرف اس لحاظ سے روایتی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بحر و وزن اور ردیف و قافیہ کی پابند ہیں ورنہ اپنی معنویت، اسلوب اور مزاج کے لحاظ سے یہ اردو غزل کی مروّجہ ڈگر سے بہت الگ ہیں، ان میں غزل کا وہ لسانی اور مصنوعی لہجہ کہیں نظر نہیں آتا جو اردو غزل کو ''سخن بازناں گفتن'' اور ''تصوف برائے گفتن خوب است'' کے طفیل ملا تھا اور جسے اگلے وقتوں کا مزاج رکھنے والے شعراء آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ان غزلوں میں تخیل اور رومان کی وہ رنگینیاں نہیں ہیں، جو افسانے کو حقیقت اور حقیقت کو افسانہ بنا دیتی ہیں اور جنہیں آج بھی حضرات غزل کا طرۂ امتیاز خیال کرتے ہیں۔ اس فرسودہ روش کے برعکس زیرِ نظر مجموعہ کی غزلوں کا لہجہ آج کی زندگی کی طرح پرشور، سخت اور حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ غزلیں خیال اور رسمی مضامین سے بہت دور ہیں۔ یہ دراصل شاعر کے حقیقی اور سچے تجربات و مشاہدات کا آئینہ ہیں۔ ایسا آئینہ جس میں ہمارے آپ کے عہد کی زندگی اپنی جملہ رعنائیوں اور ریاکاریوں کے ساتھ صاف نظر آتی ہے۔ زندگی کی یہی روش جو خود کو بے نقاب کر کے ان غزلوں کے ذریعہ ہمیں اپنی جھلک دکھاتی ہے، اس مجموعہ کو ایک مردانہ لب و لہجہ سے ہمکنار کرتی ہے۔

.....پروفیسر فرمان فتحپوری

چار سو چھیاسٹھ صفحات مجلد، قیمت، پانچ سو روپے ہندوستانی،
دستیابی: عرشیہ پبلی کیشنز، سوریا اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی۔

○

''خوفِ مکافات''

حمد

بندوں پہ اگر فرض اطاعت ہے خدا کی
پھر حمد نگاری بھی عبادت ہے خدا کی

دعویٰ تو زمانے کو ہے آگاہی حق کا
معلوم مگر کس کو حقیقت ہے خدا کی

تاریخ کی ہر سانس دلاتی ہے یہ احساس
انسان کو ہر آن ضرورت ہے خدا کی

ہے غائب وحاضر میں وجود ایک سا اُس کا
سوچو تو عجب خلوت وجلوت ہے خدا کی

ہاں اس کے سوا تھا، نہ کوئی اب ہے، نہ ہوگا
کیا شان ہے کیا رفعت وعظمت ہے خدا کی

جائے گا کہاں لے کے ہمیں خوفِ مکافات
کونین کی وسعت میں حکومت ہے خدا کی

کیوں وقت کے شدّاد کو کرتا نہیں ناپید
پوشیدہ یقیناً کوئی حکمت ہے خدا کی

آماجگہِ شر ہے مگر روزِ ازل سے
یہ دنیا کسی طور سلامت ہے خدا کی!

منظر ایوبی (کراچی)

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

تفصیل میں سیرت کی تحریر کہاں ٹھہرے
الفاظ کا سرمایہ بھی عجزِ بیاں ٹھہرے

اُس دورِ رسالت کی بھی مثل کوئی کیا دے
تہذیب جہاں مہکے تاریخ جہاں ٹھہرے

قرآں کے پیامی بھی، قرآنِ مجسم بھی
وہ ہادیِ برحق جو وحدت کا نشاں ٹھہرے

اس مرسلؐ آخر کی عظمت کا سفر کیا ہے
معراج کی شب سارے لمحاتِ رواں ٹھہرے

اُس محسنِ اعظمؐ نے تعلیم یہی دی ہے
تعمیرِ یقیں ٹھہرے، تخریب زیاں ٹھہرے

اُس رحمتِ عالم نسبت رہے مستحکم
ایماں کی حرارت میں ہر عزم جواں ٹھہرے

تعریف کیا ہو اُن کی توصیف ہے ناممکن
ہر اسمِ محمدؐ بھی ایک جزوِ اذاں ٹھہرے

عرفانؔ اگر کہنا ہو نعت شہِ بطحا
ہر لفظ ہو متحرک ہر شعر میں جاں ٹھہرے

غالب عرفان (کراچی)

''پریت نہ جانے کوئے''

عذرا اصغر
(کراچی)

ماموں کافی دنوں سے بیمار تھے۔اس روز وہ ہمارے گھر آئے تو غمزدہ سے لگے۔امی کا دل بھائی کو رنجیدہ دیکھ کر بھرا آیا۔بولیں''آج یہیں رہ جاؤ منصور''

مگر ماموں نہ مانے اور اپنے گھر جانے کا اصرار کرنے لگے۔امی نے مجھے کہا۔

''تم منصور کے ساتھ چلی جاؤ۔اس کا دل بہلا رہے گا۔''

میری ویسے بھی موسمِ بہار کی چھٹیاں تھیں۔میں راضی ہوگئی۔پچھلے برس ممانی جان کے انتقال کے بعد سے ماموں کی بیماری بڑھ گئی تھی۔شوگر بھی زیادہ ہوگئی تھی۔دل کے مریض ہونے کے باوجود ماموں بڑے شگفتہ مزاج تھے مگر اب اکیلے گھر میں بولائے بولائے پھرتے تھے۔اس لیے گھبرا کے ہمارے گھر آجاتے تھے۔ماموں اپنے وقت کے اچھے بھلے ہیرو سمان تھے۔میں ابھی چھوٹی تھی جب ماموں چار بچوں کے باپ بن چکے تھے۔امّاں بتاتی تھیں ''تمہاری ممانی بھی اپنے وقت کی الڑھ مٹیار تھی۔کھلتا ہوا چمپئی رنگ، تیکھے نین نقش، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں۔کسی بیماری میں مبتلا ہو کر ماموں کے فوجی ہسپتال میں داخل ہوئیں اور ماموں کے ہی زیرِ علاج رہیں۔پھر خود تو بھلی چنگی ہو کر اپنے گاؤں واپس چلی گئیں مگر ماموں کو عشق کا مہلک روگ لگا گئیں۔اور پھر ماموں تندھی سے ان کے حصول میں جٹ گئے۔ممانی کے گھر والوں کو بھی بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔پڑھا لکھا، فوج کا اعلیٰ عہدیدار، ڈاکٹر جس کے سامنے ترقی کا ایک وسیع میدان کھلا پڑا تھا۔صاحب جائیداد، حسب نسب میں یکتا، شکل وصورت میں یونانی شہزادہ، لمبا، اونچا، چھ فٹ قد، کسرتی گٹھا ہوا جسم، چوڑا سینہ، سرخ وسفید رنگت، ممانی کا تو نصیبہ جاگ اٹھا تھا۔ممانی چٹی ان پڑھ۔ایک مکمل دیہاتی مٹیار۔مگر اللہ جس کو چاہتا ہے عقل کے بے بہا خزانے عطا کر دیتا ہے۔ممانی کے پاس کتابی علم نہیں تھا لیکن عقل وشعور میں وہ بے مثال تھیں اور ماموں تو جیسے ان کے بے دام غلام تھے۔ایک اشارہ ابرو پر جان دینے کو تیار۔ایسے پر ستار کم ہی ہوتے ہیں۔ممانی نے نہایت ہوشمندی سے گھر بار سنبھالا بلکہ ماموں کو بھی سنبھالا اور سسرال کو بھی۔بہت جلد وہ کنبے کی ہر دلعزیز بن گئیں۔فوجیوں کے تو آئے دن تبادلے ہوتے ہیں اور پھر سب کا آپس میں ملنا جلنا رہتا ہے۔آئے دن ڈنر، پارٹیاں، کلب۔ممانی کا برتاؤ ایسا تھا کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ ان پڑھ ہیں۔

ماموں کو انہوں نے تین خوبرو بیٹے اور ایک موہنی سی بیٹی دی۔بڑے قرینے سے بچے بیاہے اور ان کے اپنے گھروں میں آباد کیا۔بچے اپنے پروں اڑنے لگیں اور اپنی چونچوں چگنے لگیں تو اپنے آشیانے الگ بنا لیتے ہیں۔اتنے بڑے سے گھر میں ماموں ممانی اپنی سہانی یادوں کے ساتھ اکیلے بیٹھے رہ گئے۔ممانی شاید مسلسل جدائی اور تنہائی کو برداشت نہ کر سکیں۔انہیں دل کا شدید دورہ پڑا اور فالج کی زد میں آگئیں۔ماموں نے ایک سے بڑھ کر ایک علاج کیے خود معالج تھے۔تیمارداری میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر ممانی صحت یاب نہ ہوسکیں۔اور ماموں کی شب وروز کی محنت خدمت سب رائیگاں گئی۔جاتے جاتے ممانی انہیں دل کا روگ بھی دے گئیں۔بچے دوسرے شہروں میں اور کچھ دوسرے ملکوں میں جا بسے تھے۔اب لے دے کے ماموں کو بہن کا سہارا تھا۔جی زیادہ گھبراتا تو ہمارے گھر آکر کچھ دیر کے لیے اپنی جان لیوا تنہائی سے جان چھڑا لیتے۔آج امی نے مجھے ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ہم رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔وہ مجھے اپنی فوجی زندگی کے دلچسپ قصّے سناتے رہے۔نت نئے مریضوں کی داستانیں، جو سب میرے لیے نئے بھی تھے اور پُر لطف بھی۔رات خوب بھیگ گئی تو وہ بولے۔

''لو بیٹا اب تم بھی جا کر سو جاؤ مجھے بھی نیند آرہی ہے''

میں انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔بستر پر لیٹ کر میں کتنی دیر ان کے بارے میں سوچتی رہی۔''ایک وہ بندہ جو تمام زندگی سوشل رہا ہو۔مجلسی زندگی گزاری ہو۔بھرے پُرے گھر کی رونقیں ساتھ رہی ہوں۔اب سزا کی طرح زندگی کی تنہائی کاٹ رہا ہے۔کیسا عجیب لگتا ہوگا'' خیالوں کے تانے بانے میں الجھے جانے کب میں سوگئی۔اگلے دن صبح قدرے دیر سے آنکھ کھلی۔واش روم سے فارغ ہو کر کپڑے بدلے اور دبے پاؤں جا کر ماموں کے کمرے میں جھانکا وہ بے خبر سوئے ہوئے تھے۔میں باہر آکر باغیچے میں ٹہلنے لگی۔باغیچے میں ابھی موسمِ بہار ٹھہرا ہوا تھا۔رنگ برنگے پھول صبح کی نرم ہوا میں لہلہا رہے تھے۔گہری سبز گھاس پر اوس کے ننھے ننھے قطرے سفید موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ماموں کا یہ گھر شہر سے باہر ایک نئے آباد علاقے میں تھا۔سڑک کے اُس پار صاف ستھرے پانی کا ایک پکّا نالہ تھا جس کے دونوں کناروں پر طرح طرح پھولدار اور پھلوں کے درخت قطار اندر قطار لگے تھے۔جس کے سبب اس خطے کے حسن میں نکھار آیا ہوا تھا۔اس سے پرے پھر مکانات کا سلسلہ تھا۔کچھ قدرے بلندی پر اور کچھ نیچے آگے جا کر زمین بلند ہوتی چلی گئی تھی۔اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں حسین منظر پیش کر رہی تھیں۔جب سے ماموں نے یہ گھر بنایا تھا میں پہلی بار یہاں آئی تھی۔پہاڑی راستے پر پگڈنڈیاں رہنمائی کرتی تھیں۔نالے کی اس پار ایک گھر کے باہر پتھر کے بنچ پر ایک شخص بیٹھا کتاب پڑھنے میں محو تھا۔اپنے اردگرد کے منظر سے قطعی بے نیاز۔میں نے خود بھی اپنے ہاتھ میں ابنِ انشا کی شاعری کی کتاب تھام رکھی تھی۔مگر میں منظر میں گم تھی اور کتاب بند کی بند میرے ہاتھ میں تھی۔

بینچ پر بیٹھے آدمی کی محویت پر تعجب سے میری آنکھیں اس پر گڑ گئیں۔ حالانکہ اس میں تعجب کی ہرگز کوئی بات نہ تھی کہ وہ بیٹھا ہی صبح کے اس خاموش سہانے سمے میں محض مطالعے کے لیے ہوگا۔ کوئی طالب علم ہے شاید۔ تجسس اور شرارت ایک ساتھ میرے دل میں جاگی اور ہنسی میرے ہونٹوں پر آ بیٹھی۔ دیکھا تو جائے کون ہے؟ میرے قدم آگے بڑھے۔ نالے کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ایک چھلانگ میں اسے میں پار کرسکتی تھی مگر میں رک گئی۔ مبادا پیر پھسل گیا تو۔۔۔؟ تو جو یہ سامنے بیٹھا مطالعے میں مشغول ہے یقیناً میرے گرنے کی آواز سن کر میری مدد کو آئے گا۔ ہاتھ پیر ٹوٹ گیا تو ہسپتال لے کر جائے گا۔ خوامخواہ میری ہٹی ہوگی اور اگر میری چیخ اس تک نہ پہنچی تو جانے کب تک کس حال میں پڑی رہوں گی تاوقتیکہ ماموں جان مجھے ڈھونڈیں اور انہیں کیسے پتہ چلے گا کہ ان کی ایڈونچرس بھانجی اس نالے میں اوندھے منہ زخمی پڑی ہے۔

یکا یک اتنے بہت سے منفی خیالات میرے دماغ میں چکر کاٹنے لگے۔ تب میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی ''کوئی راستہ تو ہوگا نا؟'' اور راستہ دکھائی دے گیا۔ دائیں ہاتھ ذرا فاصلے پر ایک پلیا بنی ہوئی تھی۔ پلیا اتنی چوڑائی ضرور رکھتی تھی کہ اُس پر سے گاڑیاں بآسانی گزر سکتی تھیں۔ اسی پلیا سے گزر کر میں اس پڑھاکو خاں تک جا پہنچی۔ آہٹ پا کر اس نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کے چہرے پر استعجاب تھا۔ بولا؛

''جن بھوت تو آپ نہیں لگتیں۔ کوہ قاف دور ہے کہ پری مان لوں؟'' میں ہنس پڑی۔

''ارے واہ! میں نہ بھوت ہوں نہ پری۔ سامنے والے گھر میں رہتی ہوں اور رہتی بھی کہاں ہوں۔ کل ہی آئی ہوں۔ ڈاکٹر منصور میرے ماموں ہیں۔ ماموں کچھ بیمار ہیں نا۔ تعطیلات کی وجہ سے میں بھی فارغ تھی وہ مجھے لے آئے۔ میرا نام ستارا ہے''

''بہت شکریہ! آپ نے اپنا تفصیلی تعارف کرادیا ورنہ میں سمجھا تھا کہ کوئی اور مخلوق آسمان سے نازل ہوگئی ہے۔'' میرے چپ ہوتے وہ بولا۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھے جارہا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''اب یقین کرلیجیے کہ میں انسان ہوں''

''تارا آسمان سے اتر کر میرے روبرو آ گیا ہے۔ میرا نام مہتاب ہے۔ مہتاب علی''

''ارے واہ۔ عجیب نام ہے۔''

''چاند تارا۔ اس میں عجیب بات کیا ہے؟'' وہ شگفتگی سے بولا۔ میں تھوڑا سا جھینپی ضرور مگر اس سے شکست کھانا نہیں چاہتی تھی۔ سنجیدہ بن کر بولی۔

''یہ کیا پڑھ رہے ہیں آپ؟''

فزکس سے مغز مار رہا ہوں۔ میں انجینئرنگ کا طالب علم ہوں۔ میں بھی بہار کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا ہوں'' پھر یکا یک بولا۔

''کیا سچ مچ آپ کا نام ستارا ہے؟''

''جی ستارہ جبیں۔ لیکن یہی سوال اگر میں الٹا دوں؟''

''تو میں پھر بھی مہتاب علی ہی رہوں گا'' وہ ہنس پڑا۔ ''محترمہ یہ قسمت کے کھیل ہیں۔ کبھی کبھی چاند تارے زمین پر بھی اتر آتے ہیں۔ آج کی طرح''

''مگر مہتاب کے معنی چاند کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتے ہیں''

''مثلاً۔۔۔؟''

''مثلاً زربفت، شہ نشین اور۔۔۔ اور آتشبازی''

''آہاہا۔ آتشبازی۔ بڑا عبور ہے جناب کو اردو زبان پر؟''

''ناچیز اردو لٹریچر کی طالبہ ہے'' ذرا فخر سے میں نے کہا۔

''خوب ستارۂ صبح''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ میرا نام ستارہ جبیں ہے''

''ایک ہی بات ہے۔ مجھے صبح کا تارا اچھا لگتا ہے جو چاند کے سنگ ہوتا ہے، آج کی طرح۔'' میں جھینپ سی گئی۔ وہ سمجھ گیا اور بات بدل کر بولا۔

''دراصل مجھے صبح کا چمکیلا تارا بہت اچھا لگتا۔ صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو وہ میری کھڑکی کے عین سامنے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی چاند بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ کاش یہ ہمیشہ اکٹھے ہی رہیں۔ بہت اچھے لگتے ہیں''۔

''اوہ! بہت دیر ہوگئی میں چلوں گی'' میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی۔

''ارے! آپ کے لیے چائے منگواؤں؟'' اس نے جیسے مجھے روکنا چاہا۔

''جی نہیں شکریہ! میں اب جاؤں گی۔ ماموں اٹھ گئے ہوں گے اور مجھے نہ پاکر شاید پریشان ہو رہے ہوں گے''

''جی نہیں۔ وہ جان چکے ہوں گے۔ جائیگی کہاں۔ چاند کے سنگ ہوگی''

اس کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

''ارے بھئی حد ہے۔ آپ تو۔۔۔'' میں نے سنجیدہ سا منہ بنایا۔

''چلئے آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں'' اس نے فوراً بات بدل دی۔

''یہ آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟'' اس نے میرے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ابنِ انشاء کی شاعری۔۔۔''

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا۔۔۔ وہ گنگنانے لگا۔

''میں عجب تذبذب میں تھی، یہ مجھے بیوقوف بنا رہا ہے۔ مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا'' پچھتاوا میرا گھراؤ کرنے لگا۔ مگر وہ جیسے میرے دل میں اتر گیا تھا۔ گیٹ پر چھوڑ کے وہ واپس مڑ گیا۔ میں کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پلیا پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ میں تمام دن ماموں سے باتیں

کرتی رہی مگر میرا دھیان اسی کی طرف لگا رہا۔ اس کی جملے بازی مجھے محظوظ کرتی تھی اور اپنا بیوقوف بننے کا احساس کچوکے لگاتا تھا۔ شام کو میں اور ماموں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ وہ آ گیا۔ اسی طرح خوش باش مسکراتا ہوا۔ مجھے لگا جیسے گلاب کی کلیاں یکا یک کھل گئی ہوں۔

''آؤ آؤ بیٹا مہتاب کیسے ہو؟'' ماموں نے اس خوش آمدید کہا۔

''یہ میری بھانجی ہے ستارا'' انہوں نے میرا تعارف کرایا۔ ''چھٹیاں تھیں نا میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں''

''جی ہاں۔ صبح ملاقات ہوئی تھی'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''یہ سیر کر رہی تھیں''

''تم نے بتایا ہی نہیں۔'' ماموں نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس میں ایسی خاص بات کیا تھی ماموں جان؟ اور پھر ہمیں اپنی باتوں سے فرصت کب ملی۔'' میں جھینپ سی گئی۔

''بعض مرتبہ عام باتیں بھی خاص بن جاتی ہیں'' ماموں نے جیسے خود سے کہا۔

پھر آفتاب سے مخاطب ہو کر بولے۔

''تمہاری چھٹیاں کب تک ہیں؟''

''اب تو بس ہفتہ ہی باقی رہ گیا ہے'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ بتا رہی تھیں کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟''

''ہاں بیٹا۔ بس یہ تنہائی سب سے بڑی بیماری ہے۔ پھر ملک کے حالات ایسے دگرگوں ہیں کہ ہر احساس رکھنے والا آدمی پریشان ہی رہتا ہے۔ انسان انسان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہا ہے۔ کسی جگہ امان نہیں۔ خدا کے گھر پر حملہ، امام بارگاہ میں دھماکے، نہ چرچ محفوظ ہیں نہ مندر۔ بلکہ راہ چلتے لوگ بھی غیر محفوظ۔

''جی یہ تو ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کچہری پر حملہ ہوا۔ کتنے لوگ مارے گئے۔ جانے یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟'' وہ بولا۔

''انارکی پھیلانا۔ پاکستان کو تباہ کرنا'' ماموں نے کہا۔

''حکومت کیوں آخر بے بس ہے؟''

''میاں سب ملی بھگت ہے۔ ورنہ ان کی سرکوبی کیا مشکل ہے؟''

''ماموں جان خدا بھی شاید انہی کے ساتھ ہے۔ یا ڈھیل دے رہا ہے'' میں نے کہا۔

''تھر میں جو دو سو بچے بھوک سے مر گئے یہ قہرِ خدا نہیں کیا؟''

نہیں یہ بھی ریاست کی نااہلی ہے۔ جنہیں اپنی عیش و عشرت کے سوا کسی معاملے سے دلچسپی نہیں ہے۔ سندھ فیسٹیول پر کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ اپنی ناموری کے لیے ضائع کر دیتے ہیں مگر ملک کی ترقی اور خوشحالی سے بے نیاز ہیں۔ دوسرے ملکوں سے بھیک مانگتے ہیں اور اپنے اثاثے بڑھاتے ہیں'' پھر بولے ''تمہارے شہر میں تو امن و امان ہے نا؟''

''جی ہاں۔ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ اس ملک کا حصّہ ہے جو جل رہا ہے۔ ہر شام کوئی نہ کوئی تفریحی سرگرمی ہو رہی ہوتی ہے۔ کبھی بسنت منائی جا رہی ہوتی ہے اور کبھی محفلِ موسیقی منعقد ہو رہی ہوتی ہے۔ کبھی سیمینار اور کبھی کچھ اور۔''

''ہاں میاں نیرو بانسری بجا رہا ہے۔ محمد شاہ رنگیلے کی حکومت ہے۔ ویسے تو جو حکمران بھی آتا ہے ایک سے ایک بڑھ کر آتا ہے۔ پچھلے پینسٹھ برس سے یہی ڈرامہ ری پلے ہو رہا ہے۔ ماموں مایوسی سے بولے۔ باتیں کرتے مغرب ہو گئی۔ ماموں بولے۔

''لو تم لوگ گپ شپ کرو۔ میں چلا نماز پڑھنے'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میرا ہر دن مہتاب کے ساتھ طلوع ہوتا اور اسی کے ساتھ ڈوبتا۔ ماموں کبھی میری ایکٹوٹی پر معترض نہیں ہوئے۔ میں اور مہتاب لمبی لمبی سیریں کرتے۔ پہاڑیاں چڑھتے، گھاٹیاں اترتے، ڈھلوانوں پر پھسلتے، نالے کے شفاف پانی میں گھنٹوں پیر ڈبو کر بیٹھے رہتے۔ چلّو بھر بھر ایک دوسرے پر پھینکتے۔ وہ طلعت محمود اور کشور کمار کے گیت گاتا۔ اور معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتا جاتا۔ ایک دن اچانک بول اٹھا ''تارا یونیورسٹی جا کر تمہیں بہت مِس کروں گا''

''کیوں بھلا؟ ایسا کیا ہے؟'' میں انجان بن گئی۔

''تم مجھے یاد نہیں کرو گی؟''

''ہرگز نہیں'' میں نے اسے چڑانے کو کہا۔ اس نے مایوسانہ سا منہ بنایا تو میں ہنس پڑی۔ ''یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بچھڑ گیا ہو''

''یہ بات ہوئی نا''۔ وہ خوش ہو گیا۔

ایک ہفتہ جیسے پلک جھپکنے میں گزر گیا۔ میں جو ماموں کے ساتھ بادل ناخواستہ آنے پر راضی ہوئی تھی اب واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کاش وقت ٹھہر جاتا، کاش کالج کبھی نہ کھلتا یا چھٹیاں لمبی ہو جاتیں۔ مگر ایسا کچھ ممکن نہ تھا۔ امی میری واپسی کا تقاضہ کر رہی تھیں۔ ماموں امی سے فون پر کہہ رہے تھے۔

''آپا میں نے تمہاری بیٹی کے لیے رشتہ ڈھونڈ لیا ہے۔ بس امتحان سے فارغ ہوتے ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دیں گے''۔ ماموں بات امی سے کر رہے تھے مگر دیکھ مجھے رہے تھے۔ میں جھینپ کر وہاں سے ٹل گئی۔ جی چاہتا تھا کہ ماموں کی گفتگو اسے سناؤں مگر ہمت نہ پڑی اور میں چپ چاپ اپنے گھر چلی آئی۔ چلتے ہوئے اس نے ایک بند لفافہ دیا۔ کہنے لگا گھر جا کر کھولنا۔

لفافے میں اس کی تصویر تھی۔ لکھا تھا ''تمہاری یاد کے ساتھ'' مہتاب علی۔ پھر شعر درج تھا:

دمِ رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

(تارا کی)

''اف اللہ! شرارتی کہیں کا۔ میں نے تصویر کو چوم لیا۔

اس کے ساتھ گزرے لمحات میرے لیے سرمایۂ جاں بن گئے تھے۔ ہماری آپس میں میچنگ ہوتی۔ ہر روز دو تین کالز بھی ہو جاتیں۔ ہم شدت سے گرمیوں کی تعطیلات کے منتظر تھے۔ ایک دن خبر آئی۔ انجینئرنگ یونیورسٹی پر خودکش حملہ ہو گیا ہے۔ میں کالج سے آ کر کھڑی ہی ہوئی تھی۔ کتابیں میرے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ تبھی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ لپک کے میں نے فون اٹھایا۔ ماموں کی کال تھی میں سہم گئی۔

''خبر سنی بیٹا تم نے؟'' وہ کہہ رہے تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''جی ماموں۔۔۔!'' آواز بمشکل میرے حلق سے برآمد ہوئی۔

شہر کے صدر مقام پر دھماکہ ہوا ہے، سنا ہے کئی درجن بے گناہ انسان مارے گئے ہیں۔ پہلے متاثرہ مارکیٹ، آہستہ آہستہ پورا شہر مرنے والوں کے سوگ میں بند ہو گیا ہے۔ حادثہ کی جگہ سے خودکش بمبار کا سر دستیاب ہوا ہے۔

اس کے بعد ماموں جان خدا جانے کس قسم کی کڑوی کسیلی گولیاں چاندی کے ورق میں لپیٹ کر میری جانب اُچھالتے رہے، میں مگر اپنی جگہ ساکت و جامد پتھر کا بُت بنی کھڑی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی سلامتی پر خوشی کے گیت گاؤں، اپنے ارمانوں کے خون کا ماتم کروں، بے گناہ مرنے والوں کا سوگ مناؤں۔۔۔یا۔۔۔!!

نظیرِ ثانی

﴿اشک امرتسری﴾

اشکؔ اقبالؔ اور جوشؔ جیسے شاعروں کے بعد آئے مگر ان کی شاعری نے ان کے فلسفیانہ تعمق اور گھن گرج سے ہٹ کر نئی راہ نکالی اور اسی راہ سے وہ نظیرؔ تک پہنچے۔ موضوع کے انتخاب میں بھی وہ ستاروں پر کمند نہیں ڈالتے بلکہ سامنے کی روزمرّہ کی چیزوں پر نظیرؔ کی طرح غور بھی کرتے ہیں اور انہی کی طرح اُن سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا دور نظیرؔ کا دور نہیں تھا مگر انہیں اپنے دور سے نظیرؔ کی سی نظر ضرور ملی۔

اشکؔ کی شاعری میں اور کچھ ہو یا نہ ایک اپنا پن ضرور ہے۔ گو اس میں ان کی عصری رجحانات بھی جا بجا دخیل ہو گئے ہیں جن کی بنا پر بیانیہ عناصر بھی غالب آ جاتے ہیں مگر اپنے زمانے کی نچلے طبقے کی زندگی کی کڑوی سچائیوں کو ماتھے پر شکن لائے بغیر وہ جس طرح اپنے شعری مزاج میں ڈھال لیتے ہیں اس کی جسارت ان کے ہم عصروں میں سے کسی اور نے شاید ہی کی ہو۔ دو ایک مثالیں جوشؔ کی نظیرؔ کی تقلید میں کہی ہوئی نظموں میں البتہ مل جاتی ہیں مگر جس استقلال اور تواتر کے ساتھ اشکؔ نے نظیرؔ ی رنگ کو اپنایا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔

مدتوں بعد اشکؔ پر توجہ کی گئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر معصوم شرقیؔ نے اس طویل خاموشی کو زبان دی اور کم سے کم اشکؔ شناسی کی ابتدا تو کی۔ اس سے اشکؔ کو تھوڑی بہت اہمیت حاصل ہو گی اور اشکؔ شناسی میں مدد ملے گی۔ ان کا مرتبہ متعین کرنے کا کام بھی آسان ہو گا۔ ڈاکٹر معصومؔ شرقی نے اپنے مقالے کے ساتھ ان کے کلام کا بھی بڑا حصّہ شامل کر لیا ہے اس سے اشکؔ کی شاعری کے مختلف رنگوں کو سمجھنے میں مزید اعانت ہو گی۔

ڈاکٹر محمد حسن

وزرائے اعظم کا مشاعرہ

وزیرِ اعظم برطانیہ مسٹر ایبٹی

سراسر تجارت تھا میرا وجود
مگر اصل باقی ہے اب اور نہ سود

سبھی جانتے ہیں کہ دنیا میں تھی
میری سلطنت بے نیازِ حدود

کبھی رونقِ بزمِ عالم تھا میں
مگر آج ہوں شمعِ کشتہ کا دود

گیا میرے قبضہ سے ہندوستاں
ہوا مجھ پہ طاری سکوت و جمود

''ٹرومین'' کے سائے میں پلتا ہوں میں
نہ کیوں اس پہ بھیجوں سلام و درود

بڑوں میں ابھی تک ہے میرا شمار
کہ باقی ہے ذوقِ ظہور و نمود

ابھی تک ہوں وقفِ نگہ و ناز میں
کہ پھر ہوں میسّر شراب و سرود

سجاؤں گا پھر بزمِ عیش و نشاط
جلاؤں گا پھر عنبر و مشک و عُود

(اشکؔ امرتسری)

اندھے چاند کی صدا

رخسانہ صولت
(اسلام آباد)

اُداس راتوں کی سرد چاندنی میں جب تھکا تھکا سمندر بے چین موجوں کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کرنے لگے۔ تو یہ کائنات تھرتھرا سی جاتی ہے۔ آسمان پر چاند بھی گھبرا کر بدلیوں کی گود ڈھونڈنے لگتا ہے۔ تو اس سمے میرا جی چاہتا ہے کہ کاش میں بھی اس بے چین سمندر کے سینے پر مچلتی تڑپتی ایک لہر ہوتی۔ جو چاند کے جوبن کو چھو لینے کی چاہ میں ساحل کے کنارے چاٹ چاٹ کر امر ہو جاتی۔

پھر مجھے خود ہی ہنسی آ گئی میں بھی کیا بچوں والی سوچ لیے پھرتی ہوں۔ ایسا بھی بھلا کبھی ممکن ہوتا ہے۔ پھر خیال آتا۔ ہوں۔ آخر کیا چیز ممکن نہیں۔ صرف کوشش ہونی چاہیے کوشش سے انسان اپنی قسمت کا پانسہ پلٹ سکتا ہے۔

اور اس سمے ماں کو شاید میری سوچوں کی دستک سنائی دے گئی۔ وہ بھاگی بھاگی میرے کمرے میں آ گئی۔

تجھے لاکھ بار کہا ہے کہ اپنی رٹ چھوڑ دے۔ اگر انسان صرف کوشش سے قسمت کا لکھا بدل سکتا تو آج کوئی شخص نہ امیر ہوتا اور نہ غریب۔ کوئی باپ اپنی بیٹی کے گھر کے اجڑنے کا تماشہ نہ دیکھا کرتا اور کوئی ماں سہاگ کی پہلی رات سے ہی اپنی کوکھ میں سر اٹھانے والے کیڑے کے مستقبل کو اپنی اوڑھنی نہ بنا لیا کرتی۔ مگر۔ مگر!

ماں نے اپنی آواز کی جھلاہٹ کو خود ہی جھٹک ڈالا۔ یہ لڑکی تو اپنی الگ ہی دنیا لئے پھرتی ہے۔ لاکھ بار کہا ہے کہ تو انسانوں کی دنیا میں رہ۔ جیتے جاگتے انسانوں کی یہ دنیا! جہاں جانور دودھ دیتے ہیں۔ جن کا ہم گوشت کھاتے ہیں۔ ان کی کھال کے جوتے پہنتے ہیں۔ درختوں کی لکڑی سے اپنے اندھیرے گھروں میں روشنی دیتے ہیں۔

یہ دنیا! ہاں جہاں انسان آنکھ کھولتے ہی زندگی کے عمل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اور پھر کوشش سے ہی انسان صرف وہ حاصل کرتا ہے جو اس کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر تو سامنے پڑی روٹی بھی منہ کے اندر نہیں جاتی۔ اس کے لئے بھی ہاتھوں کو کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اماں! اب بس بھی کرو۔ کچھ اور بھی باقی رہ گیا ہے۔ میں سب جانتی ہوں کہ کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا وہ انسان کا مقدر بن گیا۔ مگر پھر آج یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ ملک در ملک دکھ افلاس اور آگ نے انسانوں کے مقدر کیوں جھلسا ڈالے۔ ان کا تو کوئی اور خدا نہیں۔ پیدا ہوتے بچے کی آنکھیں پہلی بار جب کھلتی ہیں تو گولہ بارود کی بساند سے اٹی ہوا اور چاندنی اس کی آنکھوں کو جلا ڈالتی ہے۔ کیا یہ بھی کاتب تقدیر نے نوزائیدہ روحوں کے لئے لکھ دیا تھا۔

اور ماں سنجیدگی سے کہتی ہے۔ ہاں بیٹی! ایسا ہی سمجھ لو۔ انسان اپنی عقل کے بل پر خدا کی قدرت کو للکار رہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ترقی کا زینہ چڑھتے چڑھتے وہ ایک دن پہلے آسمان پر پہنچ ہی جائے گا۔ اور جب کبھی ایسا ہو گیا تو انسان کے ظلم کی انتہاء ہو جائے گی۔

میں نے آگے بڑھ کر ماں کے ہونٹوں پر ابلتے لفظوں کو دبا دیا۔ نہیں ماں ایسا نہ کہو۔ انسان کو اپنی حدود کا علم ہے۔ پہلے آسمان تک اس کی اڑان کھربوں برس گزرنے کے بعد بھی اس خواب کی مانند ہوگی جو آنکھ کھلتے ہی کرچیوں میں بدل جاتے ہیں۔

ماں نے دکھ اور کرب سے جھلتی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شاید ماں کو مجھ سے زیادہ ہی دکھ پہنچا تھا۔ مگر شائد وہ سچ ہی کہتی ہے۔

مجھے بعض اوقات ماں کی آواز میں ساری دنیا کی ان ماؤں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جن کے بچے جن کے سہاگ بہنوں کے بھائی لحہ لحہ بھڑکتی آگ کی نذر ہو جاتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ دنیا کائنات اور زندگی صرف گولہ بارود جنگ' آگ اور شعلوں سے لپٹا ملگجا دھواں ہی تو ہے۔ وہ بدبودار تعفن سے اٹی فضا میں جنم لیتے ہیں اور بھوک کے پیٹ کو اندھن مہیا کرنے کے لیے جب گھروں سے باہر نکلتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں بندوقیں گولیاں اور ایسے مہلک ہتھیار تھما دیئے جاتے ہیں اور ان کا ذہن اس طرح صاف کر دیا جاتا ہے کہ پھر ان میں بھوک زندگی' محبت کا کوئی احساس نہیں جاگتا۔ ان کے دل دھڑکنا بھول جاتے ہیں اور انسانی رشتوں کی ہر قدر بے جان ہو کر ان کے قدموں سے لپٹ جاتی ہے۔ جس کا انہیں احساس بھی نہیں ہو پاتا۔

مجھے اماں کا خیال بری طرح ستاتا رہتا ہے۔ یہ ماں جو مقدس بھی ہے۔ اور پوتر بھی جس کی محبت امر بھی ہے اور ابد بھی۔ پھر میں کیسے ماں کی سوچ بدل سکتی ہوں ماں بھی اپنی جگہ وہ سچ بولتی ہے جس کا ہم میں حوصلہ نہیں مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میرا گھر بھی زمین کی طرح گردش میں رہتا ہے ایک زمانہ تھا کہ یہ سورج کے روشن حصے کے سامنے آ گیا تھا۔ تب ہمارے گھر میں بڑی زندگی تھی۔ توانائی تھی سب کے چہرے شاداب نظر آتے تھے۔ میرا باپ جو عمر کے اعتبار سے اب جوانی میں بھی بوڑھا نظر آنے لگا ہے دمکتے چہرے اور مضبوط قد کاٹھ والا نا قابل تسخیر شخص تھا۔ اس نے اپنے گھر کو مہکتے پھولوں سے بسا رکھا تھا۔ میرے دو بھائی جو مجھ سے بڑے تھے اپنے باپ کے ساتھ گھر کے لان میں ہر شام پابندی کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ مجھے ٹیبل ٹینس کھیلنے کا شوق تھا۔ جو میں اپنی ماں کے ساتھ اس وقت کھیلا کرتی تھی جب وہ باورچی خانے سے فارغ ہوتی اور میرے چہرے پر پھیلی زردی اس کو بتا دیتی کہ ان کی ایک ہی بیٹی جو بلوغت کی سڑھیوں پر کھڑی ہے۔ اس کو کسی ساتھی کی ضرورت ہے وہ تنہائی سے لڑ لڑ کر تھکی جا

رہی ہے۔تو میری ماں کی عقل اس کو گدگدی کرتی اور وہ ریکٹ اٹھا کر مجھ سے کھیلنا شروع کر دیتی۔کھیلتے کھیلتے جب میں کوئی غلط شارٹ مارتی تو ماں ریکٹ پکڑ لیتی اور پھر مجھے ایک غلطی درست کرنے کے لیے پانچ بار موقع دیتی اور یوں میرے زندگی کے اصول مرتب ہوتے گئے۔میرا باپ جو ذہنی اعتبار سے میری ماں سے بھی زیادہ تیز تھا۔اپنے بچوں کو ہمیشہ یہ نصیحت کیا کرتا کہ دیکھو! تم نے کبھی سوچا ہے کہ میں ہر شام کیوں تم لوگوں کے ساتھ کھیلتا ہوں۔یہ بیڈمنٹن کی چڑیا ہے نا۔یہ زندگی کی علامت ہے اور یہ کورٹ دنیا کا وہ تصور ہے جس میں حالات کے ریکٹ زندگی کو اچھالتے رہتے ہیں۔میں تمہیں مسلسل پریکٹس میں رکھ کر آنے والے دنوں کے لیے مضبوط بنا رہا ہوں۔کہ حالات کے بہاؤ میں تم اپنا توازن قائم رکھ سکو میں آج بھی سوچتی ہوں میرے باپ نے کتنی عقل مندی کی بات کہی تھی وہ آج بھی شاید زیادہ دانائی کی باتیں کر سکتا ہے مگر اس کو سننے والا کوئی نہیں۔

ہاں تو میں نے کہا تھا۔نا۔کہ میرا گھر بھی اب زمین کی طرح گردش میں رہتا ہے یہ بھی اپنے مدار میں گھوم رہا ہے مگر اب اس کا رخ سورج کی تمازت کے سامنے نہیں۔شاید اب کسی اور طرف ہے جہاں سے ہمارے گھر کے آنگن میں سورج کی کوئی کرن نہیں آتی۔مگر پھیپھڑوں کے اندر زہریلی بدبو سے لتھڑی ہوئی ہوا جاتی ہے۔بادلوں سے لہو کی بوندوں کے ساتھ گوشت کی کٹی پھٹی جلی ہوئی بوٹیاں برستی ہیں میں نے اپنی مذہبی کتاب میں پڑھا تھا کہ بارش تو رحمت ہے۔بارش جو زندگی کی علامت ہے کی بوند پڑتے ہی زمین نہال ہو جاتی ہے۔اناج اُگاتی ہے مگر یہ کیسی بارش ہے جو اناج اگانے کے بجائے کھیتیاں اجاڑتی ہے۔گھر جلاتی ہے اور ہر شام نہ جانے کتنے گھر قبرستان بن جاتے ہی۔

میں نے کہا تھا نا۔کہ میرا باپ بہت ذہین آدمی تھا اور اب بھی ہے۔میری ماں بہت دور اندیش خاتون تھی اور وہ اپنی بیٹی کے اکلاپے سے بہت ڈرتی تھی مگر۔مگر۔میں نے بتایا تھا نا کہ میرا گھر بھی سیارہ بن چکا ہے اور گردش میں رہتا ہے میرے ماں باپ کا میرے بھائیوں کا کوئی قصور نہیں وہ اب بھی بہت ذہین ہیں یہ تو حالات کا گھن چکر ہے جو کبھی کسی جزیرے میں لے جاتا ہے اور کبھی سمندروں کے سینے پر تڑپتے بے کراں پانی کی وسعتوں میں آگ لگا دیتا ہے اور کبھی ہمارے گھر کے چراغوں کو اندھا کر دیتا ہے میں پھر کیوں نہ یہ کہوں کہ کوشش انسان کی تقدیر بدل سکتی ہے مگر ماں یہی کہتی ہے کہ غلط سوچتی ہوں۔

شائد ہم دونوں غلط سوچتی ہیں۔یا پھر شائد ہم دونوں سہی سوچتی ہیں۔میرا باپ بھی صحیح سوچتا ہے۔بلکہ شاید ہم صحیح اور غلط کی تمیز کرنے کی صلاحیت ہی کھو چکے ہیں۔تب ہی تو میرا باپ سارا دن برآمدے میں بیٹھا اپنے سفید بالوں کی ٹوپی کے ساتھ آنکھوں پر چشمہ چڑھائے اخبار میں وہ خبریں پڑھتا رہتا ہے جو دنیا کے ہر حصے میں جنگی جنون کو ظاہر کرتی ہیں اور میری ماں اب ٹیبل ٹینس کے ریکٹ سے سارا دن برآمدے میں بھنبھنانے والی مکھیوں کو مارتی رہتی ہے۔وہ کہتی ہے کہ مکھیاں گندگی پھیلاتی ہیں پہلے ہمارا گھر صاف رہتا تھا۔ہم کھیلتے تھے تندرست تھے۔خوش تھے اب گھر سے زندگی کی بشاشت بوسیدگی نے لے لی ہے۔مکھیاں کیوں نہ آئیں ماحول ہی بیمار ہو تو سب کچھ ممکن ہے میرے دونوں بھائی بھی بولائے بولائے پھرتے ہیں۔مجھے اپنے گھر میں ایک دنیا نظر آتی ہے مشرق مغرب اور شمال جنوب کی چاروں سمتیں ایک جگہ سمٹی نظر آتی ہیں۔میں سوچتی ہوں کہ واقعی ہم نے چاہا تھا۔

مگر ماں نے ٹھیک کہا تھا۔انسان اتنا بے بس ہے کہ خود اپنی لگام اس کے ہاتھ میں نہیں۔پھر کیسے نہ قدرت کی اٹل حقیقت پر یقین کریں۔

میں سوچتی ہوں۔میری طرح وہ ہزاروں لاکھوں لڑکیاں بچے بوڑھے شائد یہی سوچتے ہیں کہ جو میں سوچتی ہوں اپنا گھر تو کوئی بھی نہیں ہوتا میرا گھر جسے میں اپنا کہتی تھی۔وہ بھی میرا نہیں ایک چکراتا سیارہ ہے۔جو کسی ایک کی ملکیت نہیں پھر زندگی کب ہماری رہی یہ نہ کبھی تھی۔اور نہ ہوگی۔

بے چارے ہم لوگ کتنے بھولے ہیں اس زندگی کے لیے مرتے ہیں لڑتے ہی اور خوشیوں کی خریداری کرتے ہیں۔مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ اس زندگی کا ایک لمحہ بھی ان کو نصیب نہیں۔وہ تو شائد بہت خوش قسمت لوگ ہونگے جن کو اپنی زندگی سے چند لمحے چرانے کا موقع ملتا ہوگا۔ورنہ میری طرح ہزاروں لاکھوں لوگ یونہی سوچتے ہونگے کہ شاید کبھی ہم اس زندگی کو اپنا کہہ سکیں۔مگر نہیں! میں پھر بھول جاتی ہوں کہ میں تو ایک سیارے میں ہوں۔جہاں بدبو سے اٹی زہریلی ہوا ہے جہاں لہو اور بوٹیاں برساتی بارش ہے اور جہاں کوئی زندگی نہیں۔پھر یہاں کیسے تازہ ہوا کا گزر ہو۔اس لیے کہ یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔کوئی راستہ نہیں اور پھر گھر جب سیارہ بن جائے تو اس کا کوئی راستہ نہیں رہتا مگر میں کہتی ہوں کہ کہیں نہ کہیں ایک راستہ ضرور ہوگا۔جس کا پتہ ہم میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم۔

دنیا کی طویل ترین نظم

مفصل، مستند اور معتبر

منظوم تاریخ پاکستان و ہندوستان

محمد بن قاسم سے ضیاء الحق تک

حماسہ

نقشبند قمر نقوی بخاری

کا بے مثال تاریخی، ادبی اور شعری شاہکار

اللہ کی زمین

نیلم احمد بشیر (لاہور)

دشوار گذار پہاڑی سلسلوں کے بیچوں بیچ انہوں نے اپنا خفیہ ٹھکانہ، اپنی پناہ گاہ بنا رکھی تھی۔ وہ اپنے ہر اس شکار کو یہیں لے کر آتے جسے اغوا کرنے کے بعد انہیں ایک موٹی رقم مل سکتی تھی۔ ان کی دہشت کو للکارنے کا کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ اغوا شدہ افراد میں، اس علاقے میں کام کرنے والی غیر ملکی انجینئرز، امریکن ڈپلومیٹ، ملک کے مشہور بزنس مین اور سیاستدانوں کے بیٹے سبھی شامل رہتے۔ ان سب کو اس غیر آباد، سنسان پتھریلے علاقے میں لایا جاتا اور مہینوں، کبھی کبھار سالوں تک چھپا کر رکھا جاتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ ان کے لوگ کہاں روپوش اور کہاں کھو گئے ہیں۔ پہاڑ چپ چاپ دم سادھے یہ سب دیکھتے رہتے اور ہوائیں ہولے ہولے قدم بڑھاتیں سسکیاں لیتی رہتیں۔ وہاں دس پندرہ افراد کا مستقل قیام تھا مگر نئے لوگوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا۔ کبھی کبھار کوئی موت کا سیاہ پرندہ ادھر آ دھمکتا تو ان پر چپکے سے تباہی برسانے کی کوشش ضرور کرتا مگر وہ کبھی ختم نہ ہوتے۔ خودرو کھُمبیوں کی طرح پھر سے اُگ آتے کیونکہ اس وادی کے متضاد ان کی مائیں زرخیز اور ہری بھری تھیں۔ دس دس بیٹے جنما کرنئی سے نئی کُمک پہنچانے میں جُٹی رہتیں۔ یوں ان کی نفری کبھی کم نہ ہوتی، بڑھتی ہی چلی جاتی۔

وہاں ہر عمر کے لوگ رہتے تھے مگر نوجوان لڑکوں کو خصوصی طور پر خودکش بمبار بنانے کی تربیت دی جاتی۔ انہیں اچھے اچھے نصیحت آموز سبق اور مثالیں دی جاتیں۔ انہیں بتایا جاتا کہ وہ ایک عظیم کارنامہ سرانجام دینے جا رہے ہیں۔ اسلام دشمنوں کو ختم کرنا ان کی زندگی کا اہم ترین مشن ثابت ہوگا۔ کمانڈر ان سے کہتے۔۔۔ ''اسلام کے فرزندو۔۔۔ یاد رکھنا، بٹن دباتے وقت اپنے سروں کو نیچے رکھنا، ٹھوڑیاں دل کو چھو رہی ہوں۔ اس سے ایک تو یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوۂ مبارک تمہیں دکھائی دے گا دوسرا یہ کہ سر کٹ کر علیحدہ نہیں ہوگا اور یوں تمہیں شناخت نہیں کیا جا سکے گا۔۔۔ حملہ کرتے ہی جنت کے دروازے تم پر نہایت کھلتے چلے جائیں گے۔۔۔ خوبرو حُوریں درجنوں کے حساب سے تمہیں خوش آمدید کہہ کر آغوش میں لے لیں گی اور تم ایک ابدی پاکیزہ زندگی گزارنے کے اہل قرار پاؤ گے۔۔۔''

اس پناہ گاہ میں قیام پذیر لوگ بڑی خوش و خرم زندگی گذار رہے تھے۔ یہ گھر ان کے گھروں سے لاکھ درجے بہتر تھا جہاں بے شمار افراد خانہ ہونے کے باعث انہیں نہ کبھی ڈھنگ کی روٹی نصیب ہوتی تھی نہ کوئی نیا کپڑا جوتا۔ ماں باپ غربت اور مسائل کی وجہ سے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے اور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔

یہاں بہت مزے تھے۔ کھانے کو دنبے، مرغے کا گوشت، نئے نئے کپڑے، امریکن فوجیوں کی لاشوں سے اتارے ہوئے ڈیزائن جوگرز، مضبوط جوتے، سبز جیکٹیں، کاندھے سے لٹکانے والے بیگ ملتے تو بہت اچھا لگتا۔ نہ ماں باپ کی جھِک جھِک نہ بک بک، نہ روک نہ ٹوک۔ روز نئی نئی بندوقیں، اسلحہ ملتا تو طاقت کے نشے سے بدن سرشار ہو جاتا اور انگلیاں اسلام دشمن عناصر کی گردنیں کاٹنے کو مچلنے لگتیں۔

کمانڈر چاچا لڑکوں کی مذہبی، روحانی، جسمانی، اخلاقی ہر طرح کی تربیت کو اہم سمجھتے تھے۔ پانچ وقت باقاعدگی سے باجماعت نماز پڑھوائی اور رمضان کے روزے رکھوائے جاتے۔ بچے بعد از فجر کلامِ پاک کی ایسی میٹھی تلاوت کرتے کہ بازگشت سے سنگلاخ پہاڑوں کے دل موم ہو جاتے۔ ہوائیں ورد کرتے کرتے جھوم اٹھتیں اور وجد میں آ کر ناچنے لگتیں۔

''اللہ کے سپاہیو۔۔۔ سنو۔۔۔ تم نے معاشرے سے بدی اور بدلوگوں کو ختم کرنا ہے انہیں راہِ براست پر لانا ہے یہ دنیا بُرے لوگوں سے بھری پڑی ہے مگر ہم ایک مقدس جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہر اس شخص کو زندگی سے نجات دلوا دیں جو اللہ کے احکام کی پابندی سے گریز کرنے کی جرأت رکھتا ہو۔ مگر یہ بھی یاد رہے اللہ بڑا مہربان، ربّ العالمین ہے۔۔۔ کمزور اور بے بس کو تحفظ دینا بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔۔۔ اللہ کی ہر تخلیق قابلِ عزت اور محبت ہے۔۔۔ یہ سبق کبھی نہ بھولنا'' بچے یہ سن کر تائید میں سر ہلاتے تو کمانڈر چاچا کا سینہ چوڑا ہو جاتا۔ خوش ہو کر وہ ایک دو اور فائر کرنے کی اجازت دے دیتے۔ بچے ہوائی فائر کر کے دل بہلاتے اور آپس میں خرمستیاں کرنے لگتے۔ مزے کا سماں ہوتا۔

ایک صبح یونہی بچے کھیل کود رہے تھے کہ ایک لڑکے کو ایک خوبصورت نظارہ دکھائی دیا۔ دو ننھی ننھی پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت سی سبز، تر و تازہ جھاڑی اُگ آئی تھی جس پر ٹکے ننھے ننھے سفید دلکش پھول صبح کی پاکیزہ ہوا سے اٹھکیلیاں کرتے، ہنس ہنس دہرے ہوتے جا رہے تھے۔

ایک بچے نے ہاتھ بڑھا کر انہیں توڑنا چاہا تو کمانڈر چاچا نے زور سے اس کی انگلیوں پر ایک چھڑی رسید کی۔۔۔ ''پاگل ہوئے ہو کیا؟ پھولوں کو جھاڑی سے توڑ رہے ہو؟ بچوں کو اپنی ماں سے جدا کر رہے ہو؟ خبردار جو ایسا کبھی سوچا بھی۔۔۔ بچو یہ سوچو یہ خدا کی نرم و نازک خوبصورت، پیاری تخلیق ہے۔ اسے خراب کیا تو اللہ ہم سے ناراض ہو جائے گا۔ یہ کملا گئے تو اللہ ہم سے اپنی رحمتیں چھین لے گا۔۔۔ یہ زمین اللہ کی ہے اور یہ پھول زمین کی زیبائش ہیں۔۔۔ سجاوٹ ہیں۔۔۔ انہیں یونہی کھلنے دو۔۔۔ سمجھے؟''

''جی چاچا۔۔۔ بچوں نے سر جھکا کر مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ اور اپنی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہونے والے نماز کی جانب چل دیئے۔

دولڑکے شہباز خاں اور گلریز بخت کمانڈر چاچا کو خصوصی طور پر پسند تھے۔ ابھی چودہ برس کے پورے بھی نہیں ہوئے تھے مگر کلاشنکوف چلانے اور گردنیں کاٹنے میں مکمل مہارت حاصل کر چکے تھے۔ کمانڈر چاچا کی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھتے، ان کا ہر حکم بجا لیتے تو چاچا انہیں بہت محبت دیتے اور رات کو بھی اپنے ہی ساتھ سلا

لیتے تھے۔ دوسرے کمانڈر بھی ان دونوں لڑکوں کے کام، جرأت، فرمانبرداری، چُستی، مشاقی سے بہت خوش تھے۔ انہیں پوری امید تھی کہ یہ دنوں ہونہار سپوت، بڑے کامیاب خودکش بمبار بنیں گے، بدلوگوں کی صفوں کی صفیں اڑادیں گے اور یوں اسلام کا بول بالا ہوگا۔

کبھی کبھار ان سب کی پرسکون، دلفریب زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما ہوجاتا کہ سکھ چین غارت ہوکر رہ جاتا۔ چند روز قبل وہ ایک شخص کو اغوا کر کے وہاں لائے تھے۔ اُسے کھانا پینا، بستر، کپڑے سب کچھ دیا گیا، بس آنکھوں پر پٹی اور پاؤں میں زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ اس نرمی کے باوجود وہ بے صبرا شخص چیخم چہاڑ مچائے ہوئے تھے۔ ہر وقت ہزیانی انداز میں چیخیں مارتا رہتا اور ماحول کو خراب کر کے رکھ دیتا۔ اُس کے واویلے سے سبھی کو کوفت ہورہی تھی۔

''یارا اس بدبخت کو آخر تکلیف کیا ہے؟ کیا کھانا نہیں مل رہا؟ اتنا غُل مچاتا ہے کہ طبیعت خراب ہوکر رہ جاتی ہے'' کمانڈر افضل نے دوسرے کمانڈر سکندر سے چڑ کر شکوہ کیا۔

''بھائی صاحب آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کل رات تو اس سالے خنزیر کے بچے کی چیخوں کی وجہ سے میں سو ہی نہیں سکا۔ اس بزدل کے بچے کو سمجھانا پڑے گا کہ یوں شور نہ کرے۔۔۔ ہم تنگ ہوتے ہیں۔'' کمانڈر افضل نے گلریز اور شہباز کو اشارہ کیا تو بھاگے چلے آئے اور اس شخص کے منہ پر دو چانٹے رسید کیے وہ مزید بلک بلک کر رونے لگا۔ بچوں نے خاص قسم کے ہتھوڑے اور پلاس نکالے اور بزدل کے بچے کے ہاتھوں پر مار کر اس کی ہڈیاں توڑنا شروع کردیں۔۔۔ بے صبرا مزید بلبلانے لگا اور درد کی شدت سے دہرا ہوکر زمین پر گر گیا۔ کمانڈر چاچا اور ان کے طالب علم بے ساختہ قہقہے لگانے لگے۔

''اوے۔۔۔ اگر تیرے دل میں ایمان کی طاقت ہوتی تو یوں کمزور نہ پڑتا۔۔۔ لگتا ہے تو نے اپنی ماں کا نہیں کسی بوتل سے دودھ پیا ہے اسی لیے زنانیوں کی طرح چیخیں مارتا ہے۔۔۔'' مغوی شخص کے اردگرد طنزوں اور طعنوں کے تیر برسنے لگے۔ تھوڑی دیر میں تھک ہار کر سبھی روٹی کھانے بیٹھ گئے اور خوش گپیاں شروع ہو گئیں۔ شام ڈھل رہی تھی۔ نمازیں پڑھ کر سبھی دراز ہوگئے اور پہاڑوں میں سناٹا چھا گیا۔ بزدل شاید ہوش کھو چکا تھا کیونکہ اس کے منہ سے سسکیوں کے علاوہ اب کراہنے کی آواز بھی نکلنے لگی تھی۔

مغوی کچھ کچھ ہوش میں آنے لگا تھا۔ اس نے اپنے گلے کی پوری طاقت سے چلانا اور کراہنا شروع کردیا جس سے چائے ناشتہ کرتے ہوئے کمانڈران کو بہت کوفت محسوس ہوئی۔ نماز کے لیے وضو کی کُلیاں کرتے ہی انہوں نے لڑکوں کو کچھ مخصوص اشارے کیے اور زنجیروں میں بندھے ہوئے شخص کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑے ہوگئے۔ گُو اور پیشاب میں سنا ہوا شخص ایک کریہہ منظر پیش کررہا تھا اسے دیکھ کر سبھی کی طبیعت مالش ہونے لگی۔

''ابھی تو اس خنزیر کے بچے کے وارثوں کو ہمارا پہلا فون بھی نہیں گیا، تاوان کی رقم بھی طے نہیں ہوئی اور اس نے ہمارا جینا محال کردیا ہے۔ بزدل کا بچہ۔۔۔ کسی بکری کا جنا'' کمانڈر افضل نے اس کے پیٹ میں ایک زوردار لات رسید کی اور چھری لے کر بکری کے دودھ کے پلے ہوئے کے گلے پر پھیرنا شروع کردی۔ بچوں نے آگے بڑھ کر چاچا کی مدد کی اور گردن کو مکمل ماہرانہ صفائی سے کاٹ کر سر سے علیحدہ کر دیا۔ ایسے موقعوں پر ریکارڈ قائم کرنے اور رکھنے کے لیے جو وڈیو بنائی جاتی تھی۔۔۔ وہ بھی ذوق شوق سے بنالی گئی۔ ایسی وڈیوز کو بعد میں میڈیا میں بھیج کر اور فیس بک پر اپ لوڈ کرنے کا ایک اور ہی لُطف ہے۔۔۔ بڑی دہشت قائم ہوجاتی ہے۔

''چلو خلاصی ہوئی۔۔۔ اب کم از کم ہم رات کو سکون سے سو تو سکیں گے۔ ایک بولا تو سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

اچھا میں تھک گیا ہوں۔۔۔ کمانڈر نے چھری کو پانی سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا آرام کرنے لگا ہوں۔ جاؤ بچو۔۔۔ تم لوگ کچھ دیر کے لیے باہر کھیلو کودو، مگر ادھر گھر سے زیادہ دور نہیں جانا۔۔۔ ٹھیک! گھر کے پاس رہنا۔۔۔'' چاچا نے بڑے پیار سے بچوں کو ہدایات دیں۔

''چاچا ہمیں فٹ بال کھیلنا ہے۔۔۔ اسے لے جائیں؟'' بچوں نے کٹے ہوئے تازہ تازہ سر کی طرف اشارہ کیا جو اُس مہرے پر تھا۔ جس پر جڑی دو حیراں آنکھیں اپنے اردگرد کے ماحول کو مستقل گھورے چلی جارہی تھیں جن سے کروڑوں سلگتے ہوئے سوال ابل ابل کر کیڑے مکوڑوں کی طرح باہر کو نکلتے ادھر اُدھر بھاگتے نظر آتے تھے۔ ''کیوں کیوں کیوں؟'' کی صدائیں بنجر پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر ماحول میں ارتعاش پیدا کررہی تھیں۔ آنکھوں کو کوئی جواب نہ مل رہا تھا۔ آنکھیں لاجواب ہوتی چلی جارہی تھیں۔

بچے کافی دیر فٹ بال سے کھیلتے رہے۔ پھر تھک گئے۔۔۔ پہاڑوں میں اوپر نیچے بھاگتے بھاگتے ان کے کپڑے جوتے میلے ہوگئے جن پر اب کہیں کہیں خون بھی لگا نظر آرہا تھا مگر خون بھی تو محض ایک رنگ ہی تھا۔۔۔ کبھی کبھی یہ سرخ سے سفید بھی ہوجاتا ہے۔

''بچو۔۔۔ صفائی نصف ایمان ہے۔۔۔ آپ لوگ اب نہائیں۔۔۔ پاک صاف ہوں اور پھر نماز پڑھ کر سونے سے پہلے ذکر الٰہی کا ورد کرنے کی تیاری کریں۔'' ایک اور نگران نے بچوں کو اگلی ہدایات جاری کیں اور خود مصلّی بچھا کر تسبیح ہاتھ میں تھام لی۔

بچے نہادھو کر صاف ستھرے ہوگئے اور نماز کی تیاری شروع کردی۔ کمانڈر سکندر نے غور کیا دس سالہ مجاہد شفیع محمد زور زور سے اپنے سر کو کھجا رہا ہے اور اس کے بڑے بڑے بالوں کو بکھیر رہے دیکھ کر دوسرے بچے زور زور سے قہقہے لگا رہے ہیں۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ نماز کے وقت ہنسی ٹھٹھا؟ بالکل منع ہے۔'' چاچا درشتی سے بولا۔

''چاچا۔۔۔ میرے سر میں بڑے زور سے کھمبل ہورہی ہے۔۔۔ میں کیا کروں!'' شفیع معصومیت سے بولا تو سب مسکرادیئے۔

''اچھا لاؤ میں دیکھتا ہوں۔۔۔تمہاری ماؤں والے کام بھی مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں'' چاچا نے شفیع کے بالوں کو بغور دیکھا اور سر پر ہلکی سے چپت لگاتے ہوئے بولا۔۔۔''فکر کی کوئی بات نہیں۔۔۔بس جوئیں پڑی ہوئی ہیں'' اس نے ایک موٹی سی کالی جوں نکالی اور شفیع کی بڑھی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دی۔ شفیع محمد نے بے اختیار اس سیاہ دھبے پر ناخن رکھ دیا اور تھوڑی ہی دیر میں جوں کا خاتمہ ہو گیا۔ چاچا کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔

''یہ کیا کیا تم نے؟ اتنا ظلم۔۔۔ایک بے بس مجبور ننھی سی جوں کو اتنی بے دردی سے قتل کر دیا۔۔۔عذابِ الٰہی نازل ہوگا تجھ پر بد بخت۔۔۔ ارے یہ جاندار ہے۔۔۔جاندار اور خدا کی مخلوق۔۔۔فوراً توبہ کرو۔۔۔'' چاچا نے سب کو کان پکڑوا دیئے۔

''جنید تم شفیع کے سر سے جوئیں نکالو۔۔۔انہیں رہائی دلواؤ۔۔۔بے چاری بے بس مخلوق اس کے بالوں کے جنگل میں الجھ کر بھٹک رہی ہوں گی۔۔۔رحم کروان پر۔۔۔'' چاچا نے جنید کو شفیع کے آگے بیٹھنے کا کہا اور خود پاس کھڑا ہو کر جائزہ لینے لگا۔

''یہ لو ڈبیہ۔۔۔ہر جوں اس ڈبیہ میں بند کرتے جاؤ مگر یاد رکھو۔۔۔ انہیں مارنا نہیں بڑا گناہ ہوتا ہے۔۔۔'' چاچا نے ایک چھوٹی سی ڈبیہ جنید کو تھماتے ہوئے کہا۔

''جمع کر کے پھر کیا کروں چاچا؟'' جنید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے بے وقوف؟'' جب ساری جمع ہو جائیں تو انہیں زمین پر چھوڑ دینا تا کہ آزادی سے گھومیں پھریں۔۔۔آخر یہ اللہ کی زمین ہے اور یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔۔۔جینے کا حق تو انہیں بھی ہے نا۔۔۔'' چاچا نے بڑے پیار سے سمجھایا جنید نے جوئیں نکال نکال کر ننھی سی سفید ڈبیہ بھرنا شروع کر دیں۔ اسے یقین تھا اللہ اسے اب اپنی رحمتوں سے دور نہیں کرے گا۔

☆

لسانی لغت

پروفیسر غازی علم الدین حرکیاتی شخصیت کے مالک ہیں، زبان شناسی میں علمیت اور ادبیت کی جامعیت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں، لسانیات کے وہ غواص ہیں، فہم شناس ہیں اور لفظیات کی تمکنت کے چراغ ادب ہیں۔ انہوں نے ارتکاز نظر سے کام لے کر لسانی تہہ داری کو سند عطا کی ہے۔ چونکہ غازی علم الدین اردو زبان اور ادب کو موضوع بناتے ہیں اس لیے اخلاقی انحطاط کے پس منظر کے طور پر کئی مثالیں پیش کرتے ہیں جن میں بھوک، افلاس، نفرت وحقارت، معاشی ناہمواری، جنسی تسکین اور تاریخی واقعات کے پہلو کے ساتھ اسلامی عقائد وشعائر کی تضحیک کا عنصر بھی شامل ہے۔ غازی علم الدین نے جس طرح لسانی خصوصیات کی تفصیل بیان کی ہے اس میں عالمانہ نگاہ ہے، ساتھ ہی محنت بھی ہے، عرق ریزی تو ہے ہی۔ انہوں نے باضابطہ اور باقاعدہ دلائل پیش کیے ہیں جو ان کے تحقیقی مطالعے کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں۔ الفاظ کے معنی ومطالب کو جس طرح انہوں نے سمجھا اور سمجھایا ہے اس سے اردو کی تعمیر وتشکیل کے خاصے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور نئی لسانیاتی لغت سامنے آتی ہے۔ ان کے مضامین میں الفاظ کا جو ذخیرہ ہے اور اس کی تفصیل ہے اس سے لسانی لغت تیار کرنے کا خیال آنا فطری ہے۔

اردو: معیار اور استعمال

پروفیسر غازی علم الدین نے لسانیات پر ایک کتاب ''لسانی مطالعے'' لکھی جس میں صرف آٹھ مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب جس کسی کے ہاتھ میں گئی پڑھنے اور لکھنے پر اس نے خود کو مجبور پایا۔ ۲۰۱۲ء کے وسط میں چھپی اس کتاب پر دسمبر ۲۰۱۳ء تک باسٹھ مشاہیر ادب نے اپنی مختصر اور طویل ناقدانہ رائے پیش کی ہے۔ جنہیں کتابی شکل میں ترتیب دے کر اور ہندوستان سے شائع کر کے میں طمانیت محسوس کر رہا ہوں۔ یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ غازی علم الدین کی کتاب ''لسانی مطالعے'' کے بطن سے میں نے ''لسانی لغت'' تیار کی گئی جو ستمبر ۲۰۱۳ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئی ہے۔ اپنی نوعیت کی اس پہلی لغت سے اساتذہ، اہلِ قلم اور طلباء استفادہ کر رہے ہیں۔ وجہ یہ بھی ہے کہ اس لغت کی تقسیم آٹھ حصے میں کی ہے۔ پہلے حصہ میں الفاظ ومحاورات اور کہاوتیں مذہبی خاص طور پر اسلامی عقائد وشعائر کے قانون فطرت کے عین مطابق ہیں۔ دوسرے حصہ میں الفاظ کے تخلیقی، معنوی اور اصطلاحی پیکر و پس منظر کا خود کار نظام جاری وساری ہے۔ تیسرے حصہ میں الفاظ معانی بدلتے ہیں۔ خاص طور پر عربی سے اردو میں منتقل ہونے کی قلب ماہیت واضح ہے۔ چوتھے حصہ سے زبان زد عام اور کثیر الاستعمال الفاظ کی حقیقت کا ادراک نمایاں ہے۔ پانچویں حصہ میں لسانی انجذاب کے عملی الفاظ ہیں جو تلفظ کے بطن سے بہرہ وری پاتے ہیں اور حرفی مزاج کی تفہیم وتحصیل پر آمادہ ہیں۔ چھٹے حصہ میں الفاظ کی تشکیلی اور معنوی وسعت ہے اور تائے مدورہ کی تائے قرشت اور ہائے ہوّز کی تبدیلی کا تنوع ہے۔ ساتویں حصہ میں املا کی جداگانہ حیثیت، حسنِ یکتا اور انفرادی تصرف کی تفہیمیت ہے۔ آٹھویں حصہ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر غلط بولے اور لکھے جانے والے الفاظ کی نشاندہی اور تصحیح ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سجدۂ سہو

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

شہر میں صدرالدین کی دستار بندی کی خبر گاؤں میں ایسے پھیلی جیسے آسمان سے کہکشاں کا پیالہ زمین پر آن اترا ہو۔ کہاں ایک بڑھئی زادہ اور کہاں یہ الوہی تکریم۔۔۔ پورے ملک میں مقابلے ہوئے تھے قرأت کے اور انعام دینے کے لیے مصر سے قاری بلوائے گئے تھے۔ وزارت سرکاری تھی تبھی تو اتنا اہتمام ممکن ہو سکا تھا۔ صدرالدین کو طلائی تمغہ اور دستار ملی۔ عزّت مآب اس قدر متاثر ہوئے حسنِ قرأت سے کہ انہوں نے صدرالدین کے لیے اس کے گاؤں میں ایک خوبصورت مدرسہ بھی بنوا دیا اور خود ان کے رہنے کے لیے ایک گھر۔۔۔ لیکن صدرالدین تو اس نوخیزی میں بھی بے حد غیر دنیا دار تھے۔ گھر انہوں نے اپنے بڑھئی والدین کو دے دیا اور خود اک کچے سے حجرے میں آ بسے۔ انہیں اگر لگاؤ تھا تو صرف مدرسے کی تشکیل سے۔ وہ دن رات مدرسے کے انتظامات، دینی کتب کی فراہمی، باکردار اساتذہ کی دستیابی، طالب علموں کے بیٹھنے پڑھنے کی جگہ، لڑکیوں کے لیے تدریس کے باپردہ انتظام، طہارت خانوں کے معیار، مسجد کی تزئین اور اس طرح کے اور بہت سی ذمہ داریوں میں جٹے رہتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مدرسہ طالب علموں سے بھر گیا جس میں بچے بھی تھے اور بچیاں بھی جو مدرسے کے زنانہ حصے میں بیٹھتی تھیں۔ صدرالدین کی والدہ ان کی نگرانی کرتیں البتہ قرأت کا سبق صدرالدین ہی انہیں دیتے تھے کیونکہ ان کا لہجہ خوبصورت تھا۔ اسی لہجے پر تو مصر کے عزت مآب نے ان کے لیے تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

صدرالدین اب کہیں جا کر بیس برس کے ہوئے تھے لیکن کہلاتے مولانا تھے۔ والدین ان کی شادی کے لیے فکر مند تھے لیکن ان کا میلان نہ دیکھ کر وسوسوں میں پڑنے لگے تھے۔ خالہ زادیوں تو ان کی ٹھیکرے کی مانگ تھی مگر یونیورسٹی میں پڑھتے پڑھتے گاؤں کی پگڈنڈیوں کو بھول بیٹھی تھی۔ پر جب گاؤں میں صدرالدین کا چرچا سنا تو رضامند ہو گئی۔ صدرالدین بھی خاموش ہو رہے اور دونوں کا نکاح ہو گیا۔۔۔ خواب گاہ صدرالدین کے لیے فقط ایک خواب ثابت ہوئی۔ ٹھیکرا جگہ جگہ سے نشان زدہ تھا۔ صدرالدین نے کوئی الزام نہیں لگایا۔۔۔ جائے نماز بچھا کر اپنے ساس سسر کی طرف سے ایک سجدہ سہو ادا کیا۔۔۔ انہوں نے بیٹی کی شادی سے پہلے اس کی رضامندی نہ پوچھ کر کتنا بڑا گناہ کیا تھا۔ سجدہ سہو ادا کر کے صدرالدین کو دلی راحت ملی۔ منکوحہ بٹر بٹر انہیں دیکھتی رہی۔ وہ اُسے خاموشی سے رات کی تاریکی میں اس کے گھر چھوڑ آئے۔ اس حادثے کو انہوں نے قدرت کا فیصلہ سمجھ کر چپ سادھ لی۔ جانے کیوں انہیں لگنے لگا تھا کہ اوپر والا انہیں صبر اور محرومی کے تندور میں جھلسا کر کندن بنان چاہتا ہے۔ صدرالدین کو عشقِ مجازی کے ٹنڈ منڈ ڈال پر عشقِ حقیقی کے ہرے بھرے پتے پھوٹتے نظر آنے لگے تھے۔ مادہ ان کے قدموں سے بھربھراتا اور وہ دنیا کے خشک اور بنجر میدانوں کے اوپر بہت اوپر کسی سفید گھوڑے کی باگیں تھامے بلندیوں پر اڑ رہے ہوتے۔ تحیّر صدرالدین کے انگ انگ سے پھوٹتا اور وہ اس معرفت میں غرق ہوتے چلے جاتے۔۔۔ صدرالدین کی جوانی تاج محل کے نور کی طرح ضوفشاں تھی۔ لوگ بڑے اشتیاق سے انہیں دیکھتے رہتے لیکن وہ اپنے حسنِ جہاں منور سے بے خبر تھے۔ والدین ان کی دوسری شادی کی حسرت لیے دنیا چھوڑ گئے اور صدرالدین صرف مسجد اور مدرسے کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے کردار کی دھاک ہر طرف تھی اسی لیے لوگ اپنی بچیوں کو بھی بلاخوف ان کے پاس دینی تعلیم کے لیے بھیج دیتے تھے۔

صدرالدین کو رات کی عبادات کے بعد اولیاء کے قصّے پڑھے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ پیغمبران پر آئے امتحان، آزمائشیں، اذیتیں، تکالیف اور ان تمام پر صبر۔۔۔ شیطان کے بہکانے سے شعور کی حفاظت کھلی آنکھیں، کشادہ دماغ، ابلیس کے خوشنما باغ اور اس پر لعنت سب کچھ صدرالدین کو ازبر تھا۔ حوا اور آدم کے رومانوی قصّے کو خاص دلچسپی سے صدرالدین پڑھتے تھے۔ اس قصّے میں انہیں وہ توبہ بہت اچھی لگتی تھی جو آدم اور حوا اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر کرتے رہے اور جب اللہ نے وہ توبہ قبول کر لی تو شیطان شکست کھا گیا۔۔۔ شیطان کی شکست صدرالدین کو سرشار کر دیتی تھی۔۔۔ لیکن اس ازلی اور ابدی قصّے میں اچانک ایک دن وہ کسی اور ہی سمت میں جا اٹکے۔ وہ سمت شجرِ ممنوعہ کو بے قصور ثابت کرنے کی طرف جاتی تھی۔ صدرالدین اپنے آپ سے ڈر گئے۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ نماز کی رکعتیں بھولنے لگے۔ ہر رکعت میں سوچتے یہ کونسی ہے؟ اکثر نماز کے دوران بارش کا پانی پرنالوں کی طرح ان پر گرنے لگتا اور انہیں غسل کرنا پڑتا تھا۔

گاؤں میں برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ مولوی صدرالدین نے بچوں سے کہا کہ وہ چند دنوں کے لیے مدرسے نہ آئیں کیونکہ کچے کا علاقہ ایک ذرا بارش سے کیچڑ بن جاتا ہے۔ بچے کیچڑ میں گر کر زخمی بھی ہو سکتے ہیں اور مدرسہ بھی وقت میں پڑ سکتا ہے۔ لڑکے تو یہ سن کر خوش ہو گئے لیکن نوعمر عفّت نے اپنے باپ کی منّت کی کہ وہ ناغہ نہیں کرنا چاہتی اس لیے مولوی صاحب اُسے ہی پڑھا دیا کریں تو بڑی مہربانی ہو گی۔ صدرالدین بھی جانتے تھے کہ عفّت بہت ہونہار اور ذہین بچی ہے۔ اگر وہ پچھلے ایک سال بیمار نہ رہی ہوتی تو دینی تعلیم کب کی مکمل کر چکی ہوتی۔ انہوں نے عفّت کا شوق دیکھتے ہوئے اُسے مدرسے آنے کی اجازت دے دی۔ اس روز بھی بارش ٹوٹ کر برسنے والی تھی۔ بارش کی وجہ سے

مدرسہ صحن میں لگایا گیا تھا۔ اچانک صدرالدین کی نظر سیپارے پر جھکی عفّت پر عجیب زاویے سے جا پڑی۔ ہلکی ہلکی بارش کے قطرے جب عفّت کی گردن پر پڑے تو اس نے جلدی سے اپنا دوپٹہ گردن پر رکھ لیا۔ عفّت پر بہار کی آمد آمد تھی اور دوپٹے کی اپنی جگہ کملی چھوڑ دی۔ صدرالدین گڑبڑا گئے۔ ہموار میدان دیکھنے کی عادی آنکھ نوکیلی چٹانوں سے ٹکرائے تو کچھ تکلیف تو ہوتی ہی ہے۔ مولوی صاحب کو پسینہ آ گیا۔ اپنی نظروں کو انہوں نے اپنی بری طرح ڈانٹا کہ شجرِ ممنوعہ پر بیٹھا سنہری پرندہ ڈر گیا۔

وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عفّت پریشان ہو گئی۔ انہوں نے سخت لہجے میں عفّت کو تنبیہہ کی کہ وہ اکیلی مدرسے نہ آیا کرے۔ عفّت سہم گئی اور آبدیدہ سی مدرسے سے چلی آئی۔ صدرالدین لڑکھڑاتے ہوئے حجرے تک پہنچے جو انہیں اپنی واحد مقدس پناہ گاہ لگتا تھا۔ اپنے حجرے میں پہنچ کر انہوں نے دیوار و در سے معافی مانگی اور زار و قطار رونے لگے۔ جلدی سے وضو کر کے انہوں نے سجدہ سہو ادا کیا تو کچھ سکون ملا۔ نیم پختہ سے حجرے کے لکڑی ساختہ دروازے سے صدرالدین کو بڑی عقیدت تھی۔ جانے کیوں انہیں یقین تھا جب تک وہ پاک باز رہیں گے دروازہ کھلا رہے گا۔ انہوں نے رات کو بھی کسی حشرات الارض کے خوف سے حجرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔

معافی کے پے در پے سجدے ادا کرنے کے بعد مولوی صدرالدین بہت حد تک سنبھل چکے تھے۔۔۔ عفّت واقعی دوبارہ نہیں آئی۔ صدرالدین کو دکھ ہی ہوا کہیں عفّت کا باپ ان سے بدگمان نہ ہو گیا ہو۔ کم سن سی عفّت اتنے اونچے چوڑے صدرالدین کے لیے ایک دم اتنی اہم ہو گئی تھی۔ جنّت میں کھڑے کسی شجرِ ممنوعہ کی طرح۔۔۔ صدرالدین ایسی سوچ کا بھی سجدہ سہو ادا کرتے تھے۔

کچھ دنوں بعد موسم کھل گیا تو طالب علموں نے دوبارہ مکتب آنا شروع کر دیا۔ بچے بھی آئے اور لڑکیاں بھی۔۔۔ مگر عفّت نہیں آئی۔ پتہ چلا بیمار ہے اور علاج کے لیے شہر گئی ہے۔

مولوی صاحب کو آخری دن اس کی خوف سے سہمی آنکھیں یاد آ گئیں۔ کتنا سخت اور بلاوجہ ڈانٹا تھا انہوں نے ایک چھوٹی سی بچی کو۔۔۔ اب وہ خود کو کافی مستحکم محسوس کرتے تھے۔ خود اپنے ہاتھ سے تقویٰ کا ایک تعویذ بنا کر انہوں نے اپنے گلے میں ڈال لیا تھا۔ مدرسہ مکمل کر کے اس شام جب وہ اپنے حجرے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک دلخراش چیخ نے ان کے قدم جکڑ دیے۔ آواز مدرسے کی طرف سے آئی تھی۔۔۔ وہ بھاگے۔ عفّت اپنا انگوٹھا پکڑے بری طرح رو رہی تھی۔۔۔ اس کے انگوٹھے پر بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ مولوی صدرالدین نے انگوٹھے پر اپنے ہونٹ رکھے اور سارا زہر نچوڑ کر تھوک دیا۔ وحشت کی ماری عفّت پر سکون کی بارش ہو گئی۔ بچھو کے خوف اور زہر کے نکل جانے کی خوشی نے اسے پاگل کر دیا۔ بے اختیار اس نے مولوی صاحب کا بازو تھام لیا ''اگر آج آپ نہ ہوتے تو میں زہر سے مر جاتی'' صدرالدین عرق عرق ہو گئے۔ پرندہ کسی صورت انہیں واپس نہیں جانے دے رہا تھا۔ اس کی ہیبت ناک پھڑپھڑاہٹ میں عفّت کا شور دب گیا تھا اور زہر اس کے بدن میں اترتا چلا گیا۔

مولوی صدرالدین خود ملامتی کی ایک خوفناک دھاڑ کے ساتھ اپنے حجرے کی طرف بھاگے۔ دیواروں نے دھڑ دھڑ گرنا شروع کر دیا تھا اور چھت اڑ گئی تھی۔ ننگے حجرے میں انہوں نے سو کے قریب سجدہ سہو ادا کیے اور جب وہ ۱۰۰ واں سجدہ کر رہے تھے، تھانیدار نے ان کی گردن میں زنجیر ڈال دی تھی۔

- بقیہ -

صدر ضیا

''بیٹا! یہ جو ہم افغانستان میں روس کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں؛ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے امریکہ ہماری مدد کیوں کر رہا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ کسی کا دوست نہیں؛ ضرور اس کا مفاد ہو گا۔ بیٹا! بعض دانش ور کہتے ہیں کہ اتنی توجہ کشمیر پر دیتے تو وہ آزاد ہو جاتا اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کا خیال ٹھیک ہے''۔

''اماں جی آپ کی کال بہت لمبی ہو گئی ہے''۔ ضیا صاحب نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ خالہ خوش ہو گئی کہ صدر صاحب نے اس کی باتوں کا برا نہیں منایا بلکہ وہ تو ایسا لگتا تھا جیسے محظوظ ہو رہے ہوں۔ ان کا خوش گوار موڈ محسوس کر کے خالہ کو اور حوصلہ ہوا۔ اس نے سوچا لگے ہاتھوں اپنی بیٹے کی نوکری کی بھی بات کر لوں۔ کیا پتا صدر صاحب کہیں اس کا انتظام کر دیں۔

''صدر صاحب! میرا ایک بیٹا ہے جو بی اے پاس ہے۔ اس بے چارے نے بہت کوشش کی مگر نوکری نہیں ملی۔ ہماری سفارش جو نہیں۔ اگر آپ اس کے لیے نوکری کا بندوبست کر دیں تو دعائیں دوں گی''۔

''اماں جی! میری بھی سنیں نا۔ اپنی ہی سنائے جا رہی ہیں۔ میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ میں صدر ضیا نہیں ہوں''

''بیٹا ابھی تو آپ نے خود کہا تھا کہ میں صدر ضیا بات کر رہا ہوں''۔

''میں نے کہا تھا کہ میں پنڈی صدر سے ضیا بول رہا ہوں''۔

خالہ نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتے ہوئے فون پٹخ دیا۔

☆

''سچ بولنا سیکھو''

مظفرحنفی
(دہلی، بھارت)

گھٹاتے کیوں ہو میرا قد، مری آواز نقّادو
کبھی سچ بولنا سیکھو نظریہ ساز نقّادو

حقیقت بھی سرآنکھوں پر ہے جدت بھی سرآنکھوں پر
مگر اک شئے لطافت بھی ہے نعرے باز نقّادو

ہر اِک سچائی کو تقسیم کر دیتے ہو خانوں میں
ہر اِک ندرت کو کرتے ہو نظر انداز نقّادو

کئی صدیوں سے کس کی گونج ہے ہندوستان بھر میں
سُنا تم نے، غزل کے دشمنو، طنّاز نقّادو

مگر تازہ ہوا سے واسطہ تم نے نہیں رکھّا
پروں سے مصلحت کے مائل پرواز نقّادو

دیانت خون بن کر دوڑتی ہے اس کی باتوں میں
اسی میں مظفر کی غزل کا راز نقّادو

○

سُرورانبالوی
(راولپنڈی)

جس جگہ ملتے ہیں انسان بھی خدا مانند
عمر گزری ہے وہاں اپنی سزا کی مانند

غُنچہ غُنچہ میں صباحت ہے ترے عارض کی
اور چٹکنے کی صدا تیری صدا کی مانند

بعد موت کے ترے قرب کے لمحے آئے
وہ بھی گزرے ہیں مری جان ہوا کی مانند

دستِ للعین حِنا بستہ سے معلوم ہوا
کوئی بھی رنگ نہیں رنگِ حنا کی مانند

اُس کی آنکھوں میں قیامت کی بلاخیزی تھی
اپنی آنکھیں تو اُٹھیں دستِ دعا کی مانند

آج بھی ہم سے خفا ہے وہ عدو کی صورت
ہم نے جس شخص کو چاہا تھا خدا کی مانند

ہم کو ذہنوں سے مٹانا کوئی آسان ہے کیا
ثبت ہو جاتے ہیں کفِ پا کی مانند

رات اُس بستی میں کس طرح کٹے گی اپنی
دن گزرتا ہو جہاں روز حرا کی مانند

جس کو خود میرے تخیل نے تراشا ہے سُرور
وہ مرے ذہن پہ چھایا ہے خدا کی مانند

○

ڈاکٹر معصوم شرقی

(کولکتہ، بھارت)

کون ہے جو مجھے راتوں کو صدا دیتا ہے
میری آنکھوں سے مری نیند اڑا دیتا ہے

پاؤں کو میرے نہیں دشت نوردی سے لگاؤ
اور وہ ہے کہ مجھے دشتِ بلا دیتا ہے

کوئی ہمدرد ہے جو رات کے سنّاٹے میں
میری آواز میں آواز ملا دیتا ہے

مجھ کو آتی ہے تری سادہ مزاجی پہ ہنسی
تو جو اس دور میں جینے کی دعا دیتا ہے

میں کسی وقت کے سلطان سے کب ڈرتا ہوں
میرا اخلاق ہے جو مجھ کو جھکا دیتا ہے

روح اک روز بدن چھوڑ کے چل دے گی کہیں
زرد پتّہ ہمیں پیغامِ فنا دیتا ہے

رات ڈھلتی ہے تو ہوتا ہے گماں دستک کا
کوئی جھونکا ترے آنے کا پتا دیتا ہے

صرف آنگن میں ہی دیوار اٹھاتا نہیں وقت
دو دلوں میں بھی دیوار اُٹھا دیتا ہے

چھین لیتا ہے وہی سر سے ردا بھی معصومؔ
جو بدن کو کبھی ریشم کی قبا دیتا ہے

○

محمود الحسن

(راولپنڈی)

ہر حال میں بے یار و مددگار رہے ہم
اللہ کی رحمت کے طلبگار رہے ہم

خود آ کے لگا لیں گے تجھے اپنے گلے سے
کچھ دیر اگر اے زمین و دار رہے ہم

پوچھیں کبھی ہم سے بھی تو یہ شیخ و برہمن
کیوں طعنہ زنِ سُبحہ و زُنّار رہے ہم

کیا کیا نہ ستایا ہمیں اربابِ ہوس نے
وابستہ ترے غم سے مرے یار رہے ہم

جب تک کہ رہا واسطہ اربابِ جنوں سے
بیخود ہی سہی، واقفِ اسرار رہے ہم

آزاد رہے ہیں غم دنیا سے ہمیشہ
جب تک تری الفت میں گرفتار رہے ہم

دیکھا نہ کوئی فرق شہنشاہ و گدا میں
جب تک کہ غلامِ شہِ ابرارؐ رہے ہم

ارباب ہوس ہم سے اُلجھتے ہی رہے ہیں
اے عشق تری تیغِ جگر دار رہے ہم

○

تشنہ بریلوی

(کراچی)

محفلِ جاناں میں ہیں رقصاں دھنک کے سات رنگ
ہر طرف ہنستے ہوئے، محبوب چہرے شوخ وشنگ

ناچتی ہے ڈومنی، ڈھائے قیامت انگ انگ
دیکھتا ہوں اور دل میں بج رہے ہیں جلترنگ

اس نظر کی ڈور میں تیزی ہے کیسی الاماں
کاٹ کر رکھ دے ذرا سی دیر میں دل کی پتنگ

اس میں کچھ کاریگری خیّاط کی ہرگز نہیں
وہ بدن جادو بھرا ہر جامہ اُس پر چست وتنگ

سن کے میری داستانِ رنج وغم وہ رو پڑی
ہو گئیں رخسارِ جاناں پر رواں جمنا وگنگ

وصل کی شب ہے، دِکھا کچھ جوش ومستی جانِ جاں
وصل بھی اِک جنگ ہے لیکن نہیں ہے سرد جنگ

رقص کرتا ہوں میں تشنہ گردشِ دوراں کے ساتھ
اِک حسینہ بھی نہیں راضی کہ ناچے میرے سنگ

○

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

یہ ابتدا میں کسی کو بھی کیا خبر ہوگی
کہ جو بھی سعی مسلسل ہے بے ثمر ہوگی

زکاتِ حرف نکالوں کہ مستحق کو ملے
مگر یہ شرم کہ پونجی تو مختصر ہوگی

ہر ایک شخص کے چہرے سے روشنی پھوٹے
اسی امید پہ اب زندگی بسر ہوگی

گھڑی اقامت حسن عمل کی دور نہیں
وہ یوں کہ منزلِ آخر کبھی تو سر ہوگی

دعا کا معجزہ دنیا میں گر سلامت ہے
مرے چمن کی ہر اک شاخ بارور ہوگی

لہو جلا کے اندھیرے جو کاٹنا چاہے
اسی کے دم سے شبِ غم کی اب سحر ہوگی

میں اپنی ذات کا ناقد بنوں تو بات بنے
پھر احتساب کی صورت بھی کارگر ہوگی

کوئی سبب تو ہے دوری کا میرے آقا سے
قبا میں شیخِ حرم کی بھی تارِ زر ہوگی

ہر ایک رخ پہ کٹے فصلِ گفتگو لیکن
ہماری بات کا حاصل تو چشمِ تر ہوگی

○

غالب عرفان
(کراچی)

آپ کی دسترس میں رہنا ہے
پھر مجھے پیش و پس میں رہنا ہے

مجھ کو گر ، اب نئی حیات ملی
ہر طرح تیرے بس میں رہنا ہے

میں جو آواز ہوں تو قبلِ سحر
ہر صدائے جرس میں رہنا ہے

موت کے بعد موت سے پہلے
زندگی کے قفس میں رہنا ہے

حد تو یہ ہے کہ مجھ فقیر کو بھی
شہرِ اہلِ ہوس میں رہنا ہے

اُس سے ملنا ضروری ہے تو پھر
زندہ اپنے نفس میں رہنا ہے

کہہ رہی ہے نوائے عرفاںؔ بھی
تجھ کو نغمے کے رس میں رہنا ہے

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

دھو گئی چہروں سے گردِ یاس کا غازہ ہَوا
کر گئی افسردہ رُوحوں کو تروتازہ ہَوا

لاکھ بیٹھو چُھپ کر اپنے بند کمروں میں، مگر
توڑ کر آ جائے گی ایک ایک دروازہ ہَوا

صبح، آنچل کی ہوا دے کر کِھلاتی ہے جسے
شب کو بکھراتی ہے خود اُس گل کا شیرازہ ہَوا

تھا کبھی اس کی بدولت میرا آوازہ بُلند
کَس رہی ہے آج آوازے پر آوازہ ہَوا!

ناپنے نکلی ہے شہرِ دل کی وسعت کو، مگر
کیا لگا پائے گی میرے غم کا اندازہ ہَوا!

بھر چلے تھے زخم جو، پھر سے لگے منہ کھولنے
کچھ پرانے درد لے کر آئی ہے تازہ ہَوا!

جی ترستا ہے پھر اُن لمحوں کو جب تھے سب بہم
رقصِ مَے، بوئے سمن، رنگِ شفق تازہ ہَوا

ہم تو اپنی خانہ ویرانی کا ماتم کر چُکے
دیکھ جا کر اب تُو کوئی اور دروازہ ہَوا!

وہ لطافت، وہ مہک، کیوں چاندؔ یکسر کھو گئی؟
بھر رہی ہے کن خطاؤں کا یہ خمیازہ ہَوا؟

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

کہا دل نے کہ میری ترجمانی کون کرتا ہے
جواب آیا کہ ایسی جاں فشانی کون کرتا ہے

محبت ہم نے کی ہے، ہم ہی کرتے آئے ہیں ورنہ
ہم ایسوں کے سوا پتھر کو پانی کون کرتا ہے

دل ویراں میں کوئی آرزو بونے سے کیا حاصل
بیاباں کی زمیں پر باغبانی کون کرتا ہے

جو نقدِ جاں بھی رکھ دے اپنے مہمانوں کی خدمت میں
سوائے شمع ایسی میزبانی کون کرتا ہے

ستاروں تک پہنچنے کے لیے لازم ہے شہبازی
زمیں پہ رہ کے سیرِ آسمانی کون کرتا ہے

تو چاہے تو جہاں کو پھیر دے یارب مرے حق میں
سوا تیرے دلوں پر حکمرانی کون کرتا ہے

چراغِ کُشتہ پہ جلتے نہیں ہیں آ کے پروانے
عیاں ہر ایک پہ سوز نہانی کون کرتا ہے

کسی دہقان نے پوچھا یہ اپنے شہر والوں سے
زمیں کو سرخ تم کرتے ہو، دھانی کون کرتا ہے؟

میں رویا تو مجھے اس نے ٹشو پیپر سے بہلایا
خیالؔ اس دور میں یہ مہربانی کون کرتا ہے

○

غلام مرتضیٰ راہی
(فتح پور، بھارت)

وہاں سے جو اشک بار آیا
وہ بوجھ دل کا اُتار آیا

وہ کر کے سولہ سنگھار آیا
خزاں میں بن کر بہار آیا

ازل سے بکھرے پڑے ہیں تارے
ہمیں نہ کرنا شمار آیا

کسی کا میں نے کیا تعاقب
کسی کا کر کے شکار آیا

چلا تھا لے کر جو سوئے منزل
وہ راستہ میں گزار آیا

ہمیں نے دیکھی ہے راہ تیری
کسی کو کب انتظار آیا

پڑی جو دھارے میں ناؤ راہیؔ
نہ کوئی ڈوبا نہ پار آیا

○

انتظار باقی

(جھنگ)

جس میں خیالِ یار ہویدا دکھائی دے
وہ شعر، میری قبر کا کتبہ دکھائی دے

کنجِ اماں ملے، کوئی گوشہ دکھائی دے
ہر داستانِ کرب تماشا دکھائی دے

جلنے لگے چراغ، سرِ شام ہی ، مگر
کچھ تیرگی بڑھے تو اُجالا دکھائی دے

اہلِ خرد نہ دیکھ سکیں سامنے کی چیز
اہلِ جنوں کو پسِ پردہ دکھائی دے

زندانِ خستہ حال کے قیدی ہیں منتظر
دیوار گر گئی ہے تو رستہ دکھائی دے

اک دوسرے کے عکس ہیں محفل کے سارے لوگ
عاشق وگرنہ سب سے علیحدہ دکھائی دے

فردوس میری ماں کے ہے قدموں تلے تو کیا!
قدموں میں اُس کے عرشِ معلیٰ دکھائی دے

شاید تمہارے ہجر کا یہ بھی ہے اک اثر
ہر آئینے میں شاخِ بریدہ دکھائی دے

اتنا ہے پاکباز، یہ رُکتا نہیں کبھی
دریا مرے جنوں کا بہتا دکھائی دے

اس اوجِ درد نے مجھے برباد کر دیا
مجھ کو وقارِ ضبط شکستہ دکھائی دے

ہے قریۂ بدن کا ہر اک گھاؤ اجنبی
اے کاش! کوئی زخم، شناسا دکھائی دے

باقیؔ کھڑی ہوئی ہیں خزائیں قطار میں
ہر پھول زرد رُت کا دِباچہ دکھائی دے

○

سریواستو رند

(نوئیڈا، بھارت)

خرابے جب پریشانی میں آئے
خزاں لمحے بھی حیرانی میں آئے

حصارِ ظلمتِ شب سے نکل کر
اُجالے بزمِ امکانی میں آئے

تپش موسم کے تھے اپنے مسائل
کئی سورج بھی حیرانی میں آئے

سمندر سے کہو، خود میں سمٹ کر
کبھی سیلاب کے پانی میں آئے

کبھی ایسا نہ ہو دیوانگی میں
سلگتی دُھوپ نادانی میں آئے

خلاؤں میں بغاوت ہو رہی ہے
زمیں والے پریشانی میں آئے

جہاں پر دفن تھے ماضی کے لمحے
ہماری اپنی نگرانی میں آئے

اُنہیں میں رندؔ ہے طرزِ بغاوت
اچانک جو پریشانی میں آئے

○

صفوت علی صفوت
(امریکہ)

طواف کرتے ستاروں کے درمیاں دیکھوں
عجیب شوقِ زیارت کہ لامکاں دیکھوں
ق
مجھے پتا کہ شہِ رگ سے بھی قریب ہے تو
نہ جانے وقتِ دعا کیوں میں آسماں دیکھوں

سجا رہا ہے ترنم سے کوئی عرش کو روز
اِسی لیے تو مگن رقصِ کاروں دیکھوں

سو لکھ سکا ہوں نہ لکھ پاؤں گا تری تعریف
نہ جانے کیوں یہ قلم پھر بھی میں رواں دیکھوں

مزار ہے کوئی ٹوٹے ہوئے ستاروں کا
کہ اک سیاہ بھنور وسطِ کہکشاں دیکھوں

ہمارے گرد ہی بارانِ روشنی تو نہیں
اسی میں سدرۃ جبریلؑ گلستاں دیکھوں

کبھی بھی چین سے بیٹھی نہیں تری مخلوق
نظر سکونِ اقامت میں بھی عیاں دیکھوں

یہ سوچتا ہوں کہ ناقص رہا عبادت میں
نہ سابقون میں ہی خود کو مہرباں دیکھوں

نزولِ خواب تھا صفوتؔ یہ عشقِ وحدت میں
یہ چشم تر ہے جو واپس بدن میں جاں دیکھوں

○

سیفی سرونجی
(سرونج، بھارت)

فرحت نہیں ذرا اسے بحث و دلیل سے
محبوب میرا کم نہیں اعلیٰ وکیل سے
منصف سلام کرتا ہے مجرم کو بار بار
رتبہ ملا ہے مجھکو یہ ربِّ جلیل سے
غالبؔ سی کوئی بات نہ انداز میرؔ کا
چلتا ہے میرا نام تمہارے قبیل سے
گدّی پٹھان شیخ کا کب تک کروگے ذکر
کرنے لگے ہیں بور یہ قصّے طویل سے
جانا ہے مجھکو پار تو جا کر رہوں گا میں
زنجیر سے رکوں گا نہ اونچی فصیل سے

○

مراق مرزا
(ممبئی، بھارت)

اگرچہ زندگی مراق ریت کا مکان ہے
اِسی میں ہے زمیں تری اسی میں آسمان ہے
اُسی کا شور عرش پر صدا اُسی کی فرش پر
ہر ایک فکر میں ہے وہ اسی کی ہر زبان ہے
مری نگاہ میں نہیں عظیم کوئی آدمی
بس اک خدا کی ذات ہی عظیم ہے مہان ہے
ہے بے کراں حیات کی یہ روشنی کا سلسلہ
اجل فلک کی سمت زندگی کی ہی اڑان ہے
ہیں ایک ہی زمیں پہ ہم فلک بھی سر پہ ایک ہے
نہ جانے کیوں یہ فاصلہ ہمارے درمیان ہے
میں بن گیا ہوں اپنے وقت کی کوئی بڑی صدا
مرے خلاف اس صدی کا ہر بڑا بیان ہے

○

پروفیسرز ہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

کوئی ملال نہیں ہے اب اپنے نالوں کا
اگر جواب وہ دیتے نہیں سوالوں کا

مِری غزل میں اگر بات کچھ نئی بھی نہیں
زمانے بھر میں ہے چرچا مِرے خیالوں کا

اُنہی کا نور نمایاں ہوا ہے چار طرف
نیا یہ دَور اُجالا ہے نونہالوں کا

ہم اپنے عہد کی تاریخ لکھنے والے ہیں
کریں گے ذکر کتابوں میں باکمالوں کا

تمام شہر میں ایٹم کی شورشیں ہیں بہت
ہر ایک سمت دھماکہ ہے دِل کے چھالوں کا

کس کے خون پسینے سے ہے یہ ہریالی
یہ پھل یہ پھول جو ثمرہ ہوا کدالوں کا

ستم ظریف بھی کیسے ہیں غم گسار زہیرؔ
مزاج پوچھنے آئے ہیں خستہ حالوں کا

○

احسان احمد شیخ
(راولپنڈی)

کوئی تو ہو جو وفا میں کجی کی بات کرے
تیرے لہو میں جفا کی کمی کی بات کرے

ہیں آستیں کے کنارے لہو لہو کوئی
جو خنجر اس میں ہے اُس کی انی کی بات کرے

ہر ایک شہر میں لاشوں کے ڈھیر ہیں اور وہ
بدن سے بہتے لہو کی کمی کی بات کرے

چھپائے منہ کو ہر اک رند پی رہا ہے مگر
کوئی نہ ساقی کی دریا دلی کی بات کرے

نہ چھوڑ شیخ یہ شہرِ جفا، مبادا کوئی
جو آستین میں ہے اُس نمی کی بات کرے

○

چکّر

احمد زین الدین
(کراچی)

رات کے پچھلے پہر اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور میرے خواب کا سلسلہ جو کئی راتوں سے میں دیکھ رہا تھا ٹوٹ گیا۔ شاید کوئی یاد کر رہا تھا۔ روح کا سفر تو جاری رہتا ہے شاید۔۔۔!

فون اٹھایا ''کون؟''

''میں امریکہ سے رابعہ حق بول رہی ہوں جس کو آپ ڈیفنس میں ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔''

میرا ذہن پوری طرح جاگ چکا تھا۔ ''اچھا اچھا۔ اب یاد آیا۔ رابی! آج دس برس بعد میری یاد کیسے آئی۔ خیریت تو ہے؟''

''جی۔ مگر میں آپ کو بھولی کب تھی۔ ایک تو دوری اور اس پر تنہائی اور مجبوری''

''کیسی مجبوری؟ سب ٹھیک تو ہے۔ تم پریشان لگتی ہو۔''

''جی بہت''

''شادی کے کچھ ہی دنوں بعد تم شوہر کے پاس امریکا چلی گئیں۔ اپنا کنٹیکٹ نمبر اور پتہ بھی نہیں دیا ورنہ میں تم سے رابطے میں رہتا۔ میرا فون نمبر تمہارے پاس تھا کیا؟''

''جی میرے موبائل میں محفوظ تھا مگر شوہر کی طرف سے کسی کو فون کرنے کی اجازت نہیں تھی گھر والوں سے بھی کبھی کبھار چھپ کر بات کرتی۔''

''تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش تو ہو؟ کتنے بچے ہیں اور وہ کیوں سختی کرتا ہے؟''

''شکی مزاج اور لا اُبالی انسان ہیں۔ آفس کے بعد زیادہ وقت عورتوں، کلب اور شراب خانے میں گزارتے ہیں۔ رات گئے آ کر چپ چاپ منہ پھیر کر سو جاتے ہیں۔ میری تو پرواہی نہیں۔ پہلے میں سوچا کرتی کہ وقت گزرنے کے ساتھ راہِ راست پر آ جائیں گے مگر نہیں۔ محبت کا اظہار بھی نہیں کرتے، نہ باہر گھمانے پھرانے اور شاپنگ کے لیے لے جاتے ہیں۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں سب ٹھیک چل رہا تھا مگر۔۔۔!''

''میں اِدھر کچھ دنوں سے تمہارے بارے میں فکر مند ہو گیا تھا۔ تمہاری باتیں اور طرح طرح کے سوال پوچھنے اور ان کو سمجھنے کی کوشش یاد آتی رہی حتیٰ کہ اس قدر فکر مند ہو گیا تھا کہ کئی راتوں سے تم کو خواب میں مسکراتا ہوا اُسی انداز میں دیکھ رہا تھا۔ شاید تمہاری پریشانی کو میری روح نے محسوس کر لیا تھا''

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی جیسے آنسوؤں کو دل میں اُتار رہی ہو۔

''ہیلو! تم لائن پر ہو یا فون بند کر دیا''

''میں سب سن رہی ہوں اور پچھلے دنوں کی یاد میں کھو گئی''

''تمہارے شوہر علی رضا گھر پر نہیں ہیں کیا جو اتنی دیر تک باتیں کر رہی ہو؟''

''نہیں، وہ دو دن کے لیے آفس کے کام سے دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں''

''تمہاری سہیلیوں نے بتایا تھا کہ علی رضا اچھی پوزیشن پر ملازم ہیں۔ ان کو کسی چیز کی کمی نہیں۔ دولت کے ساتھ ساتھ گرین کارڈ ہولڈر ہیں۔''

''جی ہاں، جبھی تو ماں کے کہنے پر بابا نے ان سے میری شادی فوراً کر دی''

''ہاں مگر تم بھی تو یہی چاہتی تھیں کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں عیش و آرام کی زندگی ہو۔ تم نے ایک دن شادی کے ذکر پر اسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ شاید یہ بھی کہا تھا کہ ساس سسر اور نند بھاوج کا ساتھ نہ ہو، بس اپنی عیش کی زندگی ہو اور شوہر پر ملکیت کا پورا احساس۔۔۔''

''ان دنوں میں جوانی کے نشے میں اور سہیلیوں کے ایسے سہانے خواب دکھانے کے چکر میں پڑی رہتی۔ سر! کیا کرتی سوتیلی ماں تھی جو مجھ سے جلد پیچھا چھڑانا چاہتی تھیں چنانچہ انہوں نے اس رشتہ میں بندھوا دیا۔ بابا کو چھان بین کی مہلت بھی نہ دی اور پھر دور دیس والوں کے بارے میں اتنی جلدی ایسا ممکن بھی تو نہ تھا۔ پھر علی رضا تو میری سوتیلی ماں کے رشتہ دار بھی ہیں۔ اب شکایت کروں تو کس سے۔ میری کون سنے گا'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''مایوس نہ ہو، میں ہوں نا۔ تمہاری ہر مشکل کا حل نکال لوں گا۔ اب فون رکھ کر سو جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ اپنا فون نمبر بتا دو تاکہ میں بھی فون کر لیا کروں''

میں دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا، مگر نیند نہ آئی۔ بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ رابعہ صادق شادی کے بعد رابعہ رضا کہی جاتی مگر میں اسے رابی ہی کہہ کر بلاتا تھا۔ جس کالج میں وہ پڑھتی تھی میں بھی ڈیفنس کے اسی کالج میں اردو کا لیکچرر تھا۔ وہ متمول باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بچپن میں ماں کے انتقال کے بعد اس کے والد نے کئی برسوں کے بعد بیٹی کی پرورش اور نگہداشت کے لیے عزیزوں کے بے حد اصرار پر ایک ایسی خاتون سے شادی کر لی جو مطلقہ تھیں اور چند ہی مہینوں کے بعد ایک حادثہ میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ عدت کے مدت گزارنے اور کئی سال تنہا رہنے کے بعد ان سے شادی کے لیے تیار ہو گئیں۔ صادق علی دولت مند اور خوبرو تھے۔ رابی کی سوتیلی ماں سکینہ نقوی بھرپور جوان اور

ٹپ ٹاپ میں رہتیں۔ رابی کا خیال رکھتیں۔ مگر جیسے جیسے رابی کالج کے ماحول میں رہ کر الٹرا ماڈرن گرلز کے روپ میں برتاؤ کرنے لگی اور ان کے برتاؤ میں فرق آنے لگا۔ وہ باپ کی چہیتی بیٹی تھی۔ شاپنگ کرنا، آزادی سے گاڑی لے کر ڈرائیور کے ساتھ گھومنا پھرنا اس کا روز کا معمول تھا۔ انگلش میڈیم اسکول سے فارغ ہونے کے بعد جب کالج میں گئی تو اور آزاد ہوگئی۔

ایک دن کالج میں اس نے مجھ سے کہا کہ میں آپ سے ٹیوشن پڑھنا چاہتی ہوں۔ میری چند سہیلیاں بھی پڑھنا چاہتی ہیں۔ اردو پڑھانے کے لیے آپ کچھ وقت ہمارے لیے نکالیں۔ میں نے کہا دوری کے سبب میں ڈیفنس میں ٹیوشن نہیں پڑھاتا کیونکہ اورنگی ٹاؤن سے آتا ہوں۔ اتنی دور آنا میرے لیے ممکن نہیں۔

''نہیں سر ہم لوگ تو آپ ہی سے ٹیوشن پڑھیں گے۔ آپ بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔''

''مگر میں مجبور ہوں''

''سر میں آپ کے آنے جانے کے لیے گاڑی کا بندوبست کردوں گی۔ میرے گھر پر تین گاڑیاں ہیں۔ ایک میرے ذاتی استعمال میں رہتی ہے اور ٹیوشن فیس بھی معقول دوں گی اور ہماری چند سہیلیاں جو ڈیفنس میں ہی گھر کے قریب رہتی ہیں آپ سے ٹیوشن پڑھیں گی۔ میری سب سے بات ہوچکی ہے۔''

اس نے اتنے رسان اور شائستگی سے کہا کہ میں انکار نہ کرسکا۔

''میں سوچ کر کل بتاؤں گا۔ تم لوگ بھی اپنے والدین سے بات کر لینا۔ اگر یہ سہولت مجھے مل گئی تو شاید میں حامی بھرلوں۔ میں اورنگی ٹاؤن میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ ان لڑکوں کو وقت بدلنا ہوگا اور کچھ ٹیوشن چھوڑنا ہوگا۔''

وہ مطمئن ہوکر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کلاس میں چلی گئی۔ دوسرے دن وہ پھر میرے پاس آئی اور کہا۔ ''ہم نے اپنے گھر والوں کو بتادیا ہے۔ میری چار سہیلیاں فی کس پانچ ہزار فیس دیں گی اور میں دس ہزار ٹیوشن فیس دوں گی۔ میرے والد کاروباری ہیں وہ مان گئے ہیں۔ گاڑی آپ کو چھوڑے گی اور کالج سے ہی آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔''

ایک لمحہ کے لیے کل تیس ہزار کی رقم میرے ذہن میں آئی اور پھر ساری سہولت۔ میں تیار ہوگیا۔

میں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ اگلے ماہ کی پہلی تاریخ سے میں تمہارے ساتھ چلوں گا تاکہ تمہارا اور دیگر سہیلیوں کا گھر دیکھ لوں۔ ٹھیک ہے؟''

''جی سر۔ تھینک یو۔'' وہ خوش ہوکر کلاس میں چلی گئی۔

ٹیوشن پڑھانے کے دوران میں مجھے رابعہ حق کو جاننے کا موقع ملا۔ وہ بے حد ذہین اور باتونی اور الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ عموماً گھر پر جینس اور ٹی شرٹ پہنتی۔ ڈیفنس فیز فائیو میں اس کی تین منزلہ کوٹھی تھی۔ سب سے اوپر تین کمرے، کھلا سائبان اور واک کرنے کے لیے کھلی طویل چھت۔ گھر میں اس کی سوتیلی ماں جس کے اب تک کوئی اولاد نہ تھی اور والد جن کی کئی شوگر فیکٹری سندھ کے مضافاتی علاقے میں تھیں اور اچھا کاروبار بھی تھا۔ وہ سب سے اوپر کی منزل میں اکیلی رہتی تھی جہاں سے سمندر موجیں مارتا صاف دکھائی دیتا۔ ٹیرس پر ٹھنڈی فرحت بخش ہواؤں کے جھونکے اس کے بالوں سے کھیلتے رہتے جسے وہ بار بار چہرے سے ہٹاتی اور بڑی بڑی روشن آنکھوں سے سرخ ڈورے اسے مسکرانے پر گویا مجبور کرتے۔

اس نے پہلے دن اپنی ماں سکینہ نقوی اور والد صادق علی سے میرا تعارف کرایا۔ پھر اوپر کی منزل میں لے گئی جہاں ٹیوشن پڑھانا تھا۔ پہلے اس نے اپنا بیڈروم دکھایا جس میں آسائش کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ پھر ڈرائنگ روم اور مہمانوں کے لیے ایک اور کمرہ دکھایا۔ سارے کمروں میں خوب صورت پینٹنگ اور جدید آرٹ کے نمونے دیواروں پر آویزاں تھے۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے اورنگی کا تین کمروں والا مکان یاد آیا جس کی راہ داریاں تنگ و تاریک اور کچی زمین کی تھیں۔ کاش! میرا بھی ایسا ہی مکان ہوتا۔ مگر یہ خیال خام تھا جس کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔

رابعہ کو میں اس کے گھر والوں کی طرح رابی پکارنے لگا۔ ٹیوشن پڑھاتے ہوئے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ وہ اردو کے علاوہ کبھی مجھ سے انگریزی بھی پڑھ لیتی۔ مگر میرے بھونڈے انگریزی الفاظ کے تلفظ پر ہنسنے لگتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مجھ سے بڑی بے تکلف اور مانوس ہوگئی تھی۔ اکثر ایسے مشکل سوال پوچھتی جس کا نہ چاہتے ہوئے بھی جواب دینا پڑتا۔

میں نے کئی بار اس کے گھر میں سلیم نامی شخص کو آتے جاتے دیکھا تو میں نے رابی سے پوچھا یہ کون ہیں۔

''سر، یہ میری ماں کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ شادی شدہ ہیں اور ان کے دو بچے بھی ہیں۔ ماں سے انہیں بہت محبت ہے اس لیے اکثر چلے آتے ہیں۔ پاپا کو ان کے بارے میں معلوم ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں۔''

انہی دنوں اس کی قریب کی رشتہ دار بہن کی شادی ہونے والی تھی۔ چنانچہ اس نے مجھے بھی مدعو کرلیا۔ میں نے انکار کیا کہ میں نہیں جاؤں گا، کافی رات ہوجائے گی اور واپسی مشکل ہوگی۔ شہر کے حالات بڑے خراب ہیں، روزانہ کوئی نہ کوئی قتل کردیا جاتا ہے یا بھتہ نہ دینے پر اغوا کرلیا جاتا ہے۔

''نہیں سر، ڈیفنس میں ہی کارلٹن ہوٹل میں شادی ہوگی۔ سمندر کے کنارے کا منظر بڑا خوبصورت لگتا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔ میری سہیلیاں بھی ہوں گی اور گھر والوں سے میں نے کہہ دیا ہے۔'' اس کے مجبور کرنے پر میں تیار ہوگیا۔

شادی کے دوسرے دن اس نے پڑھانے کے دوران میں مجھ سے پوچھا۔ ''سر یہ جملہ عروسی کیا ہوتا ہے۔ شادی کے دوران میں نے کئی عورتوں کی زبانی یہ مشکل لفظ سنا۔'' اس کے چہرے پر تجسس کے آثار تھے۔

''شادی کے بعد دولہا دلہن اپنی آئندہ زندگی گزارنے کا وعدہ کرتے ہیں اور شادی شدہ لڑکا لڑکی ایک ساتھ رات بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنا آپ ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ شادی سے پہلے لڑکی کے دل میں ایک اجنبی شخص سے ہم کلام ہونے اور اس کے بالکل قریب بیٹھنے کا جو خوف ہوتا ہے وہ اس رات کو دُور ہو جاتا ہے اور سارا حجاب دور ہو جاتا ہے۔ مگر تم ایسے سوال کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''سر، اس کے معنی مجھے نہیں معلوم تھے اور بار بار یہی لفظ سن رہی تھی۔ اس لیے اس کا مفہوم جاننا ضروری لگا۔''

''کیا تمہاری شادی شدہ کسی سہیلی نے پہلی رات کے بارے میں نہیں بتایا؟''

''ایسی باتیں کون بتاتا ہے سر۔'' وہ شرما گئی۔

''تم پڑھائی کی طرف دھیان نہیں دے رہی ہو اور فضول سوالات کرتی رہتی ہو۔ تمہاری دیگر سہیلیاں ایسے سوالات نہیں کرتیں۔''

''وہ سب بے وقوف ہیں''۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

اس دن کے بعد میں نے ایسی کوئی اور بے تکے سوال کی اسے بالکل اجازت نہ دی۔

''تم اپنی پڑھائی کی طرف پوری توجہ دو۔''

''سر۔ آج کے بعد کیوں؟ آج مجھے ایک رشتہ دار کی شادی میں جانا ہے۔ گھر کے سب لوگ جا چکے ہیں۔ میں ٹیوشن پڑھ کر چلی جاؤں گی۔ میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے وہ جب آپ کو چھوڑنے جائے تو مجھے پی سی ہوٹل میں ڈراپ کر دے۔''

میں نے اسے غالب کی غزل پڑھانی شروع کی۔ ہر شعر کی تشریح کرتا گیا مگر جب یہ شعر آیا ''ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے'' اس کا مفہوم سن کر اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے بالکل قریب آ گئی۔ ایک لحظہ کو میں چونکا۔

''کیا بات ہے؟''

''سر، مجھے چکر آ رہا ہے۔ کہیں گر نہ جاؤں''

میں اس کی حرکتوں سے بے خبر اسے پڑھاتا رہا۔ پھر اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ میں بوکھلا گیا۔ کہیں اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ گھر پر کوئی ہے بھی نہیں۔

''سر، ''مشتاق'' کا کیا مطلب ہے۔ میں تو رابی ہوں۔ مشتاق تو مرد کا نام ہوتا ہے''

اس نے اس بھولپن سے کہا مجھے ہنسی آ گئی۔

''ارے بے وقوف، یہاں مشتاق کے معنی آرزومند، خواہش مند اور انتظار کرنے والے کے ہوتے ہیں۔ یعنی شاعر کا مطلب ہے کہ میں تو تمہاری آرزو کر رہا ہوں اور تم بیزاری کا اظہار کر رہے ہو۔''

''سر، مجھے زور سے چکر آ رہا ہے۔ میرے کمرے میں اٹھا کر پہنچا دیجیے پلیز!''

میں نے گھبراہٹ میں ایسا ہی کیا اور گود میں اٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور پانی کا گلاس بڑھایا۔ پانی پی کر اس نے مجھے زور سے پکڑ لیا۔ باہر سمندر کی موجیں کنارے سے سر پٹک رہی تھیں اور تیز ہوا سے کھڑکی کے پٹ بجنے لگے تھے۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں لگ رہی تھی۔ اس نے پوری قوت سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے بھی اس کی طبیعت ٹھیک ہو جانے کے خیال سے سپر ڈال دی۔ مگر طوفان بڑھتا ہی گیا۔ کافی دیر بعد جب سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا زور کم ہوا تو میں اس کے کمرے سے واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اس کی طبیعت دریافت کی۔ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے رخصت ہوتے وقت پوچھا کیا یہ چکرا کثر آتا ہے۔

''نہیں سر، آج پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔ سوری آپ کو تکلیف دی۔''

''کوئی بات نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اب تم کو شادی کر لینی چاہیے ورنہ یہ چکر پریشان کرتا رہے گا۔''

''میں شادی نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟''

''بس میری مرضی۔''

''کیا تم کسی کو پسند کرنے لگی ہو؟''

وہ مسکرا کر رہ گئی۔

دوسرے دن جب میں اس کے گھر کی دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اس کی والدہ کے کمرے سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹھک گیا۔ کھڑکی کا پردہ تیز ہوا سے اڑ رہا تھا۔ بے دھیانی میں میری نظریں پردہ پر پڑیں۔ اندر کا منظر کچھ عجیب سا لگا۔ رابی کے انکل سلیم بستر پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی گود میں کوئی تھا جو آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے شدید چکر آ رہا ہے۔ مجھے ایک وارث چاہیے ۔۔۔تم سے۔۔۔! مجھے اپنی گود میں بھر لو نہیں تو میں چکرا کر گر جاؤں گی۔''

انہوں نے پوری طاقت سے اٹھا کر انہیں بستر پر لٹا دیا۔ پھر جو کچھ ہوا ہو گا وہ میں سن نہیں سکا اور سیڑھیاں چڑھ کر رابی کے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ رابی کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا جیسے وہ نہ ہو۔ مگر ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کا کلاس فیلو رضی گھبرایا ہوا کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کے کپڑے بے ترتیب اور بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا جیسے کوئی دیکھ نہ لے۔ میں نے دل میں کہا۔

''بڑے گھروں کے چکر بھی عجیب ہوتے ہیں۔ مگر چکر پھر بھی چلتا رہتا ہے، جیسے نئے زمانے کی گردش ہو۔''

تھوڑی دیر کے بعد رابی شاور لے کر کمرے سے باہر بال خشک کرتی ہوئی ٹیرس میں آئی۔اس کی نظر ڈرائنگ روم کی طرف اٹھ گئی۔اس نے مجھے دیکھا اور حیران ہو کر پوچھا۔

''سر، آپ کب آئے، آج کچھ جلدی آ گئے؟''

''میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔امتحان کے دن قریب ہیں اس لیے پڑھائی تو مکمل کرنی ہے نا۔''

''ضرور، ضرور۔میں ابھی آئی۔''

وہ آئی تو میں اس کے آئینہ چہرہ کو دیکھ کر مسکرایا۔اور جی میں کہا، آج شاید پھر چکر آ گیا تھا۔

''آج پھر شاعری پڑھائیے، اشعار میری سمجھ میں نہیں آتے''

میں انہماک سے پڑھا تا رہا وہ مانو عالمِ بے خودی میں کہیں دور پہنچ گئی تھی۔

دوسری منزل سے انکل سلیم کے خدا حافظ کہنے کی آواز آئی۔اس کا ذہن اس آواز کی طرف مڑ گیا۔

''آئیں۔انکل آج پھر آئے تھے اور اب جا رہے ہیں۔چکر کیا ہے؟''

اس نے آہستہ سے کہا، میں نے اس کی آواز کو اَن سنی کر دیا اور پڑھانے میں مصروف رہا۔اتنے میں باہر کے دروازے کی بیل بجی اور انٹر کام سے ماں کی آواز گونجی جو رابی کے کمرے کے انٹر کام میں بھی سنائی دی۔

''صادق صاحب ہیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''نہیں وہ گھر پر نہیں ہیں، فیکٹری گئے ہوئے ہیں۔''

''آ جائیں تو پوچھیے گا کہ ان کو ''پرچی'' ملی یا نہیں۔ہم ان سے فیکٹری میں مل لیں گے۔''

''پرچی؟ کیسی پرچی''

''انہوں نے آپ کو ''پرچی'' کے بارے میں نہیں بتایا شاید۔ آئیں تو پوچھ لیجیے گا۔''

امتحانات ختم ہو چکے تھے اور نتیجے کا انتظار تھا۔میرے ٹیوشن کی معیاد تو پوری ہو چکی تھی مگر رابی کے چکر بڑھتے جا رہے تھے۔اس لیے اس نے مجھے فارغ نہیں کیا تھا۔وہ گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتی۔ایک دن اس نے بتایا۔

''ممی نے میری شادی زبردستی طے کر دی ہے۔لڑکا امریکہ میں اچھی جاب کرتا ہے اور ممی کا رشتہ دار ہے۔بابا بھی مان گئے ہیں۔دونوں چاہتے ہیں کہ میرے چکر سے چھٹکارا ملے۔میں بے بس ہو گئی اور انکار نہ کر سکی۔انہیں میرے دل کا حال پتہ نہیں۔میں بتاؤں بھی تو کیسے؟''

اس نے شرما کر میری طرف دیکھا۔شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی میں بھی مدعو تھا۔لڑکے علی رضا کی عمر مجھے رابی کے مقابلے میں کچھ زیادہ لگی۔ مگر خوب صورت تھا۔میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا جو بھرا بھرا اور توانا تھا۔آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے جو عموماً شراب کے نشے میں ہوتے ہیں۔ شادی کے چند ماہ بعد ساری کاغذی تیاری مکمل کروا کر وہ رابی کو امریکہ لے گیا۔ اب وہ رابعہ رضا بن گئی تھی مگر میرے دل کے لیے رابی ہی تھی۔

شادی کے چند دنوں بعد میں اس سے ملنے چلا گیا۔مجھے نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے پر سہاگ رات کے بعد جو رونق اور تازگی ہوتی ہے وہ نہیں تھی۔حالانکہ سہاگ رات تو کب سے بیت چکی تھی۔وہ زیادہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔میں نے اسے چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

''اب تو چکر نہیں آتے ہوں گے؟''

وہ مسکرائی اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھا چوری پکڑی گئی ہو۔پھر اس کے بعد میں ہفتوں نہیں گیا۔اس کی سہیلیوں سے پتہ چلا کہ وہ امریکہ جا چکی ہے۔ادھر شادی کے بعد اس کے والد کو تیسری بار ''پرچی'' مل چکی ہے۔فون پر اس کی والدہ نے بتایا کہ دس کروڑ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔اور بھتہ کی پرچی آ چکی ہے۔وہ ذہنی طور پر بہت پریشان ہیں۔روپے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے اور یہ دھمکی بھی مل رہی ہے کہ اگر پولیس یا کسی ایجنسی کو بتایا تو تمہاری خیر نہیں۔

اس کے تھوڑے دنوں بعد رابی کا پھر فون آیا۔اس نے کہا۔

''میں تنگ آ چکی ہوں۔میرے سارے خواب بکھر گئے ہیں۔میں علی رضا سے علیحدہ ہو کر کراچی آ رہی ہوں بہت جلد۔میرا انتظار کرنا۔والد صاحب کی پریشانیوں کا مجھے علم ہو گیا ہے۔انہوں نے فون پر سب کچھ بتا دیا ہے۔آپ مجھ سے ضرور ملنے آیئے گا۔''

جب وہ کراچی پہنچی تو اس کے والد اسے لینے ائیر پورٹ پہنچے۔وہ بھتہ کی پرچی کا انتظام نہیں کر سکے تھے اور متعلقہ اداروں کو اطلاع کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔دھمکی آمیز فون پر انہیں صرف آج بھر کی مہلت ملی تھی۔جو رقم تھی وہ رابی کی شادی پر بے دریغ خرچ کر چکے تھے۔شہر کے حالات کی وجہ سے کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا۔وہ بیٹی رابی کو لے کر جیسے ہی گیٹ پر پہنچے، گھات لگائے ہوئے بندوں نے فائر کھول دیا۔صادق علی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، انہیں سینے اور سر پر چار گولیاں ماری گئیں۔ان کا ڈرائیور بھی اس کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا۔صادق علی فوراً ہی دم توڑ گئے۔محلّہ میں کہرام مچ گیا۔مگر گولی مارنے والوں کا تعاقب کون کرتا۔میں گیٹ پر کھڑا تھا۔رابی اور اس کی ماں شدید زخمی ہو گئی تھیں۔میں نے بڑھ کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور نیم بے ہوش رابی اور ان کی والدہ کو لے کر ہسپتال پہنچا۔رابی کو میں نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔اس نے اسی حالت میں کہا۔

''مجھے بچا لو۔۔۔''

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو''میں آپ کی ہونا چاہتی ہوں۔انکار مت کرنا۔۔۔!!''

صدر ضیا

نصرت بخاری

(اٹک)

رات بھر بادل کڑکتا بلکتا اور تباہی مچاتا رہا۔اس عمل میں طوفانی ہواؤں نے بارش کا پورا پورا ساتھ دیا۔اس وقت ٹی وی مسلسل بولے چلا جا رہا تھا کہ اس بارش نے بعض نشیبی علاقوں کو بری طرح گھائل کیا ہے؛ ساتھ ساتھ متاثرہ علاقوں کی اُجڑی اجڑی تصویریں بھی دکھائی جا رہی تھیں۔غریبوں کے کچے مکانات زمین نے کھینچ لیے تھے۔ہوا کے عفریت نے لوہے کی چادروں کے چھت یہاں سے وہاں پھینک دیے تھے۔پانی کسی غاصب کی طرح قابض تھا۔متاثرین کی آنکھیں غیبی مددگار کو تلاش کر رہی تھیں۔خالہ ریشم کی بیٹی نیلم بھی اِسی شہر میں رہتی تھی،خالہ نے جب ٹی وی کے ذریعے یہ مناظر دیکھے تو اسے اپنی بیٹی کی فکر ہوئی۔اس نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ٹیلی فون کی طرف رخ کیا۔جونہی اس نے بیٹی کا نمبر ملا کر ریسیور کان سے لگایا تو اس کے کان بلبلا اٹھے۔شش شرشش شش جرر جرر کی آواز نے اس کے کان پر گھونسے مارے۔اس نے گھبرا کر ریسیور تو پٹخ دیا لیکن جرر جرر کی آواز جیسے اس کے دماغ میں گھس کر بیٹھ گئی تھی۔

''ایک تو ان ٹیلی فون والوں سے یہ نظام نہ ٹھیک ہوا۔جب بھی بارش ہوتی ہے،اس کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔روز تاروں سے لٹکے رہتے ہیں مگر نہ جانے اللہ مارے کرتے کیا ہیں۔اب نمبر مل تو گیا ہے مگر دوسری طرف کی آواز بھی تو سنائی دے''۔اس نے جھنجلا کر اپنے آپ سے کہا۔

خالہ ریشم کی عمر اس وقت باسٹھ سال سے اوپر ہی تھی۔اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔اگرچہ وہ پڑھا لکھا تھا لیکن سرکاری نوکری کوشش کے باوجود اس کی پہنچ سے دور تھی۔خالہ ریشم اپنے زمانے کی میٹرک پاس تھی۔جے وی کرنے کے بعد بڑی آسانی سے اس نے کسی سرکاری سکول میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔مڈل سکول کی ہیڈ مسٹرس تھی جب اس نے ریٹائرمنٹ لی تھی۔زندگی اسے اپنے برے بھلے سارے رنگ دکھا چکی تھی۔دوسرے پر امن لوگوں کی طرح اس کا دل بھی چاہتا تھا کہ ملک میں خوش حالی ہو،امن وامان ہو،لوگ اتفاق اور اتحاد سے رہیں،جوان بچوں کو نوکریاں ملیں،حکومتی اہل کار رشوت لیے بغیر فٹا فٹ لوگوں کے کام کریں۔مدارس کی آواز ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانے کی بجائے دین کی سربلندی کا ذریعہ بن جائے۔لیکن اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔وہ کوئی وزیر اعظم تھوڑی تھی اور اگر ہوتی بھی کیا تیر مار لیتی۔پہلے بھی تو اتنے وزرائے اعظم اور صدور گزرے ہیں؛کس نے کون سا کام ایسا کیا ہے کہ اس کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا۔اگرچہ اس جدید عہد کے پڑھے لکھے بچے بچیاں اس کی تعلیم کی وجہ سے اس کو ایک معمولی استانی ہی سمجھتے لیکن اپنے وقتوں کی تو وہ پڑھی لکھی عورت تھی؛یہی وجہ تھی کہ اپنے سے زیادہ کسی کو ذہین نہیں سمجھتی تھی۔اخبار کا مطالعہ اس کی عادت بن چکا تھا،کسی زمانے میں ایک سیاسی پارٹی کی پر جوش کارکن تھی؛اور اب صدر ضیا کو قوم کا ہیرو سمجھتی تھی اور ان کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتی تھی۔دیگر سیاسی معاملات بھی اس کی دسترس میں تھے۔وہ جہاں بیٹھتی،کئی موضوعات کی گٹھری کھول دیتی اور بے تکان بولتی رہتی۔اس دوران میں وہ اپنی عمر کی عورتوں اور جوان لڑکیوں کی توجہ جکڑے رکھتی۔

خالہ ریشم کو آرام نہیں آ رہا تھا۔اس نے کچھ دیر کے بعد پھر بیٹی کا نمبر ملایا۔اگرچہ جرر جرر جرر کی ناخوش گوار آواز اب بھی اس کی سماعت سے الجھ رہی تھی مگر اس میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔

''ہیلو!''دوسری طرف ایک مردانہ بھاری بھرکم آواز ابھری۔

''ہیلو!مجھے نیلم سے بات کرنی ہے۔میں اس کی امی ریشم بات کر رہی ہوں''۔

اگرچہ فون پر جرر جرر کی آواز مسلسل مداخلت کر رہی تھی لیکن پھر بھی دوسری طرف کی بات کی سمجھ آ رہی تھی۔

''آپ نے کہاں نمبر ملایا ہے۔یہ نیلم کا گھر نہیں''۔دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

''پھر کس کا گھر ہے''۔اس نے حیرانی سے پوچھا۔دوسری طرف سے کچھ کہا گیا لیکن جرر جرر کے شور نے اسے نگل لیا۔

''جی؟''اس نے پھر پوچھا

''میں صدر ضیا الحق۔۔۔۔''جرر جرر کا شور بڑھ گیا تھا تاہم صدر ضیا الحق تو اس نے صاف سن لیا تھا۔

''ضیا الحق؟اررررے ضیا بیٹا!آخر آپ سے ملاقات ہو ہی گئی۔میں تو کتنے عرصے سے آپ کی تلاش میں ہوں۔آپ کو معلوم نہیں ہوگا کہ میں آپ کی کتنی بڑی فین ہوں۔آپ کے لیے دن بھر لوگوں سے لڑتی ہوں۔آپ کے مخالف آپ پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں؛جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔اسی سلسلے میں میرا کئی بار دل چاہا کہ آپ کے دفتر میں آؤں مگر بھلا مجھ غریب کو آپ سے کون ملنے دے گا،بس اسی وجہ سے میں نہیں آئی۔مگر دیکھیے نا!خدا نے ہماری کیسے ملاقات کرا دی۔

دوسری طرف سے کوئی بات کی گئی مگر اس دفعہ جرر جرر جرر کا شور اسے پی گیا لیکن اس نے ضیا صاحب کو محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ ان کی بات کی اس کو سمجھ نہیں آئی۔اس نے اس انداز میں ان کو گول مول جواب دیا کہ جیسے وہ ان

کی بات سمجھ گئی ہے۔

''جی جی۔آپ کی بات ٹھیک ہے بیٹا،لیکن میری بھی تو سنیں نا۔ میں جانتی ہوں آپ بہت مصروف ہوں گے لیکن خدا کے لیے فون بند نہ کرنا؛ میں نے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں''۔

''دیکھیے !میں کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔''جرر جرر کے شور نے پھر یلغار کردی اور خالہ ریشم کی سماعت اس شور میں لفظوں کو نہ پہچان سکی۔

''صدر صاحب !آپ کے پاس وقت بہت کم ہوگا اس لیے میں مطلب کی بات کرتی ہوں۔ایک تو اس کم بخت بارش نے سارا نظام خراب کردیا ہے۔دوسرے یہ محکمہ نکمے آدمیوں سے بھرا پڑا ہے۔آپ ان فون والوں کو ذرا ڈانٹا کریں۔ یہ کوئی کام نہیں کرتے۔یہی حال بجلی والوں کا ہے۔ہر کوئی پیسے بٹورنے میں لگا ہوا ہے۔؟اس نے لہجہ مہذب رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن پھر بھی تلخی کا دھندلا سا ذائقہ محسوس ہوتا تھا

''دیکھیے محترمہ میری بھی تو کچھ سن لیں''۔ضیا صاحب نے کہا:

''نہیں بیٹا،آج آپ نے صرف میری بات سننی ہے۔اور میرے سوالوں کا جواب دینا ہے۔ہم تو آپ کی بہت باتیں سنتے ہی رہتے ہیں۔اگرچہ میں سیاست دان نہیں ہوں لیکن یہ بات سب کو معلوم ہے کہ میں آپ کی پرستار ہوں؛اسی لیے جا بہ جا میرے سامنے مخالفین آپ پر الزام لگاتے ہیں کہ بھٹو کو پھانسی امریکہ کے کہنے پر دی گئی؛اور آپ امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔کیا یہ سچ ہے؟ بیٹا لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے اس بات کا معاوضہ لیا ہے۔پر بیٹا لوگوں کا کیا ہے؛یہ تو باتیں بناتے ہی رہتے ہیں۔انھیں تو بھونکنے کی عادت ہے۔بھونک بھونک کے چپ ہو جائیں گے۔''

دوسری طرف سے کوئی بات کی گئی۔غالباً صدر صاحب کوئی وضاحت پیش کررہے تھے لیکن خالہ کی ضعیف سماعت جرر جرر کے شور میں اسے تلاش نہ کرسکی۔ویسے بھی خالہ کو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔اسے یقین تھا کہ ضیا صاحب نے جو کچھ کیا ہے ملک وقوم کی بہتری کے لیے کیا ہے۔یہ سوال تو وہ اپنی معلومات میں اضافے کے لیے کررہی تھی؛تاکہ جب کبھی ضرورت پڑے تو وہ مخالفین کو چاروں شانے چت کرسکے۔

''بیٹا اخبار والے لکھتے ہیں کہ آپ گن پوائنٹ پر حکومت پر قابض ہوئے،اور گن پوائنٹ پر حکومت چھیننے والے ڈکٹیٹر کبھی الیکشن نہیں کرواتے۔میں تو ان کو یقین دلاتی رہتی ہوں کہ جونہی حالات بہتر ہوئے،آپ الیکشن کروادیں گے۔بیٹا میں نے کوئی غلط تو نہیں کہا نا؟ آپ بھی تو اپنی تقریروں اور بیانات میں یہی کہتے ہیں اور آپ نمازی پرہیزگار انسان ہیں۔آپ بھلا وعدہ خلافی کرسکتے ہیں؟ کیا ہوا جو الیکشن ابھی نہیں ہوئے۔کبھی نہ کبھی تو ہو جائیں گے۔''

دوسری طرف سے آنے والی آواز ایک بار پھر جرر جرر جرر کے شور میں دب کر دم توڑ گئی؛لیکن خالہ نے حسب معمول پہلے سوال کا جواب وصول کرنے سے پہلے ہی اگلا سوال داغ دیا۔

''بیٹا بعض غدار قسم کے کالم نگار کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب کا اصلی جرم ایٹم بم بنانا اور اسلامی کانفرنس منعقد کرانا تھا۔اور یہ باتیں امریکہ کو اچھی نہ لگیں،اسی کی ان کو سزا دی گئی۔قتل کے جرم میں تو خواہ مخواہ ان کو پھنسایا گیا؛''

''بیٹا میں سب جانتی ہوں؛ یہ حاسد آپ سے حسد کرتے ہیں ؛ورنہ سب کو پتا ہے کہ ایٹم بم تو اس کا احسان ہے۔ایٹم بم نہ ہوتا تو دشمن ہمیں ابھی تک کھا نہ جاتا؟''عادت سے مجبور خالہ نے سیاسی گتھری کھول لی۔

جرر جرر جرر کے شور میں ضیا صاحب نے کوئی لمبی چوڑی بات کی جس سے خالہ ریشم کی سماعت کوئی مفہوم نہ اخذ کرسکی البتہ اتنا ضرور سن لیا کہ''مجھے اس معاملے کا کیا پتا''۔

''میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ آپ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔وہ تو آپ کا محسن تھا اور آپ جیسا مرد مومن احسان فراموش تھوڑی ہوسکتا ہے۔اس کے علاوہ بیٹا یہ جو مجرموں کو کوڑے مارے جارہے ہیں؛بعض مخالفین کہتے پھرتے ہیں کہ آپ سیاسی مخالفوں کو سزائیں دے رہے ہیں یا ان صحافیوں کو جو آپ کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے''۔

ضیا صاحب نے جو جواب دیا وہ اس بار بھی خالہ نہ سن سکی؛لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس کے سوالوں کا صدر صاحب نے کوئی معقول جواب ہی دیا ہوگا۔

''اور دیکھیں! یہ شیعہ،سنی پہلے بھی یہاں رہتے تھے مگر اب فساد بہت زیادہ ہوگیا ہے؛روزانہ کہیں نہ کہیں لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے۔مسجدوں اور امام بارگاہوں پر حملے ہورہے ہیں۔لوگ مررہے ہیں۔بیٹا! آپ کے دشمن کہتے ہیں کہ صدر صاحب کی مرضی سے یہ سب کچھ ہورہا ہے۔بھلا اس لڑائی جھگڑے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؛آپ تو پہلے ہی بادشاہ ہو؛اور آپ کو کیا چاہیے۔مگر بیٹا ایک بات تو ہے نا۔آپ ملک کے حاکم ہو۔اس فساد کو ختم تو کرا سکتے ہو؛تو پھر یہ جھگڑا ختم کیوں نہیں ہوتا؛ان قتل وغارت کرنے والوں کو سزا کیوں نہیں ملتی''۔

اس بار دوسری جانب سے کوئی نہ بولا تو خالہ سمجھی شاید صدر صاحب نے اس کی باتوں سے اکتا کر فون رکھ دیا ہے۔اب خالہ کو کون بتائے کہ یہ باتیں نہیں تھیں بلکہ سنگین الزامات تھے؛اور الزامات بھی وہ جو مخالفین ان پر دھرتے تھے۔

''ہیلو!''خالہ نے اپنا شک دور کرنے کے لیے کہا

''جی میں سن رہا ہوں''۔اس بار بڑی صاف آواز سنائی دی۔

باقی صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ کیجیے

پاگل

وقار مسعود خان

(لیہ)

مانی اُس گنجے اور ہلکی پھلکی گندی داڑھی والے نوجوان کو پکڑ کر سردار مبارک خان کے پاس لایا تھا۔ نیلے رنگ کی بوسیدہ شلوار قمیض میں مجنوں نظر آنے والے اُس نوجوان کی داڑھی خاک سے اَٹی پڑی تھی۔ یہ نوجوان سردار مبارک کی حویلی کے سامنے سویا ہوا ملا تھا۔

صبح نو بجے کے قریب جب حویلی کا ملازم مانی کسی کام کے لئے باہر نکلا تو اس گنجے نوجوان کو حویلی کے سامنے سوتا ہوا پایا۔ حیران ہوتے ہوئے مانی اُسے جھنجھوڑنے لگا.....

او بھیا کون ہو تم اور یہاں کس لئے سو رہے ہو؟

گنجا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے صورت حال کا جائزہ لیا اور شکایتی نظروں سے مانی کو ایسے دیکھنے لگ گیا جیسے شکوہ کر رہا ہو کہ اسے اتنی میٹھی نیند سے کیوں جگا دیا۔

کون ہو تم اور یہاں حویلی کے سامنے کس لئے سو رہے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ مانی پھر گنجے سے پوچھنے لگا۔

گنجے نے مانی کی طرف اِس طرح دیکھا جیسے اس نے کچھ پوچھا ہی نہ ہو۔ پھر اچانک بول پڑا ''مم.....میں.....میں شفقت.....گنجے نے اوپر والے دانت نچلے ہونٹ پر زور سے جما دیئے.....میں .....شفقت..... اوو.....اودھر سے آیا.....اودھر سے.....گنجے نے حویلی کی طرف اشارہ کیا''۔

مانی نے حیران ہو کر حویلی اور گنجے کو دو مرتبہ دیکھا اور شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے، وہاں تو سردار صاحب رہتے ہیں، کیا پاگل خانے سے بھاگ کر آئے ہو؟

''میں.....ہی ہی.....گنجا پھر اوپر والے دانت جبڑوں پر زور سے جما کر ہنسا.....ہی ہی.....میں .....نئی.....پاگل نئی.....میں شفقت.....میں اُدھر رہتا.....اودھر'' گنجے نے پھر حویلی کی طرف اشارہ کیا ''مجھے اودھر جانا''۔ گنجا یہ کہہ کر امید بھری نظروں سے مانی کی طرف دیکھنے لگ گیا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی خاک آلود داڑھی میں خارش کر رہا تھا۔

مانی جھنجھلا کر رہ گیا۔ چل اُٹھ یہاں سے، تو شفقت ہے یا پاگل جو بھی ہے کہیں اور جا کر سو۔ مانی اسے حویلی سے دور دھکیلنے لگا۔

گنجے نے ایک مرتبہ پھر شکایتی نظروں سے مانی کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لئے ایسا تاثر دیا جیسے کہ وہ خود ہی شرافت سے حویلی سے دور جانے لگا ہے، پھر یکدم وہ مڑا اور اس نے پوری قوت کے ساتھ حویلی کی طرف دوڑ لگا دی۔

مانی جو ابھی سکون کا سانس لینے ہی لگا تھا، گنجے کو حویلی کی طرف بھاگتا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے لپک کر گنجے کو بازو سے پکڑا اور بمشکل اسے مزید بھاگنے سے روک سکا۔

''چھوڑ.....چھوڑ مجھے.....مجھے اُودھر جانا'' گنجے نے پورا زور لگا کر مانی کو دھکا دیا اور چیختے ہوئے حویلی کے صحن میں داخل ہو گیا۔ چار و نا چار مانی نے ہار مانی اور جلدی سے دوڑ کر گنجے کے سامنے پہنچ گیا جو اندرونی عمارت میں داخل ہونے کو تھا۔ مانی جو اِس تگ و دو کے نتیجے میں تھک کر زور زور سے ہانپ رہا تھا، منمناتے ہوئے بولا.....

لے جاتا ہوں ذرا آرام تو کر، اگر تو اس طرح اندر داخل ہو گیا تو سردار میری جان نکال دے گا۔ سانس لینے دے، مانی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

گنجے نے جواب میں پورے کے پورے دانت نکال دیئے اور اپنے سر پر خارش کرنے لگا جیسے کہ مانی کے سانس اترنے کا انتظار کر رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد مانی اور گنجا دونوں سردار کے سامنے موجود تھے اور مانی سردار کو پچھلے آدھے گھنٹے کی تفصیل سنا رہا تھا۔

گنجا اُن دونوں کی پریشانی اور گفتگو سے بے نیاز اپنی داڑھی اور گنج کھجاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے کہ اُسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔

جیسے ہی مانی نے اپنی رام کہانی ختم کی، سردار نے پریشان ہو کر گنجے سے پوچھا ''تم شفقت ہو؟''

ہاں! گنجے نے دانت نکالتے ہوئے پورے کا پورا سر اوپر نیچے ہلا دیا تو شفقت! تم کہاں سے آئے ہو؟

گنجا نوجوان جو پیچھے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا یکدم سردار کی طرف متوجہ ہوا اور پیچھے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''وہ.....اودھر سے آیا.....میں شفقت'' گنجے نے پھر سے دانت نکال دیئے۔

سردار تحکمانہ لہجے میں بولا، مانی ٹھیک کہہ رہا تھا، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ تم پاگل ہو۔ مانی تم تھانے میں جا کر رپورٹ کرو کہ ایک پاگل آدمی زبردستی حویلی میں گھس آیا ہے۔

جیسے ہی گنجے نے سردار کا حکم سنا، اس نے ایک لمبی چھلانگ بھری اور سردار کے پاؤں میں آن پڑا

سردار ڈر کے یکدم پیچھے ہٹ گیا

گنجا گڑگڑانے لگا ''میں.....میں پاگل نئی.....میں شفقت..... میں پاگل نئی'' اِس کے ساتھ ہی وہ زور زور سے رونے لگ گیا اور اُس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

سردار اور اس کا نوکر مانی دونوں اس صورتحال سے جھنجھلا کر رہ گئے۔

باقی صفحہ ۷۱ پر ملاحظہ کیجیے

افسانچے

انورانجم
(مالیرکوٹلہ، بھارت)

نیادھندا

''یاراس مرتبہ تو بے موسمی بارش نے سارا دھندا ہی چوپٹ کر کے رکھ دیا۔۔۔'' شام نے اپنے دوست کالو سے کہا۔

''کمال ہے۔۔۔؟ تمہارا ایسا کون سا دھندا تھا جو بارش کی وجہ سے چوپٹ ہوگیا۔۔۔؟'' کالو نے حیرانی سے دریافت کیا۔

''کیا بتاؤں یار۔۔۔لوگوں سے جلدی بارش لانے کے لیے ہم کچھ دوست یگیہ کرنے کے بہانے روزانہ تین چار سو اکٹھا کر لیتے تھے اور خوب عیش کرتے تھے۔۔۔معلوم نہیں خدا کو کیا جلدی پڑ گئی بارش لانے کی۔۔۔ ہمارا اچھا خاصا دھندا چوپٹ کر ڈالا۔۔۔'' شام نے وضاحت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

شیطان کی فریاد

''اے خالق دنیا! میں ہمیشہ کے لیے تیرے پاس رہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔۔۔'' شیطان نے آسمانوں پر پہنچ کر التجا بھرے لہجے میں خدا سے عرض کی۔

''مگر کیوں۔۔۔؟'' خدا نے اس سے وجہ جاننی چاہی۔

''کیونکہ ساری دنیا میں میرے نام کا ڈنکا بج رہا ہے اور انسان تمہاری جگہ اب مجھے اپنا دیوتا یعنی خدا ماننا چاہتا ہے۔۔۔''

شیطان نے مایوس ہو کر کہا۔

''تو پھر تمہارا ہمارے پاس آنے کا مطلب؟ جبکہ دنیا میں تمہاری شہرت پورے عروج پر ہے!''

خدا نے اُس سے اگلا سوال پوچھا۔

''پروردگار عالم!۔۔۔میں نے آج تک دنیا میں صرف برے کام ہی کئے ہیں۔اس لئے چاہتا ہوں کہ تیرے پاس رہ کر تیری عبادت کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کردوں۔ کیونکہ اب میں ایماندار بننا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شیطان نے گردن جھکالی۔

''ایماندار اور تم۔۔۔؟'' خدا نے حیرانی سے شیطان کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''ہاں میرے خدا۔۔۔ میں حقیقت میں ایماندار بننا چاہتا ہوں کیونکہ آج کا انسان بے ایمانی میں مجھ سے کئی گنا آگے نکل گیا ہے!''

سوچ

''خدا کرے اس مرتبہ بارش ہی نہ ہو۔۔۔'' ایک چھوٹے سے لڑکے نے اپنے دوست سے کہا۔

''ارے بیوقوف!۔۔۔لوگ تو بارش کے لیے منتیں مانتے ہیں اور خدا سے دعائیں مانگتے ہیں۔۔۔تو کیوں بارش نہ ہونے کی بددعا دے رہا ہے۔۔۔؟'' اس کے دوست نے دریافت کیا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان دنوں روزانہ یگیہ کر رہے اور لنگر لگا رہے ہیں۔میرے جیسے ہزاروں غریب جنہیں پیٹ بھرنے کے لیے روزانہ روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ہر روز حلوہ، چاول چھولے پوری جیسی بڑھیا چیزیں کھاتے ہیں اگر بارش ہوگئی تو میں اپنا پیٹ کہاں سے بھروں گا۔۔۔؟'' چھوٹے لڑکے نے جواب دیا۔

پرایا درد

جب ذیلدار ہرنام سنگھ کی بیوی نے تیسری مرتبہ بھی لڑکی کو ہی جنم دیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ بہت مایوس ہو گیا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گوردوارے پہنچا اور گورو گرنتھ صاحب کی حضوری میں ارداس کرنے لگا۔

''واہگورو!۔۔۔سچے پادشاہ۔۔۔!! میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے، جو مجھے ہر مرتبہ لڑکی سے نوازتا ہے۔ان لڑکیوں کے بجائے تو میں بے اولاد ہی ٹھیک تھا۔اے واہگورو!۔۔۔اگر دینا ہی ہے تو مجھے ایک لڑکا عطا کر میرا وارث اور خاندان چلانے والا۔۔۔'' ہرنام سنگھ اپنی ارداس میں محو تھا اتنے میں گاؤں کا سرپنچ سادھو سنگھ، جس کی کروڑوں کی جائیداد تھی، گوردوارے میں داخل ہوا اور گورو گرنتھ صاحب کی حضوری میں سر بسجود ہو کر اس طرح گڑگڑانے لگا۔

''واہگورو!۔۔۔تیرے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔ مجھے بھی ایک اولاد بخش دے، میں تجھ سے لڑکا تو نہیں مانگتا۔۔۔خواہ مجھے ایک لڑکی ہی عطا کر دے۔تاکہ میں بھی باپ کہلانے کا سکھ حاصل کر سکوں۔۔۔مجھ پر کرپا کر۔۔۔ کہیں میں اس سنسار سے بے اولاد ہی نہ چلا جاؤں۔۔۔''

سرپنچ سادھو سنگھ کے پرارتھنا سن کر ذیلدار ہرنام سنگھ خدا کا شکر ادا کرتا ہوا گوردوارے سے اپنے گھر کی جانب لوٹ پڑا۔گھر پہنچ کر وہ اپنی نوزائیدہ بچی کو اس طرح پیار کرنے لگا جیسے اسے کوئی نایاب خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

بوجھ

''جنوری کا مہینہ ختم ہوگیا ہے لیکن ابھی تک آپ نے اپنی ماں کو یہیں رکھا ہوا ہے۔اپنے بھائی کے ہاں چھوڑ کیوں نہیں آتے۔۔۔؟ کیا اس مہینے بھی اپنی ماں کو یہیں رکھنے کا ارادہ ہے۔۔۔؟'' سنیتا نے اپنے پتی سبھاش سے پوچھا۔

دراصل سبھاش کی شادی کے بعد وہ اور اس کے بھائی رمیش نے گھر کی ہر چیز کا بٹوارہ کر لیا تھا۔مگر اپنی ماں کو اپنے پاس نہ رکھنے کے لیے دونوں بھائیوں کی دلہنوں کا ان پر دباؤ تھا۔لہٰذا بہت سوچ وچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ ماں

ایک ماہ سبھاش کے پاس رہا کرے گی اور دوسرے ماہ رمیش کے پاس۔ فیصلے کے مطابق ماں کو فروری ماہ میں رمیش کے پاس اور مارچ میں سبھاش کے پاس رہنا تھا مگر سبھاش نے رمیش سے کہا کہ مارچ ماہ میں اسے ضروری کام سے ٹور پر جانا ہے اس لیے فروری ماہ میں بھی ماں کو اس کے پاس ہی رہنے دیا جائے۔ اگلے دو ماہ وہ خود ماں کو رکھ لے۔ اس لیے وہ اپنی پتنی سنیتا کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ڈیئر ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔میرے دھیان میں آیا کہ مارچ کی نسبت اس ماہ دو دن کم ماں کو اپنے پاس رکھنا پڑے گا اس لیے رمیش کو بہانہ بنا کر مارچ کی بجائے فروری مہینہ ماں کو رکھنے کے لیے لے لیا۔''

محفوظ جگہ

اس بار الیکشن میں میری ڈیوٹی بطور پریذائیڈنگ افسر لگی تھی اور میری خوش قسمتی تھی کہ جو بھی سٹاف میرے ساتھ تھا ان میں سے کوئی شراب نہیں پیتا تھا۔ چونکہ الیکشن پنچایتوں کے تھے اس لیے امیدوار انتخابی عملے کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ گاؤں کے سرپنچ صاحب میرے کمرے میں آئے اور دریافت کرنے لگے۔

''آپ کو دارو کی کتنی بوتلیں چاہئیں؟''

میں نے جواب دیا۔''ایک بھی نہیں۔ کیونکہ ہماری ساری ٹیم میں کوئی شراب نہیں پیتا۔''

اس پر سرپنچ صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔میں آپ کے لیے کولڈ ڈرنک کی بڑی بوتل بھجوا دیتا ہوں۔۔۔'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

چند منٹوں بعد وہ میرے کمرے میں آئے اور کولڈ ڈرنک کی دو بڑی بوتلیں اور ایک دارو کا ڈبہ میرے ٹیبل پر رکھ دیئے۔

اس پر میں نے حیرت سے کہا۔

''کمال ہے۔۔۔میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم میں کوئی بھی شراب پینے والا نہیں ہے۔۔مگر اس کے باوجود آپ نے دارو۔۔۔!!''

سرپنچ صاحب نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا۔

''ناراض کیوں ہوتے ہو۔۔۔پریذائیڈنگ افسر جی۔۔۔میں نے سوچ سمجھ کر ہی دارو کا ڈبہ آپ کے کمرے میں رکھا ہے۔۔۔اس سکول میں جتنی بھی پولنگ پارٹیاں ٹھہری ہیں سبھی میں کئی کئی دارو پینے والے موجود ہیں۔ جو سارا ڈبہ منٹوں میں ڈکار لیں گے۔ اس لیے دارو رکھنے کے لیے اس کمرے سے محفوظ جگہ کوئی نہیں۔۔۔یہاں سے ہم اپنے حساب سے دارو کی سپلائی کر سکیں گے۔۔۔!!''

بقیہ: پاگل

گنجے نے گندے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگا''میں بھوکا.....کھانا.....کھانا کھانا.....پھر.....میں اودھر.....میں چلا جاؤں گا''

سردار نے سوچا شاید کھانا کھلا دینے سے جان چھوٹ جائے گی، اس نے مانی سے کھانا منگوا بھیجا۔

گنجا نوجوان کھانا دیکھتے ہی ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا، اس نے اپنے گندے کپڑوں سے ہاتھ اور اپنے تھوکوں والے ہونٹ صاف کئے اور اس طرح کھانے میں مصروف ہو گیا جیسے صدیوں کا بھوکا ہو۔ کھانا ختم ہوا تو سردار نے اپنے نوکر کو حکم دیا کہ اب اسے بازو سے پکڑو اور گھر سے نکال باہر کرو۔ یہ کہہ کر سردار اٹھا اور زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔

زنان خانے میں داخل ہوا تو ساتھ والے کمرے میں اسے اپنی بیٹی اور بیوی بیٹھی نظر آئیں۔ اس کی بیٹی سونی مبارک یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر کے چند ماہ ہوئے واپس گھر لوٹی تھی۔ یونیورسٹی میں میسر آزادی کی بجائے وہ گھر میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں وہ اپنا زیادہ وقت ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزارتی تھی۔ سردار دونوں ماں بیٹیوں کو اکٹھے بیٹھا دیکھ کر ان کی طرف بڑھ گیا اور انہیں چند لمحوں پہلے کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ ابھی اس کی بات درمیان میں ہی تھی کہ انہیں اپنے ملازم مانی کی زوردار چیخ سنائی دی۔ وہ تینوں چونکے اور دوڑ کر ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گنجے نوجوان نے اپنے دانت سختی سے مانی کے بازو میں گاڑ رکھے ہیں اور مانی درد سے بلبلا رہا ہے۔

گنجے نے جب اُن تینوں کو آتے دیکھا تو اس نے مانی کا بازو چھوڑ دیا اور فاتح نظروں سے سردار اور اس کے ساتھ آنے والی خواتین کی طرف دیکھنے لگ گیا۔ وہ تینوں ڈرتے ہوئے دروازے پر ہی رک گئے۔ سردار اور اس کی بیوی سے ہوتے ہوئے گنجے کی نظر سونی مبارک پر پڑی اور سونی نے بھی کم و بیش اُسی وقت اسے دیکھا، گنجے کی آنکھوں میں دیکھتے ہی سونی مبارک لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکی اور اور اس کا پورا بدن لرز کر رہ گیا۔ اِس لمحہ بھر کا ٹھٹکنا وہاں موجود کوئی اور شخص محسوس نہ کر سکا تھا۔

گنجا دوڑ کر سردار کی بیوی اور بیٹی کے سامنے پہنچا اور اپنے اوپر والے دانت نچلے ہونٹ پر گاڑتے ہوئے بولا''میں.....میں شفقت.....میں.....میں اودھر سے آیا.....میں پاگل نئی.....میں شفقت.....میں پاگل نئی'' اس نے پہلے کی طرح ہونٹوں میں دانت گاڑے، ہنستے اور خوش ہوتے ہوئے سونی کو نظر بھر کے دیکھا اور اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے سردار کی طرف مڑ کر بولا''میں.....میں پاگل نہیں.....پاگل یہ ہے'' یہ کہتے ہی اس نے باہر کے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ مانی بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ جبکہ سونی کا دل ڈھم ڈھم بجتے ڈھول کی طرح دھک دھک کرتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں اس گنجے پاگل نوجوان کے پکڑے جانے کا خوف منڈلا رہا تھا۔

''حسرتوں کا بوجھ''

کرامت بخاری (لاہور)

منزلیں پاکر اُنہیں کھویا کرو — راستوں میں راستے بویا کرو
دیکھ لے گی دن کو دنیائے دنی — رونے والو رات کو رویا کرو
ہو نہ جائے بار یہ بارِ گراں — حسرتوں کا بوجھ مت ڈھویا کرو
جاگتے رہنا اگر سوجائے بخت — بخت ہو بیدا ر تو سویا کرو
گر طلب پیدا ہو طیبہ کے لیے — آنسوؤں سے صحنِ دل دھویا کرو
ہر دعا کا بیج ہوگا بارور — تم ہتھیلی میں اسے بویا کرو
ہے کرامتؔ غم سے ہی غم کا علاج — غم ملیں تو اور خوش ہویا کرو

○

شاہین زیدی (لاہور)

وہ ملتا ہے اجنبی کی طرح وہ نقش سارے مٹا رہا ہے — نہیں ہے ممکن اُسے پتہ ہے وہ خود کو یوں آزما رہا ہے
پکاروں اس کو تو میری جانب پلٹ کے وہ دیکھتا نہیں ہے — جو اس نے مجھ سے کیے تھے وعدے وہ رفتہ رفتہ بھلا رہا ہے
وہ چھوڑ کر مجھ کو دور جا کر کہیں بسائے گا اپنی دنیا — بہت دنوں سے یہ واہمہ سا عجیب مجھ کو ستا رہا ہے
وہ کہہ رہا ہے گزرتے موسم کی طرح مجھ کو تُو بھول جانا — نہیں ہے ممکن کہ لوٹ آؤں وہ فیصلہ یہ سنا رہا ہے
اُجاڑ موسم، اُداس شامیں جو تجھ سے پہلے بھی آرہی ہیں — ہوا ہے شاہینؔ یہ گماں سا خزاں کا موسم پھر آرہا ہے

○

ظریف احسن (کراچی)

عجب وحشت سی طاری ہے — چلو ہم خود سے ملتے ہیں
ہمی موجود ہیں تم میں — سو ہم خود سے ہی ملتے ہیں
ملن کے روپ میں تم ہو — سراپا خواب سجتے ہیں
ہم اپنے ساتھ ہی کب ہیں — تمہارے ساتھ رہتے ہیں
نہ مل پائیں اگر اب بھی — تو پھر خود سے بچھڑتے ہیں
اگر خدشہ تعلق ہے — تو ہم ذرّوں میں اُڑتے ہیں
زمیں کی گود خالی ہے — چلو آباد کرتے ہیں
اگر یہ شام ہے آخر — تو پھر مٹی پہنتے ہیں
ظریفؔ احسن کے قصّے کو — سبھی کیوں یاد کرتے ہیں

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

ایک انجان سی تصویر تھی، دیوار کے ساتھ
اور اُبھرتی ہوئی تحریر تھی، دیوار کے ساتھ

سرسری دیکھ کے کچھ بھی نہیں آیا تھا نظر
غور سے دیکھا تو تصویر تھی، دیوار کے ساتھ

گزرے اور آتے ہوئے پل نظر آتے تھے سبھی
گویا لکھی ہوئی تقدیر تھی، دیوار کے ساتھ

سوچنے پہ بھی بہت حل نہ ملا مشکل کا
جبکہ چپکی ہوئی تدبیر تھی، دیوار کے ساتھ

ساری خوشیوں کو بہا کر جوں ہے سیلاب گیا
کوئی آزردہ و دیگر تھی، دیوار کے ساتھ

چلنا جب چاہا تو رستے نے نہیں ساتھ دیا
کیونکہ پھیلی ہوئی زنجیر تھی، دیوار کے ساتھ

عمر بھر ہم سے وہی خواب نہیں دیکھا گیا
جس کی دیکھی ہوئی تعبیر تھی، دیوار کے ساتھ

○

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

(سکھر)

زمانے میں مری جاں کیا نہیں ہے!
مگر یہ ذہن کہ بھٹکا نہیں ہے

گزر جاتا ہے وہ دوشِ صبا پر!!!
مری بستی میں تو رکتا نہیں ہے

بہت دن سے پریشاں ہے طبیعت
بہت دن سے تمہیں دیکھا نہیں ہے

بس اک تم ہی نہیں ہو پاس مرے
وگرنہ! پاس میرے کیا نہیں ہے!

سناؤں کس کو میں رودادِ ہستی!
انیسؔ جاں کوئی ملتا نہیں ہے

○

زاہدہ عابد حناؔ

(لاہور)

ترے خیال کی نازک کلی ہے کیا کہیے؟
مگر جو وقت کی آندھی چلی ہے کیا کہیے؟

سنبھالنا دلِ ناداں کو اب قیامت ہے
تری جدائی کی نازک گھڑی ہے کیا کہیے؟

میں زخم زخم سی پوروں سے چن رہی ہوں گلاب
کہ چاہتوں کی عجب بے خودی ہے کیا کہیے؟

ستارے درد کے اترے ہوئے ہیں پلکوں پر
یوں کہکشاؤں کی دنیا سجی ہے کیا کہیے؟

ترے جہان میں یوں بھی تو اہلِ فن کے لیے
عذابِ سوزِ غمِ آگہی ہے کیا کہیے؟

شرابِ عیش میں ڈوبے ہوئے ذرا سن لیں!
کتابِ زیست لہو سے لکھی ہے کیا کہیے؟

جہاں بلند ہوا سر کسی کا نیزے پر!
یہ زندگی وہیں ٹھہری ہوئی ہے کیا کہیے؟

حسینؓ ہے نہ کہیں کربلا، حناؔ پھر بھی!
یذیدیت ہے، عجب تشنگی ہے، کیا کہیے؟؟

○

نورزمان ناوک (تلہ گنگ)

یونہی کب جمگھٹا مقابل ہے — وجہِ حرص و ہوا مقابل ہے
بحرِ ادراک بھی سراب ہوا — کیسی گنجلک کتھا مقابل ہے
پیاس کو لفظِ رائگاں نہ سمجھ — درسِ صبر و رضا مقابل ہے
گل نہایت سے بے خبر ہے ابھی — جذبِ نشو ونما مقابل ہے
موڑ آیا یہ کیا کہانی میں — مضطرب مامتا مقابل ہے
کچھ سرکنے لگا ہے اندر سے — جب سے زعمِ انا مقابل ہے
آج تتلی ہے کیوں پریشاں سی — کیا؟ وہ رنگِ قبا مقابل ہے
آگہی سے مری بصیرت میں — آئے دن اک خلا مقابل ہے
آئنہ بھر گیا غبارت سے — اعترافِ خطا مقابل ہے
کرب سے مر رہا ہے سناٹا — ایک جھینگر صدا مقابل ہے
میں تو شامل تھا بس کہاروں میں — کیوں مجھے رت جگا مقابل ہے
مفلسی ہوں پہ خوں حرارت سے — آرزوئے حنا مقابل ہے
اپنی رائے بھی خوب ہے ناوکؔ — ہر جگہ التوا مقابل ہے

احمد ظہور (اسلام آباد)

فکرِ معاش نے ظہور مجھکو نڈھال کر دیا — لیکن مرے نصیب نے مجھکو نہال کر دیا
کس کی نگاہ کا فیض تھا کس کی نظر کا تھا کرم — جس نے سیاہ غلام کو حضرت بلالؓ کر دیا
بجلی کی روشنی کا کیا آئے نہ آئے رات بھر — جائیں کسی مزار سے لائیں نکال کر دیا
مٹی بدستِ کوزہ گر پیکرِ حسن بن گئی — دستِ قضا نے پھر اُسے نذرِ سفال کر دیا
میری نگاہِ شوق کا دینا تھا اُس نے کیا جواب — نظریں جھکا کے زیرِ لب الٹا سوال کر دیا

منظور ثاقب (فیصل آباد)

غم کے پھولوں سے طرح دار بنا رکھا ہے — ہم نے بھی زیست کو گلزار بنا رکھا ہے
کچھ اصولوں پہ عمل کر کے ہی ہم نے خود کو — اپنی ہی راہ کی دیوار بنا رکھا ہے
ہم سے دشمن کی ہزیمت نہیں دیکھی جاتی — اس لیے جیت کو بھی ہار بنا رکھا ہے
خود جسے راہنمائی کی ضرورت ہے ابھی — آپ نے قافلہ سالار بنا رکھا ہے
کچھ تو دشوار یہ جیون کا سفر ہے لوگو! — اور کچھ ہم نے بھی دشوار بنا رکھا ہے
معجزہ چشمِ فسوں گر کا ہے ثاقبؔ جس نے — پارساؤں کو بھی مے خوار بنا رکھا ہے
بات کہنا تھی سلیقے سے سو ہم نے ثاقبؔ — شعر پیرایۂ اظہار بنا رکھا ہے

○

صابر عظیم آبادی (کراچی)

بات کرنے کی جرأت نہ تھی رات میں
وہ تھا خاموش پہلی ملاقات میں

وصف کوئی نہ تھا حسن کی ذات میں
اک کشش تھی مگر اس کی ہر بات میں

شہر والوں کے گھر بچ گئے رات میں
''آگ بھڑکی ہوئی تھی مضافات میں''

چشم گریاں سے آنسو برستے رہے
پھر بھی گھر جل گیا میرا برسات میں

تیرگی میں بچھڑنا مقدر بنا
ہاتھ آیا تھا اس کا مرے ہات میں

وہ جو حامی تھا عدل و مساوات کا
اس نے بدلا مری جیت کو مات میں

لمس کی چادریں مجھ پہ تانے رکھو
میں ہوں ڈوبا ہوا اپنے جذبات میں

خوشبوؤں سے بدن ٹوٹنے جب لگے
مسکرایا کرو چاندنی رات میں

ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکلوں میں کیا
وہ تو رہتا ہے صابر خیالات میں

○

جہانگیر اشرف (برمنگھم)

کبھی نشاط میں رکھا، کبھی ملال میں رکھا
ہم نے گلہ نہ کیا تم نے جس حال میں رکھا

تیری چاہت میں ہی بیتی ہے عمر ساری
بس اک تجھکو ہی دستِ سوال میں رکھا

اک پل بھی تیری یاد سے تغافل نہ کیا
سوئے تو خواب میں دیکھا جاگے تو خیال میں رکھا

جس نے بھی تجھے دیکھا وہ تیرا ہو کے رہ گیا
قدرت نے سحر ایسا تیرے حُسنِ بے مثال میں رکھا

زندگی تو وہ ہے جو تیرے ساتھ گزرے
عبث زیست نے ہمیں ماہ و سال میں رکھا

○

تصور اقبال (اٹک)

میسر جن کو اپنے گھر نہیں ہیں وہ کدھر جاتے
کسی پُر خار رستے سے گزر ہوتا تو ڈر جاتے

جدھر رستہ نظر آتا یقیناً وہ اُدھر جاتے
شجر سے ایک پتے کی طرح گر کر بکھر جاتے

تری منزل اگر صبحِ درخشاں تھی تو پھر ''اے شب''
بتا دیتی ترے ہمرہ اندازِ دگر جاتے

اگر وہ ڈوبنے والا اشارہ ہم کو کر دیتا
بچانے کے لیے اُس کو سمندر میں اتر جاتے

ہدف کے تیر سارے گر ہمارے ہاتھ میں ہوتے
دکھانے کے لیے خالی کماں ہم کیوں اُدھر جاتے؟

پرندوں کی طرح اپنا بھی گر ہوتا کوئی مسکن
قسم سے ہم بھی وقتِ شام سیدھا اپنے گھر جاتے

خدا کا شکر ہے ہم نے غریبی منتخب کی ہے
اگر ہم اہلِ زر ہوتے کئی الزام سر جاتے

کسی بُت کو گرانا ہی اگر مقصود ہوتا تو
تصور ہم سوئے بت خانہ بے خوف و خطر جاتے

○

انجم جاوید
(کراچی)

مجھ کو رغبت نہیں ہے عورت سے
دور رہتا ہوں میں محبت سے

میرا لہجہ بہت ہی تلخ سہی
مجھ سے لیکن ملو محبت سے

جانے کیا کیا خیال آتے ہیں
اک ترے روٹھنے کی عادت سے

کر دیئے جسم کے خطوط عیاں
تیز بارش نے اپنی جرأت سے

میں نے چوما ہے تیرے گالوں کو
کچھ محبت سے کچھ شرارت سے

دوستو تم بچھڑ گئے ہو مگر
یاد آتے ہو مجھ کو شدّت سے

میری مانو، نہ جاؤ دل سے مرے
فائدہ کچھ نہیں ہے ہجرت سے

آرہا ہے پلٹ کے وہ انجم
جو گیا تھا سفر پہ مدّت سے

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

شہرِ دل پر کبھی تم نے بھی صدارت کی تھی
خامیوں پر مری ہر بار رعایت کی تھی

یاد رکھنا تجھے یہ فرض نہیں تھا مجھ پر
تیرا مقروض نہ تھا تجھ سے محبت کی تھی

یہ صداقت جو ہے اب حرف و بیاں میں میرے
مدتوں اس کے لیے میں نے ریاضت کی تھی

بے وفائی، غم و رسوائی، پریشانی ، گلہ
اُس نے کس زندہ دلی سے یہ عنایت کی تھی

چھوڑ کر جا نہیں سکتا کسی صورت میں وطن
اس کی خاطر مرے اجداد نے ہجرت کی تھی

وہ بچھڑ کر بھی رہا ویسا کا ویسا ہی سروشؔ
دیکھ کر اہلِ جنوں نے اُسے حیرت کی تھی

○

شائستہ سحر میمن
(میرپورخاص)

میری رگوں میں تو خوں نہیں ہے نہ میرے تن میں ہے پانی باقی
میری اذیت بڑھی ہے پل پل رہی ہے غم کی روانی باقی

میرے مقدّر میں الجھنیں ہیں، میرا مسرت سے کیا تعلق
سدا نہیں رہنا مجھکو جگ میں رہے گی میری کہانی باقی

وہ چاند رہتا ہے آسماں پہ اُسے تو میری خبر نہیں ہے
ہے میرا سرمایہ اُسکی یادیں رہے گی اسکی نشانی باقی

مجھے تو اس نے کیا ہے تنہا میں دشت و بن میں رہی اکیلی
نہ قربتوں کے حسین لمحے نہ شام کوئی سہانی باقی

رہا وفا کا بھرم نہیں ہے کسی کا مجھ پہ کرم نہیں ہے
سحرؔ سکوں اپنا لٹ چکا ہے ابھی ہے سر میں گرانی باقی

○

مشتاق اعظمی

(اسنسول، بھارت)

مرے نالہ، شبانہ میں بھی کیوں اثر نہیں ہے
مجھے کچھ پتہ نہیں ہے، مجھے کچھ خبر نہں ہے

کبھی مجھ پہ تھا تلطّف، کبھی مجھ پہ تھی عنایت
مرے حال پر مگر اب تری وہ نظر نہیں ہے

جسے دیکھئے بنا ہے وہی رہنمائے منزل
کسے راہ بر میں سمجھوں، کوئی معتبر نہیں ہے

ہوا لالہ زار گلشن تو بہار خوش قدم سے
مری داستان لیکن ابھی رنگ پر نہیں ہے

نہ جو راہ پر خطر ہو، نہ ہو، دھوپ کی سی شدت
مری چشم کم نظر میں، وہ سفر، سفر نہیں ہے

نہ ہو تیار کی ہی خوشبو، نہ خلوص کی ہو بارش
اسے میرا گھر نہ سمجھو، وہ تو میرا گھر نہیں ہے

سوئے منزل تمنّا ، لو وہ اعظمی چلے ہیں
کوئی ہم قدم نہیں ہے، کوئی ہم سفر نہیں ہے

○

اسد اعوان

(سرگودھا)

اس شہر میں یہ واقعہ بھی خوب ہوا ہے
کیا کیا نہ مری ذات سے منسوب ہوا ہے

یہ میری طرف سے ہے تعلق میں اضافہ
طالب تھا مگر اب میرا مطلوب ہوا ہے

ہر دوسرا بندہ ہے محبت کا مخالف
ہر ایک پری رو میرا محبوب ہوا ہے

شاعر جو بھی صاحب رائے تھا جہاں میں
شاعر تیرے اس عہد میں معتوب ہوا ہے

مجھ جیسا نہ جھکتا ہے ترے ظلم کے آگے
مجھ جیسا نہ تجھ جیسے سے مرعوب ہوا ہے

جو شخص جوانی میں رہا ہے ترے نزدیک
اب کیوں وہ ترے سامنے معیوب ہوا ہے

بوزر کی طرح کون یہ نکلا ہے سرِ دشت
حیثم کی طرح کون یہ مصلوب ہوا ہے

○

سمیع نوید

(میانوالی)

کسی کی چیخ کو بھی سرخوشی سمجھتے ہیں
لگے جو آگ تو ہم روشنی سمجھتے ہیں

تری ادا ہے کہ تو مجھ کو دیکھتا ہی نہیں
مگر یہ لوگ اسے بے رخی سمجھتے ہیں

ہم ایسے لوگ ہیں جو اپنی سادگی کے سبب
تری خوشی کو بھی اپنی خوشی سمجھتے ہیں

ہمارے ساتھ رہے پھر بھی تو پرایا ہو
ہم ایسی دوستی کو دشمنی سمجھتے ہیں

خبر بھی رکھنا سبھی، پھر بھی بے خبر رہنا
اسے بھی لوگ تری سادگی سمجھتے ہیں

تمہارے ساتھ کہیں موت چھپ کے رہتی ہے
سمجھنے والے تمہیں زندگی سمجھتے ہیں

ہمیں تو موت ہی منصف دکھائی دیتی ہے
ہزاروں قتل بھی ہم آئینی سمجھتے ہیں

یہ سادہ لوگ خدا کو فریب دیتے ہیں
یہاں تو بت بھی خوئے بندگی سمجھتے ہیں

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا، امریکہ)

قسط۔۲۴

کراچی میں رہائش کا مسئلہ

اس باب کی شمولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں قارئین کو ایک عبرت ناک کہانی بھی سناؤں مجھے ہسپتال میں یکم نومبر کو کام شروع کرنا تھا میرے پاس سیونتھ ڈے ہسپتال میں کام شروع کرنے سے پہلے کچھ دن باقی تھے۔اس کے علاوہ اب تک میں کراچی میں رہنے اور یہاں کام کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی تیاری یا انتظام کر کے بھی نہیں آیا تھا اس لئے میں یہ درمیانی وقفہ گذارنے واپس میر پور خاص چلا گیا۔

اب میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں کراچی ملازمت کے لئے جارہا ہوں تو میرے لئے وہاں ٹہرنے کا کیا انتظام ہوگا۔وقتی طور پر چھٹیاں گذارنے کی بات تو اور تھی مگر لمبے عرصے کے لئے میں کس کے یہاں ٹہر سکتا ہوں۔یوں تو سب سے پہلے میری بہن سلطانہ آپا کا گھر تھا مگر ہمارے رسم و رواج ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں ان کے یہاں رہوں۔کچھ اور گھر تھے مگر مجھے کسی طرف سے واضح طور پر ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا کہ مجھ میں وہاں جانے کی ہمت ہوتی۔میں نے امّاں سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بہت سوچ کر اور پورے اعتماد سے مجھ سے کہا کہ تم میری چھوٹی بہن فرخی خالہ جان کے یہاں جا کر رہو اور جب تک دل چاہے رہو۔وہ میرا خون ہے اور تمہیں مجھ جیسا پیار دیگی۔وہ غریب ہے تمہیں اس کے یہاں آرام تو بہت زیادہ نہیں ملے گا مگر تم اس کے یہاں بے فکر ہو کر بغیر کسی تکلف کے اپنے گھر کی طرح رہ سکو گے۔

خالہ جان کا گھر ہمارے خاندان کے ان تمام لوگوں کی پناہ گاہ تھا جن کے پاس کراچی میں رہنے کو گھر نہیں تھے۔اس وقت انکے ایک کمرے کے گھر میں میرے رشتے کے ماموں نفاست حسین، میرے ایک کزن مرغوب بھائی جان، اختری آپا اور انکے دو جوان لڑکے رہتے تھے۔انکا دل غنی تھا اور وہ محبت کا دریا تھیں۔میں نے سوچا یقیناً ان کے گھر میں اور لوگوں کے ساتھ میرے ایک کھٹولے کو بھی جگہ مل ہی جائیگی۔اگلے ہفتے میں اپنا ایک چھوٹا سا صندوق اور پرانا سا بریف کیس لے کر خالہ جان کے گھر وارد ہوا۔انہوں نے پیار سے گلے لگایا اور یہ بھی نہیں پوچھا کہ کب تک کے لئے آئے ہو۔میرا ایک کھٹولہ انکے واحد کمرے کی کھڑکی کے ساتھ ڈالدیا گیا اور میں نے کراچی میں اپنی زندگی کا آغاز کیا جب میری والدہ نے خالہ جان کے متعلق کہا تھا کہ وہ غریب ہے تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا اور ایک لمحے کو انکے ماضی کے حوالے سے مجھے یہ مصرعہ یاد آیا تھا

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بہت مناسب ہوگا کہ میں یہاں اپنی کہانی چھوڑ کر خالہ جان کی کہانی مختصراً بیان کردوں اس لئے کہ انکی کہانی بذات خود ایک افسانہ کہی جاسکتی ہے۔

خالہ جان کی عبرت انگیز کہانی

میری والدہ تین بہنوں میں ایک تھیں۔یہ تینوں بہنیں اپنے حسن میں اپنی مثال آپ تھیں جیسا میں نے ابتداء ہی میں لکھا تھا کہ میری نانی خود نہایت حسین تھیں اور لوگ انہیں کوئی ترک یا ایرانی خاتون سمجھتے تھے انکی شادی بھی ایک بہت ہی گورے چٹے، وجیہ اور خوش شکل شخص سے ہوئے تھی اس لئے انکی تمام اولادیں اپنے حسن کے حوالے سے مشہور تھیں۔خالہ جان میری والدہ سے چھوٹی تھیں ان کی شادی پندرہ سال کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں میر پور خاص میں میری والدہ کے سب سے بڑے ماموں کے بنگلے سے ہوئی تھی جو اس وقت جودھپور ریلوے کے ایک بڑے افسر کی حیثیت سے میر پور خاص میں تعینات تھے۔یہ شادی ہو کر مراد آباد یوپی چلی گئی تھیں۔انکے شوہر مقصود خالو میاں اس زمانے کے لحاظ سے بہت پڑھے لکھے اور ثروت مند فرد تھے۔وہ اپنی بیگم کے حسن کے دیوانے تھے۔میں نے اپنے خاندان کے کئی لوگوں سے سنا ہے کہ سن تیس کی دھائی میں مراد آباد میں خالو میاں کا گھر سب سے زیادہ خوبصورت وسیع اور جدید طرز پر آراستہ تھا۔انکے گھر میں پھولوں کے پودے گملوں میں لگے رہتے تھے اور ستونوں پر پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوتی تھیں۔سرخ اینٹوں کی چوڑی چوڑی سیڑھیاں چڑھ کر دالان تھا اور شام کو چھڑکاؤ ہوتا تھا کوری مٹکیوں پر شام کو چمیلی اور موگرے کے پھول لپیٹے جاتے تھے اور گھر میں کئی نوکر تھے۔اس زمانے میں امراء اپنی گھوڑا گاڑی رکھتے تھے ان کے پاس بھی ایک تانگہ تھا جس کے گھوڑے کی مالش کے لئے ایک نوکر تھا جو اس پر کھریرا کرتا تھا۔

میں نے اپنی والدہ سے سنا ہے کہ مقصود کے یہاں غضب کا ''چینی خانہ'' تھا یعنی ان کے یہاں انگریزی ڈنر سیٹ اور کٹلری تھی۔انکو دعوتیں کرنے کا شوق تھا اور ہر ہفتے شاندار دعوتوں کا اہتمام ہوتا تھا۔یہ شروع میں چائے کی کمپنی لپٹن میں ڈسٹرکٹ سیلز مینیجر تھے بعد میں برما شیل آئیل میں صوبائی سپرنٹینڈنٹ ہو گئے تھے۔

خالہ جان کے عیش اور آرام کا یہ عالم تھا کہ انکی خدمت اور آرائش کے لئے علیحدہ سے ایک خادمہ متعین تھی یہ اس زمانے کے متمول لوگوں کا دستور تھا اور ایسی عورتوں کو مشاطہ یعنی سنگھار کرنے اور تیار کرنے میں مدد کرنے والی، کہا جاتا تھا۔مغربی دنیا میں بھی یہ دستور تھا او انگلینڈ اور امریکہ میں بھی امرء کے یہاں ایسی خادمائیں پائی جاتی تھیں۔شوہر کے آنے سے پہلے یہ خادمہ انکے کپڑے زیور اور مسّی کاجل وغیرہ تیار کر کے انکو سنگھار میں مدد کرتی تھیں۔غرض خالہ جان اس وقت ایک قابل رشک اور سماجی طور پر ایک ممتاز زندگی گذار رہی تھیں۔اللہ تعالی نے سب کچھ دیا تھا مگر وہ اولاد سے محروم تھیں اور دونوں میاں

بیوی نے اس کو مرضیٔ خداوندی سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور ظاہری طور پر خوش تھے۔

پاکستان بننے کے بعد خالو میاں برماشیل ہی کی ملازمت کے ذریعہ پنجاب کے شہر سرگودھا میں تعینات ہو گئے اور ازسرنو ایک شاندار زندگی گذارنے لگے۔ وہ ہر سال ایک ماہ کے لئے ہم سے ملنے میرپور خاص آتے تھے۔ وہ میری والدہ سے بہت محبت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نہ صرف یہاں بہنوں کو ایک دوسرے سے ملوانے آتا ہوں بلکہ جعفری آپا کی مزے دار باتیں سننے آتا ہوں میں اگرچہ بہت چھوٹا تھا مگر مجھے یاد ہے کہ ان کے آنے کی خبر سے ہی ہمارے گھر میں خوشیاں پھیل جاتی تھیں پھر جب وہ آتے تو چند دن ایسے گذرتے جیسے ہر دن ایک تہوار ہو۔ ہر شام ہمارے گھر کے باہر بھی چھڑکاؤ ہوتا۔ انکا حقہ خاص طور سے تازہ کیا جاتا اور اس کے تمباکو کی ہلکی ہلکی مدہوش کرنے والی مہک فضا میں پھیل جاتی۔ وہ صرف اپنی خدمت کے لئے میرپور خاص میں بھی ایک عارضی ملازم رکھ لیتے تھے۔ ہر دن کوئی نہ کوئی پروگرام بنتا کسی شام گھر میں آئیس کریم بن رہی ہے تو کسی دن فروٹ فارم میں دن بھر کی پکنک۔ کسی دن آؤٹ ڈور میں نیم کے نیچے کبابیا سیخ کے کباب بنا رہا ہے تو کسی شام ریلوے کے مغربی طرز کے ڈائینگ روم میں سب ڈنر کھانے جا رہے ہیں یہ سب مزے ان ہی کی وجہ سے تھے کیونکہ میرے والد کی مالی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس قسم کی زندگی کے متحمل ہو سکتے۔

سرگودھا میں انہیں ایک ہی شکایت تھی کہ وہ اپنوں سے بہت دور تھے۔ آخر کوشش کر کے انہوں نے اپنا تبادلہ حیدرآباد سندھ کروالیا اور ہیرآباد میں جو اس وقت وہاں کا سب سے زیادہ فیشن ایبل علاقہ تھا ایک وسیع گھر میں رہنے لگے۔ اپنی محفلیں سجانے کی عادت انکی اب بھی قائم تھی اور وہ کراچی کے عزیزوں کو تاش اور پچیسی کھیلنے اور دریائے سندھ کے کنارے پکنک منانے کے بہانے دن رات حیدرآباد مدعو کرتے رہتے اور ہمارے کراچی کے رشتہ دار اپنی کاروں میں اور کبھی کبھی بسوں کا انتظام کر کے انکے یہاں محفل جمائے رہتے۔ ادھر سے ہم بھی انکے یہاں پہنچ جاتے۔ چند سال حیدرآباد میں رہ کر وہ ۱۹۵۴ء میں کراچی چلے گئے اور وہاں ناظم آباد میں اپنا مکان بنوالیا۔ یہ مکان ۱۹۵۵ء کی مارچ میں تعمیر ہوا تھا اور اسکا نام انہوں نے اپنی بیگم کے نام پر ''فرخ نشان'' رکھا تھا۔ سنگ مرمر کی یہ مٹی مٹی تختی اب بھی اس مکان پر قائم ہے۔ یہ مکان ایسا تو نہیں تھا جیسا میں نے سنا تھا کہ انکا مکان مرادآباد میں تھا مگر دو میاں بیوی کے لئے ریٹائرمنٹ کی زندگی گذارنے کے لئے بہت بڑا اور اچھا تھا۔

ہندوستان کے قیام کے آخری زمانے میں خالہ جان کی خدمت پر جو نوعمر خادمہ معمور تھی اسکا نام اختری تھا۔ یہ بیچاری شاید پندرہ یا سولہ سال کی تھی کہ اس طبقہ کے رواج کے تحت اسکی شادی ایک پینتالیس سال کے انسان سے کر دی گئی تھی جو دمہ کے مرض میں مبتلاء تھا اور ہڈیوں کا ڈھانچا تھا رات رات بھر کھانستا اور صبح تک نڈھال ہو جاتا تھا۔ سنا ہے خالو میاں نے اسی وجہ سے اس عورت کو نوکر رکھ لیا تھا کہ اس کی کچھ مدد ہو جائیگی۔ اس کے شوہر کو بھی جسے صوفی جی کہا جاتا تھا اوپر کے برائے نام کام پر لگا دیا گیا تھا۔ وہ پاکستان آتے ہوئے ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے اور حیدرآباد میں بھی یہ جوڑا ان کے ساتھ تھا۔ اس دوران اختری کے جنہیں ہم عزت سے اختری آپا کہتے تھے (یہ یوپی کا کلچر تھا کہ گھر میں کام کرنے والیوں کو عزت سے بوا، خالہ وغیرہ کہا جاتا تھا) کے دو بچے پیدا ہو چکے تھے۔ بڑے کا نام عزت اور چھوٹے کا نام عشرت تھا۔ خالو میاں کو یوں تو دونوں سے بیحد پیار تھا مگر عشرت سے وہ بالکل اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے اپنی اولاد تو تھی نہیں اس لئے ساری محبت عشرت پر لٹاتے تھے۔ شوہر کی محبت دیکھتے ہوئے خالہ جان بھی عشرت کو عزیز رکھتی تھیں۔ حیدرآباد چھوڑتے ہوئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی مالی استعداد کا خیال کرتے ہوئے کہ اب وہ ریٹائر ہو گئے تھے اور پنشن پر گذارا تھا، انہوں نے ان لوگوں کو وہیں چھوڑ دیا تھا اور صوفی جی کی نوکری برماشیل میں پکی کر دی تھی تاکہ انکا گذارا ہوتا رہے۔

ابھی ان کو کراچی آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ حیدرآباد سے خبر آئی کہ صوفی جی دمہ کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے اور اختری آپا کو چھبیس سال کی عمر میں بیوہ کر کے چھوڑ گئے دو بچوں کا ساتھ اور کوئی ذریعہ آمدنی نہیں۔ خالو میاں نے اس کنبے کو پھر واپس اپنے گھر بلا کر رکھ لیا۔۔ بدقسمتی سے چند ہی ماہ بعد وہ بیمار رہنے لگے معلوم ہوا ذیابیطیس ہے اور اندر ہی اندر بہت زیادہ آگے بڑھ چکی ہے اور کئی اعضا اس کی وجہ سے بیکار ہو گئے ہیں بیماری تیزی سے بڑھ تی رہی اور مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک شام میرپور خاص میں ہمارے یہاں مظہر ماموں جان کا تار آیا ''MAQSOOD EXPIRED'' یہ ۱۹۵۵ء کا سال تھا یعنی انہیں اپنے مکان میں زیادہ رہنے کی مہلت نہیں ملی۔

بیوائیگی اور سسرال کی بیوفائی

ابھی خالہ جان کی عدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ خالو میاں کا انتقال اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ اپنے بعد کسی قسم کی وصیت چھوڑ کر نہیں مرے تھے خالہ جان بے اولاد تھیں۔ خالو میاں کے دو اور بھائی بھی تھے جو مالی طور پر ان کی طرح خوشحال نہیں تھے اور شاید وہ پوری زندگی انکی دولت پر نظر لگائے ہوئے تھے۔ انہوں نے وراثت میں اپنے حصہ کا دعویٰ کر دیا۔ مسلم قوانین کے لحاظ سے (جس پر میں آج بھی حیران ہوتا ہوں) بے اولاد بیوہ کا ترکے میں صرف ایک روپئے میں دو آنے حصہ ہوتا ہے۔ باقی متوفی کے باپ بھائیوں کو مل جاتا ہے۔ یہ سب باتیں میرے کانوں میں ایسی بار بار پڑیں کہ میرے کانوں میں دو آنے دو آنے آج تک گونجتا ہے۔ خالہ جان سخت مصیبت میں تھیں اور نہ صرف انکو گذر کرنے کے لئے کسی قسم کی آمدنی کا ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ سارا بنک بیلنس منجمد کر دیا گیا تھا بلکہ ہاتھ سے گھر کے نکل جانے کا بھی خطرہ تھا اور اس کے بعد انکے سر چھپانے کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔

خالو میاں کے بھائیوں کو بھی سب لوگ جانتے تھے ان سے ہمارے خاندان کے تمام اہم اور باحیثیت لوگوں نے بھائی چارے کے طور پر بات کی اور

کسی باعزت حل کی کوشش کی مگر وہ کسی بھی معاہدے کے لئے تیار نہیں تھے اس معاملے پر خاندان کے بااثر فراد نے وکیلوں سے قانونی مشاورت کی اور بھائیوں کو بیوہ کی حالت کا واسطہ دیا مگر یہ دونوں بھائی صرف اس بات پر ڈٹے رہے کہ شریعت کے حق سے جو ہمارا حصہ بنتا ہے وہ ہم لے کر رہیں گے۔ پھر وکیلوں سے مشورہ کیا گیا کہ ایسی کون سی صورت ہوسکتی ہے کہ اس بیچاری بیوہ کو بچایا جائے اور اسکی باقی زندگی کے لئے کوئی ذریعہ معاش بن سکے۔ وکیلوں نے کہا کہ ایک ہی راستہ ہے وہ شوہر کے چھوڑے ہوئے ترکے پر اپنے مہروں کا دعویٰ کرسکتی ہیں اور انکے مہروں کے عیوض کم ازکم مکان انکو مل جانے کی پوری توقع ہے۔

مگر اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ خالہ جان ہمارے کلچر اور روائیات کے مطابق اپنے شوہر سے اس قدر محبت کرتی تھیں کہ یہ انکے لئے انتہائی نا پسندیدہ چیز تھی کہ وہ اپنے مرحوم شوہر پر مہروں کا دعویٰ کریں وہ تو یہ سنتے ہی بھڑک گئیں اور زاروقطار روتے ہوئے کہنے لگیں کہ وہ جھونپڑی میں رہ لینگی مگر کورٹ عدالتوں میں اپنے مرے ہوئے شوہر کو بدنام نہیں کریں گی۔ خاندان کے کئی بزرگوں نے انہیں سمجھایا مگر وہ اس پر راضی نہیں ہوتی تھیں۔ آخر کار انہیں سمجھایا گیا کہ اس سلسلے میں حقیقت میں کوئی مقدمہ بازی نہیں کی جائیگی صرف ان دو بھائیوں کو دھمکانے کے لئے یہ ہتھیار ضروری ہے۔ انہیں امید تھی کہ اس نئی تجویز سے مقدمہ کے بغیر کوئی مفاہمت ہوجائیگی۔ بڑی مشکل سے وہ اس بات کے لئے راضی ہوئیں۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ جس زمانے میں خالہ جان کی شادی ہوئی تھی اُس زمانے میں مکمل اور سرکاری طور پر تصدیق شدہ نکاح کے کاغذات نہیں ہوتے تھے اور مولوی صرف زبانی نکاح پڑھا دیتا تھا۔ (دراصل میں نے اپنے بچپن میں بھی میرپورخاص میں بہت سی شادیاں ایسی دیکھیں کہ ان میں کوئی پکے کاغذات نہیں تھے شائد پکے کاغذات ایوب خان کے دور میں عائلی قوانین کے بعد رائج ہوئے)۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے پکے کاغذات ضروری تھے۔ اس معاملے میں حیرت انگیز طور پر تقدیر کام آئی۔

خالہ جان کی زندگی مراد آباد میں گزری تھی اور انکے شوہر بھی مراد آباد کے تھے۔ قدرتی طور پر انکی شادی بھی مراد آباد میں ہی ہونی چاہئے تھی مگر اتفاقاً انکی شادی میرپورخاص میں ہوئی تھی جواب پاکستان میں تھا اور خوش قسمتی سے میرپورخاص کی جامع مسجد کے پیش امام مولوی صالح محمد جنہوں نے ۱۹۲۵ میں انکا نکاح پڑھایا تھا اب بھی حیات تھے اس طرح اس کہانی میں ہمارا گھر بھی شامل ہوگیا کہ کراچی سے رشتہ دار ہمارے یہاں آئے اور میرے ابّا سے کہا گیا کہ وہ ان مولوی صاحب کو ڈھونڈیں مولوی صالح محمد تو میرپورخاص کی مشہور شخصیت تھے اور ابا سے انکی جان پہچان بھی اچھی تھی ان سے درخواست کی گئی اور انہوں نے اپنے پرانے کاغذات دیکھ کر اس بات کی تصدیق کردی کہ انہوں نے فرخ بیگم کا نکاح مقصود احمد قریشی کے ساتھ پڑھایا تھا۔

ان دستاویزات سے لیس ہوکر خالہ جان کے کزن صفات ماموں کراچی کے ایک نامور وکیل کے ساتھ جج کے سامنے پیش ہوئے اور ادھر سے دونوں بھائی بھی پہنچے سارے معاملات کو دیکھتے ہوئے جج نے دونوں بھائیوں کو یہی مشورہ دیا کہ مقدمہ بازی سے کوئی فائدہ نہیں اس قسم کی مفاہمت کرلی جائے کہ مکان خالہ جان کو ملے اور اور باقی سارا ترکہ دونوں بھائیوں کو ملے۔ چار و ناچار بھائیوں کو اس پر راضی ہونا ہی پڑا اس طرح خالہ جان کے سر پر کم ازکم ایک چھت رہ گئی جس میں وہ اپنی باقی زندگی گزار سکتی تھیں۔ اب سوال یہ تھا کہ ماہانہ خرچ کے لئے رقم کہاں سے آئیگی۔ کسی کونے سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ خاندان کے خوشحال لوگ چندہ کرکے انکا ماہانہ وظیفہ باندھ دیں جس پر خالہ جان بیحد ناراض ہوئیں اور بلک بلک کر روئیں کوئی بھی شخص اس بات کا اندازہ کرسکتا ہے کہ جس عورت نے شہزادیوں جیسی زندگی گذاری ہو اور جس کے سنگھار پر مشاطائیں متعین کی گئی ہوں اسکی غیرت یہ کیسے برداشت کرسکتی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ انکے مکان کے درمیان ایک دیوار کھینچ کر اس کے دو حصے کردئے جائیں ایک بڑا حصہ، جو کرائے پر چڑھا دیا جائے اور دوسرا چھوٹا سا حصہ انکے رہنے کے لئے جس میں صرف ایک کمرہ اور چھوٹا سا صحن ہو۔ ۱۹۵۶ کے شروع میں یہ توڑ پھوڑ مکمل ہوئی اور انکے کرائے والے حصے میں پاکستان نیوی کا ایک نوجوان افسر اپنی بیوی کے ساتھ آکر بس گیا۔ خالہ جان اختری آپا اور انکے دو بچوں کے ساتھ اپنی اس چھوٹی سی کٹیا میں کرائے کی آمدنی پر گذر کرنے لگیں کسی نے سچ کہا ہے:

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کراچی میں زندگی کی ابتدا

میں ایک نئی زندگی شروع کرنے خالہ جان ن کے یہاں وارد ہوا۔ یہاں سب لوگوں نے میرا بڑا پرجوش استقبال کیا۔ یوں تو انکے یہاں ویسے ہی بڑی رونق تھی کیونکہ چھوٹے سے گھر میں کئی افراد رہتے تھے مگر میرے آنے سے اس میں مزید اضافہ ہوگیا۔ شام ہوتے ہوتے نفو ماموں اور مرغوب بھائی جان اپنی نوکری سے واپس لوٹتے اور انکے آتے ہی کچھ نہ کچھ پروگرام بن جاتا۔ اور نہیں تو ویسے ہی ان دونوں اور اختری آپا کے درمیان جنگ وجدل شروع ہوجاتی جس میں دوستی اور محبت کا رنگ زیادہ اور سچ مچ کی لڑائی کا عنصر کم ہوتا۔ خالہ جان کے یہاں اوّل رات کو وقت کاٹنے کے لئے اردو کے اچھے ناول پڑھ کر سنانے کا رواج تھا اس زمانے میں عظیم بیگ چغتائی کے ناول شریر بیوی اور خانم کا چرچہ تھا۔ ان دونوں نے چھیڑ میں اختری آپا کا نام خانم رکھ دیا تھا۔ مجھے یہاں آکر بہت اچھا لگا۔ میں، خالہ جان اور اختری آپا کمرے میں اپنے اپنے کھٹولوں پر سوتے تھے میرے اور خالہ جان کے بستروں کے درمیان جو جگہ تھی اس میں زمین پر عزت اور عشرت سوتے تھے اور بہت ہی مختصر سے برآمدے میں نفو ماموں اور مرغوب بھائی جان کی چارپائیاں تھیں جگہ اس قدر تنگ تھی کہ رات کو چارپائیوں سے ٹکرائے بغیر چلنا ناممکن تھا۔ اس تنگی کے باوجود دلوں میں اتنی کشادگی تھی اور آپس میں ایسی محبت تھی کہ مجھے اب بھی ان دنوں کی جب یاد آتی ہے تو میرے لمحات خوشگوار ہوجاتے ہیں۔

میری پیشہ ورانہ زندگی کا پہلا دن

یکم نومبر کو میں صبح ہی صبح تیار ہو کر سیونتھ ڈے ہسپتال کے لئے گھر سے نکلا۔ یہ میرا پیشہ ورانہ زندگی کا پہلا دن تھا۔ مجھے جو پروگرام دیا گیا تھا اسکے مطابق مجھے متواتر تیس گھنٹے نوکری کرنی تھی۔ یعنی صبح ساڑھے سات بجے سے لیکر دوسرے دن دوپہر دو بجے تک۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ میں پورا دن پوری رات اور پھر دوسرے دن دوپہر دو بجے تک مستقل ڈیوٹی پر رہونگا۔ میں گھر سے پیدل بڑے میدان کے بس سٹاپ کی طرف چلا۔ میں نے اس دن کے بعد جب شام کے وقت بس میں میری طبیعت خراب ہوئی تھی یہ تو فیصلہ کر لیا تھا کہ اب بس میں نہیں بیٹھونگا مگر اس کا بھی احساس تھا کہ میں ابھی ٹیکسی یا رکشہ کا خرچ برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اسکا حل مجھے نفو ماموں نے بتا دیا تھا کہ بڑے میدان سے شہر کے لئے منی وان چلتی ہیں اور یہ ایک روپیہ فی سواری لیتی ہیں۔ اگر چہ ایک روپیہ جانا اور ایک روپیہ آنا بھی میرے لئے ذرا زیادہ تھا مگر پھر بھی میں نے سوچ لیا تھا کہ اپنے دوسرے اخراجات کم کر دونگا مگر بس میں نہیں بیٹھونگا۔ بہر حال وہاں سے منی وان لیکر میں بندر روڈ پر سیونتھ ڈے کے بالکل سامنے اترا۔ آج میں نے کلف لگی سفید شرٹ اور زین کی کتھئی پتلون پہنی ہوئی تھی ٹائی بھی کتھئی تھی اور میری پتلون کی جیب سے بی۔ ڈی کا کریم کلر کی نلکیوں والا اسیتھی سکوپ جھانک رہا تھا۔ عجب خوشی اور خود اعتمادی کا عالم تھا۔ میں جیسے ہی اسپتال کی مین لابی میں داخل ہوا ریسپشن پر بیٹھے ہوئے مسٹر میڈورا نے کھڑے ہو کر مسکراہٹ اور ادب سے مجھے مخاطب کر کے کہا ''گڈ مارننگ ڈاکٹر''۔ کچھ ہی دن قبل جب میں پہلے پہل اس ہسپتال کی لابی میں کچھ نروس سا داخل ہوا تھا اور لڈیا نے مجھ سے وہاں آنے کی وجہ معلوم کی تھی اس وقت میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ چند دن بعد ہی جب میں یہاں داخل ہونگا تو یہاں کا عملہ مجھے خوشگوار انداز سے عزت کے ساتھ خوش آمدید کہے گا اور میں اس چھوٹی سی کمیونٹی کا حصہ بن جاؤنگا۔

مردانہ وارڈ اور مریض

ساڑھے سات بجے تھے اور مجھے حزب ہدایت مردوں کے وارڈ میں ڈاکٹر چیپ مین سے ملنا تھا۔ میں بھاگ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچا اور وارڈ میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر چیپ مین وہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا ایک چھوٹی سی ٹرالی پر مریضوں کے چارٹ رکھے تھے اور ایک پاکستانی کرسچین نرس ایگنس AGNES جو مردانہ وارڈ کی ہیڈ نرس تھی اس کو راؤنڈ کروا رہی تھی ڈاکٹر چیپ مین پیشہ ورانہ نقطہ نظر سے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا ڈاکٹر تھا اور آج بھی میں اسکی اس سلسلے میں بیحد عزت کرتا ہوں اس کا طبی علم اور معلومات بہت وسیع تھیں اور مرض اور مریض دونوں پر اسکی نگاہ بہت گہری تھی میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ سارے ہی مریض بہت پیچیدہ تھے۔ وہ انکے مسئلے سن کر دواؤں میں ردو بدل کرتا تھا اور ساتھ ساتھ مجھ سے بھی کبھی کچھ سوال اور کبھی علاج کے سلسلے میں میری رائے طلب کرتا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے اب کیا کرنا چاہئے۔ چوتھے بستر پر ایک مریض تھا جس کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی اگنس نے اسکا ایکس رے دکھایا چیپ مین نے وہ ایکسرے میرے سامنے کر دیا خدا کا شکر ہے کہ ایسے ایکسرے تو میں نے اپنے میڈیکل وارڈ میں پروفیسر صالح صاحب کی سربراہی میں کئی دفعہ دیکھے تھے میں نے اسے بتایا کہ اس مریض کے پھیپڑوں میں داہنی جانب پانی بھر گیا ہے۔ اس نے بہت اچھی طرح اس مرض کی تفصیلات مجھے بتائیں اور مجھ سے کہا کہ اس کے پھیپڑوں میں سوئی ڈال کر اس پانی کو نکالنا پڑیگا اور پھر اس پانی کی کیمیائی جانچ ہوگی وہاں سے دوسرے مریضوں کو دیکھتے ہوئے ہم پرائیویٹ وارڈ کی طرف آئے یہاں کی انچارج شوخ طبع، آنکھیں مٹکانے والی اور انتہائی سنہرے بالوں والی کینیڈین نرس مسز مکلین تھیں اس زمانے میں کراچی میں مکلین ٹوتھ پیسٹ بہت مشہور تھا۔ میں نے پہلی دفعہ کسی جیتی جاگتی شخصیت کو دیکھا جسکا نام کسی اشتہار کے نام پر تھا۔ مسز مکلین سفید فام نرسوں میں ایک تھیں اور اسلئے ایسا لگتا تھا کہ وہ خاص اختیارات کی مالک ہیں۔ وہ ڈاکٹروں کے کافی منہ چڑھی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ ایسی چھیل چھبیلی خاتون کے شوہر اس چرچ کے پادری مسٹر مکلین ہیں کیونکہ اس زمانے میں میں یہ سوچتا تھا کہ مذہبی لوگ تو بہت سادہ اور زندگی کی لذتوں سے بے بہرا ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی ڈاکٹر چیپ مین کے اعزاز میں ٹرالی پر چارٹ سجائے تھے اور ہم اب ان کے ساتھ پرائیویٹ کمروں میں راؤنڈ کرنے نکلے۔ یہاں زیادہ تر غیر ملکی مریض تھے اور ان میں بھی زیادہ تر سفید فام تھے۔ جلد ہی ہم نے یہ راؤنڈ بھی ختم کر لیا۔

اُف کہیں میں پھیپڑا نہ پھاڑ دوں

یہ دونوں راؤنڈ ختم کر کے چیپ مین تو اپنے کنسلٹنگ چیمبر میں چلا گیا کہ اسکی کلینک شروع ہونے والی تھی اور وہاں مریضوں کا ہجوم ہوتا تھا اور میں اپنے لیاقت میڈیکل کالج کے معمول کے مطابق کہ جب میں صرف طالب علم تھا، ریلیکس ہونے اور خوش گپیاں کرنے کیفیٹیریا کی جانب چلا گیا۔ چند پر کشش نرسنگ طالبات کی میز پر بیٹھ کر ابھی میں اپنی چائے اور بغیر گوشت کی پیٹیز شروع کرنے ہی والا تھا کہ مردانہ وارڈ کی اگنس کا فون آ گیا اس نے مجھے یاد دلایا کہ مجھے فوراً وہاں پہنچ کر ڈاکٹر چیپ مین کے حکم کے مطابق بستر نمبر چار کے مریض کے پھیپڑوں میں سوئی ڈال کر پانی نکالنا ہے۔ میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور آدھی کھائی ہوئی پیٹی میرے حلق میں پھنستے پھنستے بچی۔ مجھے پانی نکالنا ہے؟؟ یا اللہ میں نے تو کبھی پانی نہیں نکالا میں یہ کیسے کرونگا۔ کہیں اس مریض کا پھیپڑا ہی نہیں پھاڑ دوں۔ ڈاکٹری کا پہلا اصول ہے DO NO HARM اور اگر چیپ مین سے کہونگا کہ مجھے تو یہ نہیں آتا تو وہ تو مجھے آج ہی نوکری سے برخواست کر دیگا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا اگنس تو اپنی پاکستانی ہے اس سے صاف صاف کہدوں۔ میں نے ایسا ہی کیا مگر وہ اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہ کر سکی۔ بہر حال میں نے سوچا اب جو کچھ بھی ہو HONESTY IS THE BEST POLICY مجھے یہ کام نہیں آتا اور مجھے چیپ مین کو یہ صاف صاف بتا دینا چاہئے دراصل ہمارے کالج میں یہ پروسیجر عام ہوتا تھا مگر یہ ہاؤس جاب

والے کرتے تھے اس لئے طلبہ کو اس کے کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا ہاؤس جاب کی یہی خاصیت تھی کہ ایسی بہت سی چیزیں جو ہم تھیوری کے طور پر پڑھتے تھے انہیں عملی طور پر کرنے کا موقع ہاؤس جاب میں ملتا تھا اسی لئے صحیح طور پر ڈاکٹری کے پیشہ کی تکمیل ہاؤس جاب ہی کے دوران ہوتی تھی۔

میں اپنی چائے اور پیٹیز ادھوری چھوڑ کر سیدھا چیپ مین کے کمرے میں گیا وہ مریض دیکھ رہا تھا میں کچھ پریشانی کچھ غیر یقینی کے عالم میں اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا وہ سمجھا کہ میں اسکے ساتھ کلنک کا تجربہ حاصل کرنے آیا ہوں (جو میری ڈیوٹی میں شامل تھا) اس لئے اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ جیسے ہی مریض کمرے سے نکلا اور وہ اکیلا ہوا میں نے جلدی سے اسے بتایا کہ ڈاکٹر چیپ مین میں بہت شرمندہ ہوں مگر مجھے پھیپڑوں سے پانی نکالنا نہیں آتا میں نے یہ پروسیجر دیکھا ہے مگر اپنے ہاتھ سے آج تک یہ کیا نہیں۔ وہ نہایت ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا۔ مسکرایا اور کہنے لگا کوئی بات نہیں اس وقت تو میں بہت مصروف ہوں۔ میں ایسا کروں گا کہ آج لنچ کرنے گھر نہیں جاؤنگا اور لنچ ٹائم میں ہم دونوں مل کر اس کے پھیپڑوں سے پانی نکالیں گے اور تم بہت جلد یہ پروسیجر کرنا سیکھ جاؤ گے۔ اس کے بعد تم ہی اسے کیا کرنا۔

لنچ ہم نے ایک ساتھ ہسپتال کی کیفیٹیریا میں سبزی دال اور ابلے چاولوں کے ساتھ کیا اور اسکے فوراً بعد ہم مردانہ وارڈ میں گئے۔ اگنس نے سامان تیار رکھا تھا۔ چیپ مین نے خاص دستانے پہنے مجھے بھی ایسے ہی دستانے پہننے کو کہا۔ مریض کے سامنے ایک اونچی میز پر تکیہ رکھ کر اس سے کہا گیا کہ تم اس کے سہارے اس پر جھک جاؤ اور دونوں ہاتھ اس میز کے گرد لپیٹ لو۔ چیپ مین نے ایک دفعہ ایکسرے دیکھ کر اس کے سینے کو انگلیوں سے ٹھونکا جیسے طبلہ بجا رہا ہو۔ اور پھر ایک جگہ نشان لگا کر اس میں سن کرنے کی دوا ڈالی اور پھر ایک بڑی سی لمبی سوئی عین اس جگہ اندر گھسیڑ دی۔ پسٹن واپس کھینچا تو ہلکے زرد رنگ کا پانی بڑی آسانی سے نکلنے لگا۔ اس دوران وہ مجھے ہر چیز بڑے صبر اور تفصیل سے بتا تا رہا اور کئی دفعہ مجھے بھی سوئی کے زاویہ اور اسکے پریشر کو محسوس کرنے کے لئے مجھے بھی سوئی پکڑنے دی۔ اس نے وہ تمام پروسیجر اتنے پیار اور اتنی توجہ سے مجھے سمجھایا کہ اس کی یاد آج بھی میرے ذہن میں ہے اور میرے دل میں اسکی عزت میں اضافہ کرتی ہے۔

سہ پہر ڈاکٹر چیپ مین کے چیمبر میں اسکے ساتھ مریض دیکھنے میں گذرنی تھی اور میں کسی دباؤ میں نہیں تھا کیونکہ مریض تو چیپ مین کو ہی دیکھنے تھے مجھے تو ایک طالب علم کی طرح بس اس بات کا مشاہدہ کرنا تھا کہ وہ کس طرح مریض کی شکایتوں کا تجزیہ کرتا ہے اور کس قسم کی تحقیقات کر کے کیا دوا تجویز کرتا ہے۔ یہ ضرور تھا کہ میں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار تھا کہ مریض دیکھنے کے دوران وہ مجھ سے سوالات ضرور پوچھے گا لیکن سوالات کو تو میں چیلنج سمجھ کر انجوئے کیا کرتا تھا۔

ایمرجنسی روم کا تجربہ

ابھی مجھے اس کے پاس کھڑے ہوئے شاید پندرہ منٹ بھی نہ ہوئے ہونگے کہ ہمارے اردلی ہنری نے آکر مجھے خبر دی کہ مجھے مسز ڈیوڈ بلا رہی ہیں۔

میں یہاں یہ واضح کر دوں کہ سینتھ ڈے ہسپتال میں غیر ملکی گوروں کے علاوہ جتنا بھی پاکستانی اسٹاف تھا وہ عیسائی تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ پنجاب سے تھے، اسکے بعد کراچی کی گوا کی کمیونٹی تھی اسکے بعد مشرقی پاکستان کے کرسچین تھے پھر کچھ سری لنکا کے عیسائی تھے اور اسکے بعد مقامی پارسی تھے۔ یہ تمام لوگ انگریزی نام رکھتے تھے اور صرف انگریزی میں بات کرتے تھے۔ اس ہسپتال کے عملے میں شاید مسز لودھی جو رجسٹریشن کاؤنٹر پر بیٹھتی تھیں کے علاوہ کوئی مسلمان نہیں تھا۔

بہر حال۔ مسز ڈیوڈ مقامی کرسچین تھیں اگرچہ ہسپتال میں صرف انگریزی بولتی تھیں مگر انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ لکھنؤ سے ہیں اور بہت صاف اردو بول سکتی ہیں۔ یہ بہت سینئر تھیں اور بقول شخصے اس قدر قدیم تھیں کہ ''اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو'' کے مصداق انہیں انکے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ کی انچارج تھیں اور بہت سختی سے وہاں نظم وضبط قائم رکھتی تھیں خاص طور سے نوجوان نرسنگ طالبات کی تو ان سے جان نکلتی تھی۔ مسز ڈیوڈ کے نقطہ نظر سے اب وہ بات ہی نہیں تھی جو انکے زمانے میں تھی جب نرسنگ ٹریننگ اتنی سخت ہوتی تھی کہ اس کورس کی تکمیل تک ''لڑکیاں'' آدھی رہ جاتی تھیں۔ مجھ جیسے نوعمر فرد کے لئے اسکا تصور کچھ مضحکہ خیز تھا کہ کبھی مسز ڈیوڈ لڑکی تھیں۔ وہ کافی سانولی تھیں، گھٹنوں تک کا نرسنگ ڈریس استعمال کرتی تھیں اور اپنی تھوڑی سی خمیدہ ٹانگوں پر جالیدار سٹاکنگ پہنا کرتی تھیں۔ اسپتال میں سرکاری ڈیوٹی شروع کرنے سے پہلے میں نے جو تعارفی دو دن گذارے تھے اس کے دوران ہی مجھے ایسا لگا تھا کہ مسز ڈیوڈ نے مجھے اپنے پروں میں لے لیا ہے۔ میں جب ایمرجنسی روم پہنچا تو مسز ڈیوڈ نے بتایا کہ کئی مریض میرا انتظار کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ میری ڈیوٹی میں یہ بھی شامل ہے کہ میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھوں جو اپائنٹمنٹ کے بغیر آجائیں یا جو سچ مچ میں اس قدر بیمار ہوں کہ انکو فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہو۔ یہ یقیناً ایک چیلنج تھا کیونکہ ان لوگوں کو مجھے تنہا دیکھ کر خود انکا علاج تجویز کرنا تھا۔

سب سے پہلا مریض ایک سات ماہ کا بچہ تھا جس کی ران پر ایک پھوڑا سا تھا جس کے چاروں طرف سرخ سا سخت دائیرہ بن گیا تھا درمیان میں جگہ پلپلی ہو گئی تھی ایک تو میں بچوں سے ویسے ہی بہت گھبراتا ہوں دوسرے یہ بچہ اس قدر شور مچا رہا تھا اور مچل رہا تھا کہ مجھے کسی صورت خود کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا پھر مسز ڈیوڈ مستقل میرے سر پر سوار تھیں اور کہے جا رہی تھیں کہ YOU NEED TO YANK IT میں نے کبھی یہ ایکسپریشن نہیں سنا تھا۔ یہ امریکی ایکسپریشن ہے جو وہ امریکیوں کے ساتھ کام کر کے سیکھ گئی تھیں ادھر میں اپنی زبان بول رہا تھا اور وہ اپنی۔۔ آخر انہوں نے جھنجلا کر اردو کا سہارا لیا اور کہا ڈاکٹر اس میں چیرا لگانا ہے۔ اوہ!! میں نے انگریزی میں کہا مسز ڈیوڈ یوں کہیں نا

کہ اسکو آئی اینڈ ڈی (INCISION AND DRAINAGE) کرنا ہے۔اب مسئلہ یہ تھا کہ ایک تو وہ بچہ بہت چلبلا تھا دوسرے تمام نئے ماں باپ کی طرح اسکے ماں باپ اس قدر نروس تھے اور اسطرح اس بچے پر اپنا سایہ کئے تھے کہ مجھے بھی اس کے قریب جانے کی کشادہ جگہ نہیں مل رہی تھی۔اس وقت مسز ڈیوڈ کی رگ افسری پھڑکی وہ آخر کار نرسنگ سپروائزر تھیں انہوں نے قدرے سخت لہجے میں دونوں ماں باپ سے کہا کہ وہ باہر جائیں اور لاؤنج میں بیٹھیں۔ انہوں نے معائنے کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ہنری سے کہا اس بچے کو مضبوطی سے قابو کرو اور پھر مجھ سے تحکمانہ لہجے میں بولیں ڈاکٹر تم اپنا کام کرو۔میں نے دستانے پہن کر اور مکمل طور پر اینٹی سپٹک اقدامات کی پابندی کرتے ہوئے ران کے اس حصے کو سن کیا اور نوکیلے نشتر سے جو چیرا لگایا تو پیپ بھل بھل کر کے باہر نکل آئی زخم کو مکمل طور پر صاف کر کے میں نے آیوڈین کا فیتہ اس کے اندر گھسیڑ ا اور ڈریسنگ کر دی اب بچہ بھی پر امن تھا اور میرے بھی دم میں دم آیا مسز ڈیوڈ نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں تم میرے انڈر میں رہو گے تو تمہیں ڈاکٹر بنا کر ہی چھوڑوں گی۔یہ میری پہلی سرجری تھی۔پانچ دن بعد جب بچہ اپنے فالواپ وزٹ کے لئے آیا تو وہ زخم بڑی حد تک بھر چکا تھا۔مجھے ایک انجانی مسرت ہوئی کہ میرے ہاتھوں سے کسی کو شفا نصیب ہوئی۔

ایمرجنسی کے باقی مریضوں کو دیکھتے ہوئے شام کے پانچ بج گئے اور ہسپتال کے آؤٹ پیشنٹ ڈیپارٹمنٹ کے بند ہونے کا وقت آ گیا۔اب رفتہ رفتہ کلنک بند ہو رہی تھی اور زیادہ تر لوگ اپنے اپنے بیگ اٹھا کر رخصت ہو رہے تھے ڈاکٹر چیپ مین بھی جا رہا تھا وہ میرے پاس آیا اور مجھے یاد دہانی کرائی کہ میں پوری رات کال پر ہوں مردانہ وارڈ، زنانہ جنرل وارڈ، بچوں کا وارڈ اور ایمرجنسی روم سب میری ذمہ داری ہے۔امراض خواتین کے وارڈ کو ڈاکٹر اسٹاک ہاؤزن سنبھالتی ہے مگر اگر رات کو کوئی اچانک سرجری ہوئی تو مجھے سرجن کا ہاتھ بٹانے کے لئے آپریشن روم میں بھی جانا پڑیگا۔اس نے کہا بہر حال وہ بھی کال پر رہیگا اور اگر مجھے کسی قسم کی پریشانی ہو یا مجھے مریض کو طبی امداد دینے میں کسی قسم کی غیر یقینی کا سامنا ہو تو وقت کا لحاظ کئے بنا میں اسے گھر پر کال کروں۔اس نے مجھ سے ہمدردی سے کہا کہ رات ہمیشہ مشکل ہوتی ہے مگر اب تم نے یہ پیشہ اپنا ہی لیا ہے تو اس کے لئے تو تمہیں تیار رہنا ہی پڑیگا۔آج اس واقعہ کو چالیس سال گزرنے کے بعد، مجھے اس بات کا خیال آتا ہے کہ اس نے کتنا سچ کہا تھا کیوں کہ میں اب بھی رات کو کال پر ہوتا ہوں اور رات اس قدر مشکل ہوتی ہے کہ صبح ہوتے ہوتے میں نڈھال ہو جاتا ہوں مگر اپنا فرض تو پورا کرنا ہی پڑتا ہے۔

پیشہ ورانہ زندگی کی پہلی رات واقعئی بہت دشوار تھی مجھے سونے کے لئے ایک خوبصورت آراستہ کمرہ دیا گیا تھا مگر سونے کا وقت کہاں تھا پوری رات ہسپتال میں بھاگتے اور تین تین منزلہ سیڑھیاں چڑھتے اترتے گذری۔میرے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ مجھے بند جگہوں سے وحشت ہوتی ہے اس لئے میں ہسپتال میں لگی لفٹ سے گھبراتا تھا اور کبھی کبھی BASEMENT سے مردانہ وارڈ تک چار منزلیں بھی سیڑھیاں ہی چڑھ کر جاتا تھا۔اس وقت تو جوانی بلکہ نو جوانی کے دن تھے مگر اب جب میرے گھٹنوں میں درد ہوتا ہے تو خیال آتا ہے یہ اسی کا خمیازہ ہے۔

بہر حال پوری رات آنکھوں میں کٹی اور میں صبح ہوتے ہوتے تھک کر چور ہو گیا مگر پہلی محبت جیسا سرور تھا اس لئے ایک خوشی بھی تھی رات میں کئی لمحات ایسے آئے جنہوں نے انوکھی لذت سے روشناس کرایا۔اس کا بھی احساس ہوا کہ کسقدر اختیار حاصل ہے اور یہ پیشہ کسقدر POWER رکھتا ہے۔مردانہ وارڈ میں ایک مریض بہت زیادہ بیچین تھا ہر چیز، ہر نلکی اور تمام پٹیاں نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا وہ کافی قوی ہیکل تھا اور کئے وارڈ بوائے اسکو قابو کرتے کرتے تھک گئے تھے میں اسکو کئی دفعہ دیکھنے اوپر جا چکا تھا۔مجھے پھر اوپر بلایا گیا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ اس کی بیچینی طبی طور پر بھی اس کے اپنے لئے نقصان کا باعث ہو سکتی ہے اور یہ بھی کہ اپنے اس برتاؤ میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں میں نے نرس کو آرڈر دیا کہ اسکو رگ کے ذریعہ تھورازین کا ۲۵ ملی گرام کا انجیکشن لگا دو۔میرے خیال سے ابھی پوری دوا اسکے جسم کے اندر بھی نہیں گئی ہو گی کہ چند سیکنڈس میں اسکا قوی ہیکل بدن ڈھیلا ہو گیا اور وہ بیجان سا ہو کر ایک ہی جگہ پر ڈھیر ہو گیا وہ ایسی گہری نیند سویا کہ صبح کی خبر لایا۔یہ لمحہ بڑا ڈرامائی تھا اور میرے لئے صحیح معنوں میں ایک لمحہ فکریہ بن گیا میں نے سوچا کہ ہمارے فیصلے کسقدر اہم ہیں اور کسطرح مریض کی زندگی اور موت کا انحصار ہمارے فیصلوں پر ہوتا ہے۔اس وقت میں نے یہ سبق سیکھا کہ ڈاکٹر کو اپنے ہر فیصلے کے وقت ہر ہر طریقے سے اور ہر ہر پہلو سے اس فیصلے کو جانچنا اور پرکھ لینا چاہئے کیونکہ اس پیشہ نے اور سوسائٹی نے ہمیں لامتناہی اختیار دئے ہیں اور ہمیں ان کا استعمال کرتے ہوئے صرف یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس میں مریض کا فائدہ ہے اور یہی قدم مریض کے لئے سب سے بہتر ہے۔

صبح صبح آرڈرلی ایک بہت سجی ہوئی ناشتے کی ٹرے لیکر میرے کمرے میں آیا مگر اس ہسپتال کا کھانا بہت ہی بدمزہ تھا، مصنوعی انڈے، بغیر کیفین کی چائے اور کافی، لئی جیسا پورج اور نہ جانے کیا الا بلا۔مشکل سے حلق سے چند چیزیں اتاریں۔اب صبح کی ریگولر ڈیوٹی شروع تھی دوپہر کے دو بجے تک تو میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں تھیں اور قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ کیسے دو بجے اور میری چھٹی ہوئی مجھے یاد نہیں باہر نکل کر بندر روڈ پر آیا جہاں ٹریفک کا ہجوم تھا وہاں سے پھر ایک منی بس پکڑی اور بڑے میدان تین نمبر ناظم آباد کا راستہ لیا بڑے میدان کے اسٹاپ سے خالہ جان کے گھر تک پیدل لڑھکھڑاتے قدموں سے آیا اور اپنے چھوٹے سے کھٹولے پر آ کر ایسا گرا کہ پھر کچھ ہوش نہیں رہا۔

☆

''عراق جل رہا ہے''

سلمیٰ اعوان (لاہور)

باب۔۔۔۲

ڈاکٹر ندال جمعہ سے ملنا بھی دلچسپ اور خوبصورت یادیں دینے والا تجربہ تھا۔ مگر اِس سے بھی پہلے ایک اور مسرور کن تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ کرنل بصیر الحانی کے گھر سے چلے تو پونے دو بج رہے تھے۔ سیدھی شفاف سڑک پر بگٹٹ بھاگتی گاڑی کوئی پندرہ منٹ میں شہدا برج پر آ گئی۔

موسم کی شدت حسبِ معمول اپنی انتہائے عروج پر۔ تقریباً پانچ بجے تک ڈھائی تین گھنٹے کا یہ درمیانی وقفہ ہر روز مجھے کسی نہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے اور آرام کیلئے گزارنا ہوتا تھا۔ خدا کے بعد مشرق وسطیٰ کے مولویوں کی بہت شکر گزار تھی کہ انہوں نے مسجدوں کا ایک حصّہ خواتین کیلئے مخصوص کر رکھا ہے جو دراصل عورتوں کے ریٹائرنگ روم ہیں۔ کھاؤ، پیئو، لیٹو سو جاؤ۔ کانوں میں ہیڈ فون چڑھا کر گانے سنو۔

سچ تو یہ تھا کہ میں اِس 1/4 حصّے کو بڑے دھڑلے سے استعمال کر رہی تھی۔ تھوڑا سا آرام اور تھوڑی سی نیند جسم و جان میں تازگی بھر دیتی تھی۔ ایسے لمحوں میں مجھے ساؤتھ ایشیا کے کنٹر اور دقیانوسی ملاّ یاد آتے جنہوں نے عورتوں پر مسجدوں کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ دُر دُر جیسا پوسٹر چہروں پر سجا کر دروازے سے ہی انہیں دفع دور کرتے ہیں۔

افلاق نے مجھے شہدا برج پر مستنصریہ مدرسہ کی ملحقہ مسجد ال آصفہ میں اُتارا۔ دجلہ کے کنارے اس خوبصورت سی مسجد کو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔

لیٹی ضرور تھی مگر نہ آنکھیں بند ہوئیں اور نہ اعضاء نے آرام کی خواہش کی۔ وجہ شاید چلت پھرت کی کمی تھی۔ اٹھی اور باہر نکل آئی۔ ساتھ ہی المتنابی سٹریٹ ہے۔

المتنابی جدید وضع کی بلند و بالا عمارات کی حامل جسکی بالکونیوں کے پیچھے ان کی ریلنگ اور ان پر کئے گئے رنگوں اور مارکیٹوں میں بکھرے سامان کے امتزاج سے قوس قزح کی سی دنیا کا تاثر دیتی تھی۔

داخلہ آسمان کو چھوتی محراب سے ہوا۔ کہیں کہیں عمارتوں کی بالکونیاں ایک دوسرے سے جھپّیاں ڈالنے کو مچلتی نظر آئی تھیں۔

عراقی روشن خیال قوم ہے۔ اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے پر ناز کرنا جانتی ہے۔ انہیں باعزت اور قابل فخر مقام دیتی ہے۔ ماضی کے متنازعہ شاعر ابو نواس ہو، المتنابی ہو بغداد کے کوچہ و بازار میں عظمتوں کے تاج پہنے کھڑے ہیں۔ بلا سے کوئی مرتد تھا یا پیغمبری کا دعوے دار۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوفے میں 915 ہجری میں پیدا ہونے والا المتنابی اپنی شاعری میں پختہ کار تھا۔ قصیدہ گوئی میں کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین سو نظمیں اس کی داستان زندگی کی بہت سی پرتوں کو کھولتی ہیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور کلام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

''میں وہ ہوں جس کے لکھے ہوئے کو اندھا بھی پڑھ سکتا ہے۔ میری شاعری جادوئی اثر رکھتی ہے۔ جسے بہرہ بھی سن سکتا ہے۔ جو کام تلوار اور تیر کرتے ہیں۔ میرا کاغذ، قلم اور حرف اُس سے زیادہ موثر ہیں۔''

یہ شاعرانہ صلاحیتوں کی انتہا تھی یا ذات کے تکبّر کا نشہ کہ پیغمبری کا دعوٰی کر بیٹھا۔ رگ رگ میں سیاسی خواہشوں کا ہیجان تھا کہ ہر صاحب اقتدار کی مداح سرائی ضروری تھی۔ ایک بغاوت کے نتیجے میں وہ قید بھی ہوا۔ قید بامشقت بھی کاٹی اور اپنی خواہشوں میں بھی ناکام ہوا۔ مگر شاعر کے طور پر کمال کو پہنچا۔

المتنابی بازار اسی شاعر کی یاد میں ہے۔

میں کتابوں کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ یہ کتابوں کا جہان تھا۔ یہاں کتابوں کی دنیا آباد تھی۔ صاف ستھرے فرشوں پر بکھری ہوئیں، تھڑوں پر ڈھیروں کی صورت پڑی ہُوئیں، تختوں پر بچھی ہوئیں۔ برآمدوں کے ستونوں سے ٹکائے عارضی چوبی شیلفوں میں دھری اور بڑی بڑی دوکانوں کی شیشے کی الماریوں میں سجی ہوئیں۔

شاندار مردوں کے پرے کہیں انہیں پھرولتے، کہیں انہیں پڑھتے، کہیں بھاؤ تاؤ کرتے نظر آئے تھے۔ کتنی دیر میں نے بھی انہیں دیکھا لیکن وہ زیادہ عربی میں تھیں۔ فرنچ میں تھیں جو میرے لیے بیکار تھیں۔ انگریزی میں جو چند دیکھیں وہ ایسی نہ تھیں کہ میں انہیں جھپٹ کر دبوچتی۔

میں چلتے چلی جاتی تھی۔ برآمدوں کے سایوں میں اور یہ بھی دیکھتی تھی کہ کہیں کہیں اس کے وجود کے کسی چھوٹے سے حصّے پر، کہیں بڑے پر جیسے برص کے سے داغ ہیں۔ جلنے سڑنے کے، ٹوٹے پھوٹے ہونے کے، شکستگی کے، نڈھالی کے۔ ایسا کیوں ہے؟ بانکپن میں یہ داغ دھبے کیوں؟ رُک کر پوچھا تو جانا کہ کوئی ڈیڑھ سال قبل بم بلاسٹ ہوا تھا۔ جاہلوں نے علم کے اِس مرکز کو تباہ کر دیا۔

نوجوان لڑکے نے مجھے دوکان کے اندر آنے کی دعوت دی۔ کرسی پیش کی اور بولا ''بڑا دردناک منظر تھا۔ کتابوں کے صفحات ژالہ باری کی صورت برس رہے تھے۔ جلتے بالوں، جلتے انسانی گوشت اور دھوئیں کے سیاہ بادلوں نے فضا کو دہشت ناک بنا دیا تھا۔ تخریب کاری نے صفحات کو چاٹ لیا تھا۔ بغداد اِس المناک سانحے پر چیخ اٹھا تھا۔

پوری دنیا میں بکھرے عراقیوں کے پیغامات نے اس کے اندر نئی روح پھونک کر اِسے کھڑا کر دیا تھا۔ صفحے جو جلے تھے پھر سے زندہ ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں سج گئے۔ المتنابی کی رونقیں لوٹ آئیں۔ ہم نے اِس کہاوت کو سچ ثابت کر دیا کہ

Cairo writes, Beirut publishes and Baghdad reads.

میری اِس خواہش پر کہ کیا وہ مجھے کسی ایسے بندے سے ملاسکتا ہے جس سے میں عراقی ادب کے حوالے سے کچھ باتیں کرسکوں۔

''ضرور ضرور'' بڑا پرجوش سا لہجہ تھا۔

''آیئے'' وہ مجھے ساتھ لیئے چلنے لگا۔کوئی چوتھائی فرلانگ پر ایک بہت بڑی دوکان کے اندر داخل ہوئے۔اتنی بڑی دوکان تھی کہ میں حیرت سے گنگ اُسے دیکھے چلی جاتی تھی۔لڑکا مجھے لے کر غربی سمت بڑھا جہاں چند سیڑھیاں اُتر کر ہم ایک تہہ خانے میں اُترے۔یہ تہہ خانہ کب تھا؟ یہ بغداد کا ادبی چہرہ تھا۔جہاں چوبی بینچوں پر دھرے خوبصورت گدّے نما کشنوں پر چند لوگ بیٹھے حقے کے کش لگاتے، بحث ومباحثے میں اُلجھے ہوئے دِکھے تھے۔آٹھ نو کی نفری ناول نگار،صحافی اور شاعروں پر مشتمل جو ولید ال ونداوی، علی جعفر، رسُل ال قیسی، رعید جرار، لولوا کاظم۔جنہوں نے پرجوش انداز میں استقبال کیا،کھڑے ہوئے،عزت دی۔

میں نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔مناسب سہولتوں سے سجا سنورا کمرہ جس کی سامنے والی دیوار پر آراستہ بڑی سی تصویر المتنابی سٹریٹ میں بچھے صوفوں پر بیٹھے وزیراعظم نورالمالکی کے ساتھ کتب خانہ الفردوس کے مالک کی تھی جو بڑا نمایاں نظر آتا تھا۔یہ سب مجھے تعارف کے وقت معلوم ہوا تھا۔تصویر کے متعلق بھی وضاحت ہوئی تھی کہ بم بلاسٹ کے بعد حکومت اور وہ سب جنہیں کتاب سے محبت تھی۔جنہوں نے گہرے دُکھ اور یاس کا اظہار کیا تھا۔وہ لفظ کے تقدس اور اس کی حرمت کیلئے حکومت کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوئے۔فوری کوششوں سے اس کی بحالی ہوئی۔صرف ڈیڑھ سال میں انہوں نے اس کی رونقیں لوٹا دیں۔اور تخریب کاروں کو پیغام دیا تھا کہ تمہاری تخریب کاری نے وقتی طور پر حرف جلا ڈالے مگر دیکھو ہم نے انہیں پھر سے زندہ کردیا ہے۔

گفتگو کے دروازے کُھلنے لگے۔ادب اور آرٹ کے حوالوں سے جب باتیں شروع ہوئیں تو وہ سب گفتگو میں یوں شامل ہوئے کہ قہوے کی چسکیاں تھیں اور باتیں تھیں۔

1950 کا زمانہ ادب اور آرٹ کے لحاظ سے ایک طرح نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ادب میں مختصر کہانیوں کے رجحان نے زور پکڑا گو ابھی تک ناول بہت کم کم لکھا گیا تھا۔شاعری میں البتہ نئے رجحان سامنے آرہے تھے۔اس میں آزادنظم نے زور پکڑا اور اپنا آپ منوایا تھا۔

اسی طرح فلم، مجسمہ سازی اور پینٹنگ میں نئے ٹرینڈز در آئے۔ اس میں کچھ تو یورپی اثر دخیل ہوا مگر قومی اور ایک نئی مملکت کے طور پر ابھرنے والے ملکی کلچر کے بارے احساسات کے اظہار میں بہت شدت آئی۔اُن بدلتے رجحانات کا بھی دباؤ تھا جو ایک دقیانوسی سوسائٹی سے ماڈرن سوسائٹی میں داخل ہوتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ بڑے پیارے لوگ تھے۔باتوں کے رسیا،قہوے اور حُقّے کے دھنی۔گہرے سیاہ قہوے کی جب تیسری پیالی میرے سامنے لاکر رکھی گئی میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا اور خود سے کہا۔

''اِسے تو میں نے چھونا بھی نہیں۔سارا حلق کڑواہٹ سے بھر گیا ہے۔ابھی چینی کی پانچ کیوبز ڈالی تھیں تو یہ حال ہے۔آفرین ہے اِن لوگوں پر جو اِسے پانی کی طرح پیتے ہیں۔''

سچی بات ہے مجھے تو اُنکے نام بھی یاد نہیں رہنے تھے اگر وہ خود اِس کا اِس درجہ اہتمام نہ کرتے کہ جو بھی گفتگو میں شامل ہوتا وہ ہر بار اپنا نام اور کام دہرانا نہ بُھولتا۔جس کا فائدہ وقت کی کمی کے باوجود مجھے ہوا تھا کہ جب میں نے رات کو ڈائری میں انہیں قلم بند کیا تو وہ سب اپنے ناموں، کاموں، شکلوں اور آوازوں کی انفرادیت کے ساتھ میرے سامنے تھے اور کہیں ابہام نہیں تھا۔

پہلا شارٹ سٹوری رائٹر عبدالمالک نوری جس کا مدرسہ فکر مروجہ روایت سے بغاوت تھی۔مختصر کہانی کے حوالے سے جس نے ادب کا یہ باب کھولا تھا اس کا لب ولہجہ علی جعفر کی نسبت زیادہ صاف،تلفظ زیادہ بہتر اور گفتگو آسانی سے سمجھ آنے والی تھی۔رعید جرار جو خود بھی کئی کتابوں کا مصنف تھا۔وہ عبدالمالک نوری کے حوالے سے بات کرتا تھا۔اس کا بہترین کام ناشد لارض Nashid-al-Ard۔(دھرتی کا گیت) کی صورت سامنے آیا تھا۔اس میں سوسائٹی کے پسے ہوئے طبقوں کی عکاسی تھی۔دراصل قانون اراضی ایکٹ نے عراقی معاشرے کی لوئر مڈل کلاس کو جسطرح زرعی غلام بنا کر رکھ دیا تھا اور اعلیٰ تعلیم اور مراعات بالائی اور درمیانے طبقے کے لیے مخصوص ہوگئی تھیں۔اس سے بے چینی، اضطراب اور جوگھٹن پیدا ہوئی، اس کو نوری نے بہت خوبصورتی سے پوٹریٹ کیا۔South wind The میں صدیوں کے رائج معاشرتی رویوں پر احتجاج تھا۔

اِسی طرح فہد ال تکرلی Faad-Al-Takarli میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد کی رسوم پر سخت نکتہ چینی کی۔

Safirah Hafiz سفیرہ حافظ نے عورتوں پر ہونے والی سختیوں اور مظالم پر لکھا۔اس دور میں کیمونسٹ سوچ بھی اثر انداز ہوئی۔شاعری میں یہ زیادہ کھل کر سامنے آئی۔جمیل صدقی الزاہوی، مہدی الجواہری، سعدی یوسف، مظفرالنواب یہ سب بائیں بازو کے وہ ترقی پسند شاعر تھے۔جنہوں نے حقیقتاً ایک عملی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ان کی شاعری اتنی پر اُثر تھی کہ پوری عرب دنیا میں یہ شاعری گونجی۔آزادنظم کے شاعروں میں ایک بہت بڑا نام نازک الملائیکہ کا بھی ہے۔جس نے عورتوں کے مسائل، محبت اور عورتوں کی آزادی پر کھل کر جرأت داری سے لکھا۔

نازک الملائیکہ سے میرا تھوڑا بہت تعارف ضرور تھا مگر رسُل ال قیسی اُس کا بہت مدّاح تھا اتنا کہ بدر سے بھی زیادہ اُسے سراہتا تھا۔

بدر شاکر اسیاب کا نام بھی بڑا اہم ہے۔اس کی شاعری کے بہت

سے مرحلے تھے۔ابتدائی دور اگر رومانوی تھا تو حقیقت پسند شاعر بن کر اُس نے کمال کی شاعری کی۔ بدر کے ہاں انقلابی ذہنیت تھی۔انہوں نے شاعری کے مروجہ اصولوں اوران کی بندشوں سے آزاد ہوکر لکھا اور خوب لکھا۔

بدر اور نازک الملائیکہ پر باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔اسی طرح ال شعیب کے ہاں موضوعات کا تنوع تھا۔عربوں کے اندر اپنے مستقبل بارے پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب ،اُن کی جہالت،سادگی اور انہیں ملنے والے دھوکے اور ان پر مغربی تہذیب کی یلغار۔شعیب نے ان احساسات کو بہت خوبصورت زبان اور ادائیگی دی۔

اگر یہاں عبدالوہاب الباقی کا ذکر نہ کیا جائے۔رُسل ال قیسی کا لہجہ خاصا جوشیلا تھا تو عراقی شاعری کا باب ادھورا رہے گا۔سوشلسٹ نظریئے کا شاعر جس نے مظلوم اور نچلے طبقے کو جھنجھوڑا مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی عرب شناخت پر بھی زور دیا۔

Exile From Exile کا بھی پڑھنے سے تعلق ہے۔آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اسے پڑھتے ہوئے کہ عربوں کو کیسے دربدر اور دیس بدر دکھایا ہے۔

صوفے کے آخری کونے پر بیٹھے لولوا کاظم بھی اچھا بولنے والے انسان تھے۔صاحب علم تھے مگر یہودیوں سے بہت متاثر لگتے تھے۔مجھے تو گمان گزرا تھا کہ شاید یہودی ہیں۔اور میں نے پوچھ بھی لیا تھا وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''ہوں تو نہیں مگر متاثر ضرور ہوں۔''

ڈیوڈ Semach اور Sasson Somekh عراقی نژاد یہودی جو اسرائیل چلے گئے تھے عربی لٹریچر پر بہت کام کر رہے ہیں۔مہدی عیسیٰ ال سکر Issa-al-Saqr ماڈرن عراقی لٹریچر کے بانیوں میں سے ہے۔آرٹ کے حوالوں سے بھی تھوڑی سی بات ہوگئی۔

آرٹ میں تین قسم کے رجحانات ظاہر ہوئے۔روایتی طریق کا مکمل خاتمہ۔عام آدمی کو فوکس کیا گیا۔دیہاتی اور شہری زندگی کی عکاسی،عراقی ثقافت قدیم اور کلاسیکل زمانوں کی۔

یہاں ہمیں جواد سلیم کا ذکر اور انہیں ضرور خراج پیش کرنا ہے۔علی جعفر نے جتنی باتیں کی تھیں وہ آرٹ سے متعلق ان کی باریک بینی کو ظاہر کرتی تھیں۔بہترین مصور اور مجسمہ ساز۔ان کے کام میں بابل اور سمیری عہد کے موضوع زیادہ غالب رہے۔اسی طرح Faiq حسن کا کام بہت شاندار تھا۔انہوں نے بہت خوبصورتی سے پرانے بغداد کی زندگی کو پینٹ کیا۔

یہ سب اپنے اپنے وقت کے نظام حکومت کے زبردست نقاد اور باغی تھے۔یہ گرفتار ہوتے یا جلاوطن کر دیئے جاتے یا وہ خود ہو جاتے۔ال شعیب جو پہلے کیمونسٹ تھا۔بعد میں عرب سوشلسٹ بن گیا۔اُس نے بہت مشقتیں کاٹیں۔

یہ روایتی سوسائٹی پھر تیل کی دولت،معاشی ترقی،تعلیمی اصلاحات کے نتیجے میں بدلنے لگی۔ایک نئی تعلیم یافتہ نسل مراعات یافتہ طبقوں کی صورت اُبھری اور جب اس کے مزید ترقی یافتہ بننے کے آثار اُبھرے اُسے جنگوں میں الجھا دیا گیا۔اور اب جو حالات ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔آپ بھی بہت کچھ جانتی ہیں۔

میں نے درمیان میں کئی بار نگاہیں اٹھا کر گھڑی کو دیکھا تھا۔پوچھنے پر بتایا کہ ڈاکٹر ندال جمعہ سے چھ بجے کا وقت طے ہے۔

میرا موبائل بجا تھا۔معذرت کرتے ہوئے کانوں سے لگایا۔''میں کہاں ہوں'' افلاق پُوچھتا تھا۔اس کی موبائل پر رعید جرار سے بات کروائی جس نے اُسے بتایا۔

تصویریں بنائیں اور رخصت ہوئی۔رات کے ڈنر پر ان کے بے حد اصرار کے باوجود میرے پاس معذرت تھی کہ میں جانتی ہی نہیں تھی ڈاکٹر ندال کے پاس سے میں کب فارغ ہوں گی؟

سچ تو یہ ہے کہ اِن صاحبِ علم لوگوں کی قربت نے مجھے مسرور کیا تھا۔میں نے بہت کچھ جانا تھا۔

گاڑی افلاق نے کہیں پارک کر دی تھی۔پیدل ہی ہم چل پڑے تھے۔الرشید سٹریٹ کی بغلی گلیوں میں جہاں قدیم صاحب ثروت خاندانی بغدادیوں کے خوبصورت گھر تھے جن کا تعمیری انداز دمشق اور حلب کے گھروں جیسا ہی تھا۔سیاہ گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے کشادہ آنگن میں فوارّہ موتی برساتا نظر آیا۔ہرے کچور پیڑوں،سبز گھاس کے قطعوں،پھولوں،وسیع وعریض صحن میں جگہ جگہ دھرے نسوانی مجسموں نے میری آنکھوں میں خوشی بکھیری تھی۔

چونکہ وقت طے تھا اس لیئے ملازم سیدھا نشست گاہ میں لے آیا۔نشست گاہ کشادہ قوسی چھت کے ساتھ ریلنگ والی تھی۔صوفے پر بیٹھنے کی بجائے میں نے دیواروں پر آویزاں اس خاندان کے بڑوں کی تصویریں دیکھنی شروع کیں۔ابھی پہلی تصویر سے دوسری پر نہیں پہنچی تھی کہ ڈاکٹر ندال پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔میں نے فوری توجہ کی۔

کیا دل کش عورت تھی۔گردن تک کٹے سنہری بالوں،غلافی آنکھوں،شہابی رنگت اور دراز قد۔کوئی چالیس 40 پنتالیس 45 کے پیٹے میں گھری۔مختصر سا تعارف تو مڈل مین کی وساطت سے ہو ہی چکا تھا۔انہوں نے تصویروں میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے مجھے بتانا شروع کیا۔

شاہ فیصل اوّل کے ساتھ ان کی کابینہ میں ڈاکٹر ندال کا پردادا۔ایک دلربا سے نوجوان پر انگلی رکھتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا تھا یہ شاہ غازی شاہ فیصل کا بیٹا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری،چوتھی اور پانچویں دہائیوں کا بغداد اپنے کلچر ماڈرنزم اور خواتین کے حوالوں سے بہت شاندار سا تھا۔ایسی دلکش،طرحدار اور ماڈرن خواتین۔شاہ فیصل کی والدہ ملکہ اوریا،ڈاکٹر ندال کی پردادی،تاریخ عراق کا بدترین انسان نوری السید اور اس کی سٹائلو مارکہ بیوی۔کیا حسین چہرے تھے۔ان کے پہناوے بالوں کے سٹائل۔مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی میوزیم میں

کھڑی بغداد کی تہذیبی زندگی کو ماہ وسال کے آئینے میں گزرتے دیکھ رہی ہوں۔

پھر میری نظریں ایک تصور پر جم گئی تھیں۔کیا چہرہ تھا۔بلیک اینڈ وائٹ تصویر مگر حُسن پرانی تصویر سے ہی پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہا تھا۔میری آنکھوں سے لپکتے حسن کو خراج پیش کرتے میرے جذبات ڈاکٹر ندال پر پوری طرح ظاہر ہوئے تھے۔جب میں نے استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا تھا۔

''شہزادی عزا ہے۔شاہ فیصل کی بیٹی۔اپنے گریک خانساماں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔عیسائی ہوگئی تھی۔''

شاہ غازی کے ساتھ اُس کے دادا کی تصویر جو ابھی پانچ چھ سال کا خوبصورت لڑکا تھا۔1956 کی پارلیمنٹ میں شاہ فیصل دوم کے عین ساتھ اُس کا دادا جواب ایک گھبرو رعنا جوان کا روپ دھارے چہرے پر سنجیدہ سی مسکراہٹ بکھیرے کھڑا تھا۔اگلا منظر نامہ بڑا مختلف تھا۔بادشاہت کے خاتمے کے بعد عبدالکریم قاسم کی حکومت کا بڑا معتمد اور سرگرم رکن کے طور پر تصویروں میں نمایاں تھا۔حسن البکر اور صدام کے ساتھ دونوں باپ بیٹا بیٹھے تھے۔باپ بعث پارٹی میں شامل ہو کر صدام حکومت کا حصہ بنا۔صدام کی فیملی سے قریبی اور فیملی تعلقات کا اندازہ ہوتا تھا۔صدام کی دونوں بڑی بیٹیوں کی ڈاکٹر ندال کے ساتھ بھی تصویریں تھیں۔باپ، بھائیوں اور خاندان کی ماضی کی سرکردہ سیاسی شخصیتوں اور بدلتے وقت کے ساتھ نئے چہروں کے ساتھ تعلق نے مجھے پاکستان کی اشرافیہ کی یاد دلائی تھی۔

ایسی ہی ہر چڑھتے سُورج کو پوجنے والی۔

''میں انقلابی ذہن کی مالک تھی اور ہوں۔اپنے خاندان کی اِس ہر نوالے بسم اللہ کو میں نے کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔''ڈاکٹر ندال صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

صوفے پر پاس پاس بیٹھے تو پہلی بات پاکستان کے حوالے سے ہوئی۔اِسلیے تو دونوں کے بڑے مشترکہ ہیں۔صدام کے بارے میں بات ہوئی تو اُسنے دوٹوک لہجے میں کہا۔

میں صدام کی کبھی حامی نہیں رہی۔مجھے سخت اختلاف رہا ہے اُس کی پالیسیوں سے۔مگر اُس میں کچھ اعلیٰ پایہ کی خوبیاں بھی تھیں۔وہ لبرل اور ماڈرن تھا۔عراقی عورت کی آزادی اور اُس کی اعلیٰ تعلیم کیلئے کوشاں۔ملک کے ہر ضلع میں جی ایف آئی ڈبلیو کی تنظیمیں بنائیں۔جنہوں نے عورتوں کی سیکنڈری لیول اور اعلیٰ تعلیم کیلئے بہت کام کیا۔

عبدالکریم قاسم کے زمانے سے صدام تک اُس کا تسلسل کسی نہ کسی صورت جاری رہا۔صدام کے مخالفین اکثر اس پر اعتراض کرتے تھے کہ وہ یہ سب چکر بازیاں بعث پارٹی اور حکومت پر اپنی گرفت مظبوط کرنے کیلئے کر رہا ہے مگر یہ درست نہیں۔عرب ممالک میں عراق سب سے پہلا ملک تھا جس نے سو فی صد شرح خواندگی کا اعزاز حاصل کیا اور جس کی پارلیمنٹ میں خاتون منتخب ہوئی۔آج بہت ساری خواتین سیاست میں سرگرم ہیں۔

اُس کی شخصیت کا یہ پہلو بھی بڑا روشن تھا کہ وہ صاحب کردار تھا۔شراب اور شباب دونوں سے اُسے پرہیز تھا مگر بڑا منتقم مزاج تھا۔اس ضمن میں ہر اٹھنے والی آواز کا گلا گھونٹنا اُس کیلئے ضروری تھا۔اِس میں وہ اپنی اور غیر کی تمیز نہیں کرتا تھا۔ذاتی مخالفت میں اس نے اپنوں کو بھی نہیں بخشا حتیٰ کہ خونی رشتوں کو بھی۔تھا بھی عام سے عراقی چرواہوں کے خاندان سے۔فیملی بھی بڑی متکبر ہوگئی تھی۔مجال تھی کہ مخالفت میں اس کی طرح جو ایک لفظ بھی سُن جائے۔

مرد تو چھوڑ سکول جانے والی لڑکیاں بھی انتہائی بے ہودہ اور واہیات۔صدام کی پہلی بیوی ساجدہ کی چھوٹی بہن العم خیر اللہ راہبت التقدومہ Rahibat al Taqdomah کرسچین کونونٹ میں پڑھتی تھی۔چھوٹے سے کسی مذہبی مسئلے پر ایک ہمارے انتہائی قریبی ملنے والی کُرد فیملی کی لڑکی سے اختلاف ہوا تو لڑکی کو سبق سکھانے کیلئے سیکرٹ سروس والوں سے اغوا کرادیا۔خیر چند دنوں بعد لڑکی واپس آگئی۔

ابوغرب کا جیل خانہ جسے اب سنٹرل جیل کا نام دے دیا گیا ہے۔یہ بغداد کے مغربی مضافات میں کوئی تیس کلومیٹر پر 1950 میں برٹش انجنیئر وں نے بنائی تھی۔صدام نے اسے مزید وسعت دی اور اپنے گھناؤنے مقاصد کیلئے استعمال کیا۔یہ حقیقت ہے کہ جیلیں اُس نے بھی بھر رکھی تھیں۔ابو غرب جیل میں ہی کوئی دس ہزار لوگ ہونگے ان جیلوں میں تشدد ہوتا تھا۔پھانسی گھاٹوں پر گردنیں بھی کٹتی تھیں۔مگر یہ جیلیں بدمعاشی کے اڈے ہرگز نہیں تھیں۔عورت پر کہیں زیادتی ہو اُسے برداشت نہیں تھا۔

امریکہ نے جب عراق کے جنگی تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے بارے شور مچایا اور کہا کہ یہ ہتھیار ابوغرب جیل میں رکھے گئے ہیں۔صدام نے جیل کے دروازے کھول دیئے۔اور قیدیوں کو جو کسی نہ کسی جرم یا کسی نہ کسی سازش میں گرفتار تھے سبھوں کو آزاد کر دیا۔یہ لوگ جب ٹارچر سیلوں سے نکلے تو امریکہ کا ساتھ دینے کی بجائے ان کے نعرے تھے۔

''او صدام ہمارا خون اور ہماری روحیں تم پر قربان ہوں گی۔''

ابوغرب جیل میں عراقی عورتوں پر امریکیوں کے ریپ اور Abuse پر جب بات ہوئی ڈاکٹر ندال نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

اس جمہوریت کے علمبردار نے جو ہمیں آمر سے آزاد کروانے آیا تھا۔اُس نے قید خانوں کو Taboo بنا دیا ہے۔اس ملک میں جہاں عورت کی عزت اور وقار میں ہی معاشرے کی جان ہے۔

خوبصورت عورتوں کے شوہروں کی پکڑ دھکڑ، ان کا گھروں کے اندر سے اغوا، ان کی عصمت ریزی، بعد میں کہیں انہیں جلانے، کہیں پھینکنے، کہیں زندہ صورت جیلوں میں ٹھونسنے، کہیں ان کی دوسرے ملکوں میں سمگلنگ، بچے کہیں، مائیں کہیں اور شوہر کہیں۔جب میں رپوٹیں بنانے کیلئے مختلف علاقوں میں جاتی تو ایسی ایسی ہولناک تصویریں میرے سامنے آتیں کہ مجھے لگتا تھا جیسے

میرا دل پھٹ جائے گا۔عام عراقی عورت تو یوں بھی اپنے بارے میں کوئی خبر دینا خود پر ہونے والے کسی ظلم کو دلیری سے عریاں کرنے کو پسند نہیں کرتی کہ قبائلی روایات کا اسیر معاشرتی ڈھانچہ بے حد حساس ہے۔ پیچھے رہ جانے والے خاندان کو حقارت بھری نظروں کے تیروں سے چھلنی کر دیتا ہے۔

شیعہ مسلک سے تعلق کے باوجود مجھے موجودہ حکومت کا رویہ قطعی پسند نہیں۔امریکی ان کے مونڈھوں پر سوار ہیں۔سنی عورتیں اس تشدد کا زیادہ نشانہ بنیں اور بن رہی ہیں۔ابھی بھی جیلوں میں بے شمار ہیں جنہوں نے مزاحمت کی اور مقامی پولیس اہلکاروں اور امریکی فوجیوں کو قتل کیا۔

البتہ مقامی پولیس کے نیچے لیول کے لوگوں نے اپنے پرانے غصے نکالے۔مقامی عدالتوں نے انصاف نہیں کیا۔یوں بڑے اور ہیبت ناک مظالم کے راستے ہموار ہوئے۔

اِن واقعات کا ٹی وی چینلوں اور اخبارات کے ذریعے دنیا بھر میں چرچا اِس انداز میں ہوا ہی نہیں جیسے یہ واقعات اپنی سفاکیوں کے ساتھ پیش آئے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے کارندے بھی اُس سطح پر جا کر حالات کے دامن میں نہیں اتر سکے۔ میں نے چند تصاویر جو انہیں دکھائیں وہ تو حیران پریشان رہ گئے۔ننگی عورتوں کے پیرامڈ بنواتے،خود دائروں میں کھڑے ہو کر قہقہے لگاتے ،ہنستے، گانے گاتے،ریپ کرتے، لاشیں جلاتے انسانی وحشت اور بربریت کی انتہا ہے۔یہ جیلیں امریکیوں کے کالے کرتوتوں کا سپاس نامہ ہے۔

عراق کے مشہور شیلابی خاندان کی میڈیکل میں پڑھنے والی بیٹی کے ساتھ گینگ ریپ اور افراد خانہ کے قتل پر اندر خانے جو کچھ ہوا وہ لرزا دینے والی داستان ہے۔گینگ ریپ کے دوران بچی مر گئی۔اُس کی لاش کو جلایا گیا۔امریکی سپاہیوں کا چوتھا ساتھی جسے اس بہتی گنگا میں نہانے کا موقع نہ ملا تھا اُس نے اِس واقعے کی موبائل پر فلم بنا کر اوپر پہنچا دی۔

طفیلی حکومت کا ٹولہ انگشت بدنداں تھا اور ہر صورت مجرموں کے کورٹ مارشل پر مُصر تھا مگر امریکن فوجی افسر اِس لرزہ خیز واردات کو غیر موثر بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔گرینڈ جیوری نے کیمپ لبرٹی میں کیس کی سماعت میں کہا کہ آخری فیصلہ امریکی جنرل کرے گا کہ کورٹ مارشل ہونا چاہیئے یا نہیں۔

صفائی کے وکیلوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کیس کو مضبوط کر دیا تھا کہ بیچارے ملزمان تو دہشت گردی کی مریضانہ حالت میں تھے۔ان کی بٹالین کے سترہ ساتھی عراقی مزاحمت کاروں کے خودکش حملوں میں مارے گئے تھے وہ تو نارمل اخلاق باختہ جنسی مجرموں کی فہرست میں ہی نہیں آتے ہیں۔

اب مجھے بتاؤ کہ اس کے مامے چاچے جو اینٹی القاعدہ تھے کیوں کر نہ القاعدہ میں شامل ہوتے۔آپ انہیں تخریب کار اور دہشت گرد کہتے ہیں۔یہ تو آپ خود بناتے ہیں۔اللہ! میرے اندر سے بین کرتی آہیں نکلیں۔ہے جرم ضعفی کی سزا مرگ مفاجات۔

○

کراچی سے تعلق رکھنے والے نوجوان ادیب راشد اشرف کی تیسری کتاب ''مولانا عبدالسلام نیازی۔آفتابِ علم و عرفان''، اردو اکیڈمی بہاولپور سے شائع ہوگئی ہے۔

مولانا نیازی دلی کی عبقری شخصیت تھے جن پر مختلف مشاہیر ادب کے لکھے مضامین کو کتاب میں یکجا کیا گیا ہے۔

کتاب کا عنوان مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے فرزند حیدر فاروق مودودی کا تجویز کردہ ہے۔

اردو اکیڈمی کا پتہ یہ ہے:

۳۳سی، ماڈل ٹاؤن اے(A)، بہاولپور۔

فون:062 731934

سیل فون نمبر: 0300 9684150،

ڈاکٹر شاہد رضوی، مدیر الزبیر (اردو اکیڈمی)

ای میل:

editor.alzubair@gmail.com

مذکورہ کتاب کراچی اردو بازار میں ویلکم بک پورٹ اور فضلی سنز سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

قیمت:400روپے

ہندوستان میں کتاب کے حصول کے لیے رابطہ کیجیے:

محمد انیس الدین، پلاٹ نمبر B-6، آفرین ٹیچرس کالونی، پوسٹ بکس، کھام گاؤں سٹی، ضلع بلڈانہ، ریاست مہاراشٹر (انڈیا)444303

برقی پتہ:

anis_riz@yahoo.com

رابطہ نمبر::9422884848

☆

''خوشیوں کے سہرے''

جشن

ندا فاضلی
(ممبئی، بھارت)

سونے والے کمرے کی کھڑکی کے باہر
کل شب ایک میلہ سا لگا تھا
گنگا گھاٹ سے بسمہ الہ خاں
اپنی شہنائی لائے تھے
ماہم کی درگاہ سے اُڑ کر
(الہ رکھا کے ہاتھوں سے)
سُر طبلے پر لہرائے تھے
مہدی اور جگجیت نے مل کے
خوشیوں کے سہرے گائے تھے
لیکن میں
چادر میں لپٹی نیند سے باہر دیکھ نہ پایا
سورج نے ہی آ کے دکھایا
کل تک جو دو پتھر جیسے
انڈے یہاں پڑے ہوئے تھے
وہ دونوں اب
چھوٹے چھوٹے نئے کبوتر بن کے
آنکھیں کھول چکے تھے

○

تخلیق کار

میرے گھر کی بالکنی میں
تنکوں کے چھوٹے سے گھر میں
پنکھ سمیٹے
آنکھیں میچے
وہ جو چپ چپ سی بیٹھی ہے
اک انجانی کبوتری ہے
وہ شاید بہری ہے
اس نے یہ مل کے سیٹی سنی نہیں ہے
گھبرا کے وہ اڑی نہیں ہے
وہ شاید اندھی ہے
اُسے پتہ نہیں ہے
چھاؤں کدھر ہے
دھوپ کہاں ہے
اس کے اپنے انڈوں تک ہی
اس کا جہاں ہے
انڈوں کے چوزے بننے تک
وہ بہری ہے
وہ اندھی ہے
کبوتری ہر ماں جیسی ہے

○

قطعات

محمودالحسن (راولپنڈی)

کجکلاہی دلیلِ کج فہمی
خاکساری ثبوتِ دانائی
اہلِ دل سے سُنا ہے یہ میں نے
ایک دھوکا ہے شانِ دارا ئی

عشق الفاظ کا محتاج نہیں
عاشقی رُخ سے عیاں ہوتی ہے
عشق کا ربط ہے خاموشی سے
اور ہوس چرب زباں ہوتی ہے

گوبظاہر حقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
سروری جن پہ ناز کرتی ہے
وہ تمہارے فقیر ہوتے ہیں

تیرا غم ہو تو لطف آتا ہے
آنکھ نم ہو تو لطف آتا ہے
اب مجھے قہقہے پسند نہیں
شور کم ہو تو لطف آتاہے

جان دیتے ہیں جو رہِ حق میں
زندگی کا وقار ہیں وہ لوگ
غیر فانی ہے زندگی اُن کی
جاودانی بہار ہیں وہ لوگ

دل پریشان آنکھ نم نہ کرو
دیکھو اپنا وقار کم نہ کرو
مسکراتے رہو مصائب میں
تُم ہو مومن اگر تو غم نہ کرو

○

پرورشِ لوح وقلم

یونس صابر
(پشاور)

گرد چھائی گردشِ حالات کی
کچھ عجب صورت ہے محسوسات کی
اس تناظر میں جو ہم نے بات کی
بن گئی سرخی وہ اخبارات کی
ایک خود مختار زندہ قوم ہیں
آس پھر کیوں رکھیں گے خیرات کی
جو ملا جیسا ملا منظور تھا
کیا شکایت تلخیِ اوقات کی
پڑھ کے جو لکھا عبادت جان کر
کیوں کریں تشہیر اپنی ذات کی
اس قدر تم ہم گئے گذرے نہیں
تھوڑی سی شُدبد ہے غالبیات کی
میرؔ کے ہم بھی طرف داروں میں ہیں
دھوم ہے اُس صاحبِ کُلیات کی
شکریہ شہر کنول[1] میں آپ نے
کی پذیرائی مری خدمات کی
سولہ دروازں کے اندر شہر ہے
گھومتی تاریخ ہے باغات کی
''اے پشاور''[2] نظم ہے ارشاد کی
اک مرصّع آرٹ، محنت ہاتھ کی
فخرِ پاکستان ہے یوسف دلیپ
کر گیا جو ساحری جذبات کی
آئے دن ٹی وی پہ اُس کو دیکھ کر
جاگتے سوتے میں اکثر بات کی

○

۱۔ ڈاکٹر کنول فیروز (صدارتی تمغہ امتیاز برائے ادب)
۲۔ فاضل شاعر، افسانہ نگار ارشاد احمد صدیقی (تمغہ امتیاز)

Dear Yogi.

I hope I am sending to you joy... brightening your day and inspiring you.

I have enclosed a very lengthy dialogue from this mere mortal's attempt to connect amidst very challenging circumstances mostly to express to you my heartfelt sentiments in hopes to create a clearer picture of my life at the moment. I have treasured your correspondence & extension of kindred admiration and friendship, comrades we too are of the path of art and the joys of its expressions & nuances.

Although I have not had the moments to respond to your ended ring letters the way I usually would and desire to.

I have gleaned much solace, comfort & wisdom from their pages. Your poetry is beautiful. I can only imagine how more exquisite it must be untranslated but do know this, its energy is life can be still felt by this poet too.

It is cold here also, very unusually cold! I think of you often and send you blessings & joyful thoughts many times that you may be unaware of. Thank you so much for sharing your beautiful gifts with this one, me... I feel quite honored and most fortunate for this connection between us. Please do send me a copy of the poem to be published. I will cherish it! Enjoy your day. I will write again...quicker this time too!

Rita Phillips

کتابِ زندگی

ریتافلپس(Reta Phillps)کے نام

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

کتاب زندگی اے دوست، تیرے دل پر لکھ آئے
ہمارے پاس کیا باقی ہے، جو تم کو لکھا جائے

جو کچھ تھیں دھڑکنیں دل میں، سب تیرے نام لکھ آئے
اب اس کے بعد کیا تم سے، حساب جاں کیا جائے

بہار عمر رفتہ تیرے دروازرے پہ چھوڑ آئے
مگر یادوں کا بحر بیکراں ، آنکھوں میں بھر لائے

اگر کہتے تو رک جاتے، ہمیں تھی کون سی عجلت
بسر اوقات کی خاطر، تیری صورت اٹھا لائے

نگاہوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے یوں تیری صورت
اب ہم آئینہ دیکھیں، تیری صورت نظر آئے

ملاقاتوں کا ہر منظر، لپٹ کر رہ گیا دل سے
کبھی ہم دل کو سمجھائیں، کبھی دل ہم کو سمجھائے

بجا تم نے کہا، کہ تھا تعاقب میں تمہارا دل
تمہاری انجمن سے ہم پیاسی شام بھر لائے

کسی دم چھیڑ جاتا ہے، خیال یاد جب تشنہ
ان آنکھوں سے دفعتاً لبریز پیمانے چھلک آئے

حاجیو

رؤف خیر
(حیدرآباددکن)

سنگ اسود کو وہاں چومنے چھونے والو
پھر کسی اور کی چوکھٹ کو نہ ہرگز چھونا
تم نے اللہ کے گھر کے جو لگائے پھیرے
اب کسی اور کے گھر کا نہ لگانا پھیرا

اے مصلّے پہ کھڑے لوگو، ذرا یاد رہے
ہاتھ باندھے ہوئے اس طرح ٹھہرنا نہ کہیں
آبِ زم زم کے برابر کوئی پانی ہی نہیں
ندی نالے میں کبھی ڈوب کے مرنا نہ کہیں

سعی مابین صفا مروہ کے کرنے والو
اب کسی اور پہاڑی کا ارادہ نہ کرو
سر گھُٹایا ہے تو پھر سر بھی کٹانا سیکھو
بال۔ بچوں کے کہیں جاکے نکالا نہ کرو

صرف شیطانوں کو کنکر پہ نہ کنکر مارو
اپنے اندر ہے جو شیطان اُسے زیر کرو
دیکھنا خود میں شہادت کا ہے جذبہ کتنا
جانور شوق سے کیا ذبح کیا کرتے ہو

حاضری روضۂ سرکار پہ دینے والو
اب کسی اور کے روضے کی طرف مت جھانکو
دستگیری کوئی کرتا نہیں اللہ کے سوا
آستانوں کی، مزاروں کی نہ مٹی پھانکو

لوٹ آئے ہو جو اللہ کے گھر سے گھر کو
رنگِ تقویٰ میں ذرا رنگ دو گھر کے گھر کو

○

اجنبی

جاوید زیدی
(نیویارک)

اجنبی بنتے ہوئے
دیر کہاں لگتی ہے
اپنے بیگانے میں
بس فرق ہے
اک لمحہ کا
وہ جو اک لمحہ
دبے پاؤں چلا آتا ہے
منزل غم سے یوں ٹکراتا ہے
وادیٔ دل کے مکینوں کی خبر لاتا ہے
ایک سرحد کی نئی
قریۂ جاں میں بنا جاتا ہے
ایک لمحے میں یہاں
حاصل زیست بدل جاتا ہے
موسمِ تقدیر مچل جاتا ہے
کوئی تدبیر رفو گر کی ہوتی ہی نہیں
کوئی امید یہاں بارور ہوتی ہی نہیں
بجھتے جاتے ہیں یوں خوابوں کے چراغ
دشت وحشت میں کہیں روشنی ملتی ہی نہیں
شامِ غم شمع تمنا کوئی جلتی ہی نہیں
گم ہوئے جاتے ہیں منزل کے سراغ
محوِ حیرت ہیں یہاں اہلِ نظر، اہلِ دماغ
خالی لگتے ہیں خیالوں کے ایاغ
زندگی لگتی ہے مانندِ سراب
جو نہیں ہے وہ نظر آتا ہے
پل میں یوں زخمِ سفر بھر جاتا ہے
اجنبی بنتے ہوئے دیر کہاں لگتی ہے
ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے
وہ لمحہ جو دبے پاؤں چلا آتا ہے!

ایک نظم بی بی حوا کے نام

ڈاکٹر پرویز شہریار
(نئی دہلی، بھارت)

تجھ سے بچھڑ کے
اے بی بی حوا
ہم تیرے بچّے
بشری سمندر کے
پے در پے تھپیڑوں سے
دوٗر اور بھی دوٗر ہو گئے ہیں
بھیڑ میں کھو گئے ہیں
تمھارے ہمارے
درمیاں تھا جو حرف شیریں کا قصہ
وہ درد آشنا لمحہ، وہ ممتا سے لبریز رشتہ
اُس رشتے کی ڈور سے بندھے
ہم خلاؤں میں ہچکولے کھا رہے ہیں
پتنگوں کی مانند
ننھے بچّے کے ہاتھوں سے جوں
چھوٹ جائے
غبّاروں کی ڈور
اور بکھر جائیں جیسے
آسماں کی ناپید بلندیوں میں سبھی
ہم بھی،
اُن ہی غبّاروں کی طرح
اے بی بی حوا
تجھ سے بچھڑ کے
بھٹکتے رہے ہیں
ہر لمحہ اِس اُلجھتی بھول بھلیوں سی دُنیا میں
جی رہے ہیں
کسی طور
تیری ممتا کی چاہ میں، آس لگائے
شاید
خُدا کو
ہم پر بھی کبھی ترس آ جائے
اور ...
ناف کے اِس اُلجھے ہوئے رشتے کا سرا
دوبارہ کہیں جا کے پھر تجھ سے مل جائے
شاید
پھر کوئی دُنیا
کن فیکوٗن سے
خلق ہو جائے!
جہاں باغِ بہشت کے مکیں ہوں
اور ہم ہوں
جہاں ابلیس کا نہ ہو گزر
جہاں شیطان کا نہ ڈر ہو
جہاں امن و آشتی ہو تمام!
اے کاش!
اپنا بھی ایسا گھر ہو
شجر ممنوعہ سے پرے

○

شمعِ حیات

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

یادِ ماضی بُھلا نہیں سکتا
یہ متاعِ حیات ہے میری
میرا بچپن میرے سنہرے دن
جیسے خوابوں کی یاد ہے میری
کوئی بیتے دنوں کو لوٹا دے
آرزو ناتمام ہے میری
اُن کو ہم نے پیام بھیجے ہیں
نقش برآب بات ہے میری
ہم سے گویا ہوئے وہ یوں مڑ کر
جیسے بے دام ذات ہے میری
ہم نے اپنی زبان بند کر لی
جانے کیا دل میں بات ہے میری
ذکر اُن کا جب آ گیا لب پر
دل نے جانا وہ جان ہے میری
دل میں جو پھول کِھل گئے ہیں میرے
خوب تر اُن سے رات ہے میری
جان تم پر نثار کر دی ہے
یہی اوقاتِ ذات ہے میری
تیری باتیں وہ پیار کے لمحات
بس یہی کائنات ہے میری
سازِ دل چھیڑ دے میرے ہمدم
تیری چاہت حیات ہے میری
رات کی تیرگی نہ گُل کر دے
یہ جو شمعِ حیات ہے میری

دوہے

کاوش پرتا پگڑھی
(دہلی، بھارت)

بوند بوند کے واسطے، بستی تھی بیتاب
شان خدا کی دیکھیے، اب گھر گھر تالاب

پہنوں گا میں کب تلک، میلا پھٹا لباس
کھل کر بتلاتا نہیں، کوئی دست شناس

گاؤں گاؤں ہر شہر میں، پھیلا کیسا روگ
بھرا پُرا گھر چھوڑ کر، بھاگ رہے ہیں لوگ

ان دونوں میں دوستی، کیسے ہوئی حضور
مور سانپ کا بیر تو، ہے جگ میں مشہور

کرنا کیا ہے اب ہمیں، سوچیں یہ چت چور
ہم دونوں کے پریم کا، چرچا چاروں اور

تیری ضد کو کیا کہیں، کون تجھے سمجھائے
سندر گڑیا چھوڑ کر، بچہ کیسے جائے

بے قابو ہوتی رہیں، بھرتی رہیں اُڑان
جیسے جیسے خواہشیں، ہوتی رہیں جوان

ناری نے سنسار کو، خوب دیا جھکجھور
ناری کس میدان میں، نر سے ہے کمزور

دھرتی سے تھک ہار کر، آ دھمکے آ کاش
کاوش ہم کو عمر بھر، اپنی رہی تلاش

○

نذرِ حضرت سلطان باہو

وِشال کھُلر
(لدھیانہ، بھارت)

میرے دل کی سچّی دارو
پی کر دیکھو اچھّی دارو

''تجھ سنگ پریت لگائی سجنا''
تیری میری پکّی دارو

پی ہے تنہائی میں اکثر
ارمانوں کی کچّی دارو

پھر تو اس نے ہوش نہ پایا
جس نے لب بھر چکھّی دارو

برہا کے سلطان ہوئے ہو
پینا کچّی کچّی دارو

اس نے سکھ دھن پایا کھُلّر
پریت کی جس نے رکھّی دارو

○

کبھی ایسا بھی۔۔۔

شگفتہ نازلی
(لاہور)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔
بہت ہی مضطرب ہو کے۔۔۔
اُٹھائیں ہاتھ۔۔۔
تو احساس یہ تسکین دیتا ہے۔۔۔
کہ وہ سب دیکھتا، سُنتا بھی ہے اور جانتا بھی۔۔۔!

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔
کہ سب کے بیچ ہو کے بھی۔۔۔
دریچہ بیکراں تنہائی کا کھُلتا ہی جاتا ہے۔۔۔
جو سرگوشی میں کہتا ہے۔۔۔
کہ جوں بالکل اکیلے ہیں۔۔۔!

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔
کہ ہر سُو گھپ اندھیرا ہے۔۔۔
سجھائی کچھ نہ دے جیسے۔۔۔
مگر یکدم لگے ایسے۔۔۔
ردائے روشنی جس طرح کہ وہ پھیلتی جاتی۔۔۔!

○

تخلیق کار

شاہد عزیز
(اودھے پور، بھارت)

جو گیت لکھ رہا ہے
جو پھول چن رہا ہے
جو لفظ بُن رہا ہے
وہ مجھ میں ڈھل رہا ہے
یہ رنگ ونور سارے
یہ دشت و آگ سارے
یہ آسمان سارے
یہ زندگی کے دھارے
جو تم کو ڈھونڈتے ہیں
وہ مجھ میں ڈوبتے ہیں
سبزہ کہیں نہیں تھا
خوشبو کہیں نہیں تھی
بے خواب آسماں تھا
بے آب یہ زمیں تھی
میں پہلا آدمی تھا
جو میٹھے پانیوں کا
اک چشمہ ڈھونڈ لایا
میں نے ہی اس جہاں کو
سب کے لیے بنایا
یہ میرے خواب ہی نہیں
جن کی وجہ سے اب تک
یہ زندگی ہماری
بے خوف چل رہی ہے
میرے ہی خون سے تو
یہ آگ جل رہی ہے

○

تہنیتی نظم

حفیظ انجم کریم نگری
(کریم نگر، بھارت)

ہیں مدیر ''چہارسو'' جاوید
خوبصورت ہیں خوبرو جاوید

اک نئی سوچ گفتگو جاوید
فہم و ادراک و جستجو جاوید

مردِ مسلم کی سادگی ان میں
ہیں ادب کی یہ آبرو جاوید

وہ کہانی ہو یا کہ افسانہ!
سب میں بھرتے ہیں رنگ وبُو جاوید

ہیں قلم کے دھنی، نظر اونچی
نرم گفتار نرم خو جاوید

پیچھے کچھ آگے کچھ نہیں کہتے
کھُل کے کرتے ہیں گفتگو جاوید

دل میں رکھتے نہیں ہیں کینہ کپٹ
جو بھی کہتے ہیں روبرو جاوید

خوب پھولے پھلے چمن ان کا
اور چرچے ہوں کو بکو جاوید

ٹھہرے پانی میں گندگی ہوگی!
بہتا پانی ہیں آبجو جاوید

عمر دے اور صحت بھی دے مولا
ہوں جہاں بھر میں سُرخ رو جاوید

ساری دنیا میں دھوم ہے انجم
آج چرچے ہیں کوبکو جاوید

○

مدیر ''چہارسو'' گلزار جاوید کی نذر

منظر نگاری کا ''حاصل''

ڈاکٹر سید تقی عابدی
(کینیڈا)

''حاصل'' منظرؔ بھوپالی کا نواں یا دسواں مجموعہ کلام ہے جو ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آیا۔ یہاں ''حاصل'' کا انتخاب اتفاقی ہے کیونکہ ہماری ذاتی لائبریری میں منظر بھوپالی کے صرف دو مجموعے ''اداس کیوں ہو'' اور ''حاصل'' موجود ہیں۔ اگرچہ منظرؔ بھوپالی کی تیس (۳۰) سالہ شاعرانہ ریاضت کے دوران دس سے زیادہ ان کے کلام کے مجموعے زیر طباعت سے آراستہ ہو کر دربارِ سخن میں دُربار ہوئے مگر اس کے ساتھ ساتھ بازارِ سخن کی زینت بن کر عوام میں مقبول اور مشہور بھی ہوئے۔ منظرؔ کا تخلیقی عمل آج بھی اسی مشق لگن اور توانائی سے جاری وساری ہے۔ موجودہ ہم عصر شاعروں کی شاعری پر تبصرہ اور ریویو کرنے میں ہماری روش پہلے ہر مجموعہ کو اکائی جان کر مطالعہ کرنے کی ہے تاکہ زمان و مکان کے تغیر سے شعری مجموعہ کو جوڑا جائے اور شعریت کے کینوس کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے اور آخیر میں تمام کلیات کو اکائی مان کر نتائج نکالے جائیں جس سے نقدِ سخن کے اصول اور صاحب سخن کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ منظرؔ بھوپالی ایک جواں سال، زود گو، پر گو مشاق فطری شاعر ہیں جو تقریباً ہر سال دو سال میں تخلیق کے نئے نئے باغ سجاتے ہیں اور ہم ''کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک'' کے مصداق ہیں اس لیے فی الحال صرف ''حاصل'' کو سرمایہ سخن بنایا ہے لیکن ہمارا نقد بیان اجمالی ہی سہی پھر بھی تنقید کے تینوں زاویوں کو روشن کرنے کی کوشش کرے گا کہ اس تبصرے سے صاحب تخلیق یعنی شاعر کو کیا منصب حاصل ہوا، صاحب تنقید کو کیا نکتہ حاصل ہوا اور صاحب مطالعہ کو کیا فائدہ حاصل ہوا۔ اس مختصر مجموعہ میں تقریباً پانچ سو (۵۰۰) اشعار ہیں لیکن کلام کے بیشتر نمونے یعنی غزل، قطعہ، مثنوی پابند اور آزاد نظم وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ منظرؔ حقیقت میں غزل کے شاعر ہیں۔ اگرچہ ان کی نظمیں اور گیت بھی جاندار ہیں لیکن ان کی جان اور پہچان بھی تغزل ہے۔ وہ غزل کے تقاضوں کو بڑے سلیقے سے نبھاتے ہیں۔ غالبؔ نے غزل کی تنگ دامنی کا شکوہ کیا جو غالبؔ کے لیے جائز اور زیبا تھا لیکن کسی مغلوب نے اسے اپنی عقل پر تول کر رد کیا۔

غزل اور تنگ دامانی کا شکوہ
سلیقہ ہو تو گنجائش بہت ہے

دراصل سب کچھ سلیقے اور برتنے پر منحصر ہے۔ منظرؔ نے اشعار میں صرف دریا کو کوزے میں بند نہیں بلکہ اس میں تلاطم بھی پیدا کیا ہے:

آنکھوں سے کہو ضبط کی حرمت نہ گنوائیں
موسم کی طرح غم بھی گزر جائے گا اک دن

جینے کا قرینہ ہے یہاں اور ہی منظرؔ
سچ بولتے رہیے گا تو سر جائے گا اک دن

''حاصل'' میں اکثر غزلیات ہیں جو چھوٹی اور طویل بحروں میں نغمگی سے سرشار ہیں۔ غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنگلاخ اور مشکل طویل بحروں میں بھی کامیاب تجربے کرتے ہیں:

ان سوکھتے پیڑوں کو ذرا غور سے دیکھو
کیا صبر ہے بارش کی تمنا بھی نہیں ہے

نہ ہم جھکے ہیں نہ ہم جھکیں گے کسی زمینی خدا کے آگے
چراغ ہم نے تو رکھ دیے ہیں سجا کے ظالم ہوا کے آگے

ابلاغ کا راستہ خود شعر کو قدرتی چشمہ کی طرح بہا رہا ہے۔ یہ لہجہ یہ انداز یہ گفتار اور فکری رفتار اکیسویں صدی کی غزل کی شان اور شناخت ہے اور یہی مابعد جدیدیت شاعری کی پہچان بھی ہے۔

منظرؔ اپنے قاری اور سامع کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر نشیب و فراز، صحراء و گلشن آنسو اور مسکراہٹ، درد اور خوشی کے درمیان لمحوں اور مرحلوں سے گزرتے ہیں۔ یہ عمل اس لیے کامیاب اور اطمینان بخش ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود جذبات اور احساسات میں شعر کی صورت بن جاتے ہیں۔ جو شعر خوانی کی معراج ہے۔ یہاں اس نکتہ کو ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بعض مضمون نگاروں نے منظرؔ کے دل موہ لینے والے ترنم کو اور ان کی شاعری کی شعریت کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر یا ایک ہی جملے کے دو حصے بنا کر یا یوں کہوں کہ ایک سانس میں شعریت اور ترنم کو جوڑ کر پیش کیا ہے جو منظرؔ کے کلام کے ساتھ ناانصافی ہے۔ منظرؔ کا کلام اپنی جگہ ایک توانا معنی آفرینی کا پیکر ہے اس لیے کاغذ پر بھی اپنا سکہ منوا لیتا ہے اور قاری کا دل جیت لیتا ہے۔ ترنم سونے پر سہاگہ کا کام ضرور کرتا ہے لیکن پیتل کو سونا نہیں بناتا۔ خوبرو، خوش گلو اور خوش اخلاق ہونا مشاعروں کی زینت ضرور ہے لیکن شاعری کی قیمت مصرعوں کی معنویت پر ہے اگرچہ وہ کیسے بھی ادا کی جائے۔ تاریخ کے دامن میں غالبؔ کی خواندگی سے فیض کی شعر خوانی اس کے شاہد ہیں۔ منظرؔ کو انسانی قدروں کی تلاش ہے وہ حقوق انسانی کے پاسدار ہیں۔ وہ آدمی کے احترام اور اس کے عالی مقام کے قائل ہیں۔ اقبالؔ کی طرح ان کا ویژن بھی انسان سازی ہے۔ اقبالؔ نے کہا تھا کہ پورے عالم میں بھی انسان سما نہیں سکتا جبکہ ایک انسان میں پورے عالم کو جگہ دی جاسکتی ہے۔

آنکہ در عالم نہ گنجد آدم است
آنکہ در آدم بہ گنجد عالم است

منظرؔ کہتے ہیں:

جہاں میں ایسا کوئی نہیں ہے
ہمارا جیسا کوئی نہیں ہے

بنا ہمارے ہی دم قدم سے
عظیم انسانیت کا عالم
زمیں کو پہنایا تاج ہم نے
بدل دئے سب رواج ہم نے
بنائی تہذیب آدمیت
سمے کا بدلا مزاج ہم نے
زمیں پہ رحمت کی چھاؤں بن کر
ہمیں تو مثلِ شجر کھڑے ہیں

اور اہمیت انسان بتانے کے بعد منظرؔ زوال انسان کی وجہ پوچھتے ہیں:

مگر ہمیں آج کیا ہوا ہے
قدم ہمارا بہک رہا ہے
خود اپنی لاشوں پہ ہم کھڑے ہیں
کیوں سر ہمارا جھکا ہوا ہے

منظرؔ اس نام نہاد ترقی یافتہ دور کی تاریکی کو کس خوبصورت طریقے سے غزل کے شعر میں مکمل طور پر پیش کرتے ہیں:

کچھ اتنا سیہ کار ہے اس دور کا ماحول
روشن کہیں تہذیب کا چہرہ نہیں ملتا
وقار اپنا گراتا ہے آدمی خود ہی
وہ ماں کے پیٹ سے تو محترم نکلتا ہے

موجودہ دور میں صدیوں سے ملی قدروں کی امانت کو اس معاشرے نے کھودیا:

رشتے وفا خلوص بزرگوں کا احترام
اب ان جواہرات کی قیمت نہیں رہی
جب سے حرام رزق کی عادت پڑی ہمیں
گھر میں ہماری پہلی سی برکت نہیں رہی

محبت جو مرکز حیات اور زندگی کی جان ہے جس سے انسان کی آن بان اور پہچان ہے یہ جو لافانی شئے تھی اسے بھی اس ماحول نے فنا کر دیا جو ہماری موجودہ نسل کا سب سے بڑا المیہ ہے:

انسان نے اسے بھی فنا سے ملا دیا
اب لازوال چیز محبت نہیں رہی
بکھراؤ اپنا دیکھ کے سمجھے ہیں آج ہم
دنیا میں کیوں ہماری خلافت نہیں رہی

منظرؔ نے بہت صحیح کہا تھا کہ یہ صدی ہماری ہے یعنی شاعر جو زمان اور مکان سے جڑا رہتا ہے اس میں ہونے والے واقعات سے متاثر ہو کر ان مشاہدات کو تجربے کے رس میں گھول کر اپنے دل کے الاؤ میں پکاتا ہے اور پھر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ اس صدی میں انسان کے خون کی قیمت گر چکی ہے ہر مقام پر انسانی خون کی بارش ہو رہی ہے۔ دہشت گردی، خودکش حملے ظلم و ستم کی شدت سے نظاروں سے ہر آنکھ زخمی ہے۔ ایسے موقع پر وہ شاعر جو ادب کو مقصد کے لیے استعمال کر کے پیامبری کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔

''شاعری ہم وارثِ پیغمبری ست''

منظرؔ نے جو اس صدی کی دہشت گردی کا منظر نامہ کھینچا ہے وہ ایسی کہانی ہے جو دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتی ہے:

علم کی اس صدی میں خدایا جہل کی انتہا ہو گئی ہے
دیکھو انسان ہی آج کل تو ظلم انساں پہ ڈھائے ہوئے ہیں
کیا فلسطین بغدا کا بل ہر جگہ اپنی لاشیں بچھی ہیں
آنکھ میں آنسوؤں کی جھڑی ہے جسم خوں میں نہائے ہوئے ہیں
دھماکے ، گولیاں ، بارود ، لاشیں بے گناہوں کی
ہمارے شہر کے شام و سحر میں کچھ نہیں بدلا
چار اشکوں میں بہیں گے کس طرح صدیوں کے غم
آنکھ کہتی ہے کہ رونے کو سمندر چاہیے
کہاں کا اخلاص کیسی الفت جو نرم جذبے تھے کھو گئے ہیں
یہ وہ صدی ہے کہ جس میں منظر ہر اک نظر تیر بن رہی ہے
اے خدا ہمیں کوئی امن کی صدی دے دے
دہشتوں کے منظر ہیں اس صدی کے دامن میں
یہ جسم و جان تو اللہ کی امانت ہیں
نہ خودکشی کے لیے ان کو آزماؤ تم

منظرؔ بھوپالی کی زبان اردو، ان کا وطن ہندوستان، ان کا مذہب اسلام اور ان کا پیغام انسانیت سب کچھ دہشت گردی کی زد میں ہے جو اس صدی ،اس معاشرے اور اس وقت کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ ایسے حساس موقع پر ایک فطری حساس شاعر خاموش نہیں رہ سکتا وہ اپنے قلم کو تلوار اور علم بنا لیتا ہے اور کبھی اپنے مصرعوں کو زیتون کی شاخ میں تبدیل کر کے پیام پہنچاتا ہے:

اپنے قرآن میں کہہ رہا ہے خدا
کچھ نہیں ربط دہشت سے اسلام کا
امن ہی امن ہے آدمی کے لیے
نور ہی نور ہے تیرگی کے لیے
پیار کا جام ہے یہ سبھی کے لیے
اس نے لکھا ہے انسانیت کا سبق
دیکھو روشن ہے تاریخ کا ہر ورق

آج سے تقریباً ستر (۷۰) سال قبل اردو غزل کے ممتاز شاعر فراقؔ

گورکھپوری نے اپنے شاہکار مقالے "اردو کی عشقیہ شاعری" میں برصغیر کے شاعروں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اگر اپنی شاعری کو ہندوستان کی زمین سے جوڑ دیں اور مصرعوں میں اردو فارسی کے ساتھ ہندی بھاشا کے رسیلے نرم شگفتہ الفاظ بھی پرو دیں تو ان کی شاعری مقبول اور مدتوں زندہ رہے گی۔ بہت سے شاعروں نے اسے فراق کا تہذیبی اور مذہبی میلان اور ہندی سنسکرت کا پرچار سمجھ کر نظر انداز کر دیا جس کا نتیجہ اردو شاعری میں ہمارے سامنے موجود ہے چنانچہ اب ہماری کلاسیک اردو شاعری بے وطن اشجار کی طرح چند باغیچوں میں تزئینی اور نمائشی بن کر خواص تک محدود ہو گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری شاعری میں اردو فارسی عربی الفاظ کے ساتھ صرف خارجی تلمیحات اصطلاحات اور نیل فرات اور جیحون کے ذکر تک ہی محدود کیوں ہو۔ ہندی پنجابی الفاظ مقامی تلمیحات اور گنگا جمنا راوی ستلج اور سندھ کا تذکرہ بھی کیوں نہ ہو؟

منظر کی شاعری کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نکتے سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ وہ ہندی اور مقامی بولیوں کے الفاظ کو اردو سے جوڑ کر ان ہندوستانی الفاظ کی نشست سے مصرعوں کی فصل اُگاتے ہیں جو اردو کی جدید ترین شاعری کا درخشاں چہرہ ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو شاعری اس عمل کے بغیر پنپ نہیں سکتی۔

یہ جیون اک سایہ ہے — جھوٹی ساری مایا ہے
روپ ہو یا دھن دولت ہو — آتی جاتی چھایا ہے
کیوں ان پر مغرور رہیں — یہ دیپک بجھ جاتے ہیں
دھرم یہ سب سے بڑھ کر ہے — کرم یہ سب سے برتر ہے
انسانوں سے پیار کریں — نفرت تو اک خنجر ہے
اس خنجر سے کھیلنے والے — راون ہی کہلاتے ہیں

ہندی قافیے دیکھئے:

آج کی دنیا میں بھی سچائیوں کے ساتھ ہو
یار منظر تم کو جینے کی کلا کب آئے گی
امن و ماں کو آگ لگاتا ہے ایک شبد
اچھا یہی ہے چوٹ نہ کر آستھاؤں پر

منظر اردو کے معمولی الفاظ کے کاندھوں پر آسمانوں کا بار رکھ دیتے ہیں۔ اس ہنر کا راز انہیں بات برتنے کے اعجاز اور اختصار سے حاصل ہوا ہے اسی وجہ سے کئی اشعار سہل ممتنع کی عمدہ مثال قرار دیے جاسکتے ہیں۔

وقار اپنا گراتا ہے آدمی خود ہی
وہ ماں کے پیٹ سے تو محترم نکلتا ہے

منظر بھوپالی کی شاعری اپنی زمین سے جڑی ہوئی ہے اور ان کے اشعار سے ان کے دور کا رنگ جھلکتا ہے جسے برصغیر کی معنی آفرینی اور بقول غالب دہلوی "سومنات خیالی" کہہ سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہماری شاعری میں اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی وغیرہ کی ہیئت یا شکل وصورت عرب اور ایران سے آئی لیکن جہاں تک معانی اور مطالب کا معاملہ تھا ہم نے اپنی زمین ہی سے کشید کر کے عوام اور خواص کو مست کیا یعنی ہم نے خارجی ساغروں میں دیسی شراب سے نشہ کو دو آتشہ کیا۔ اگر چہ سومنات خیالی کی ترکیب اور اصطلاح پہلی بار غالب نے بطور استعارہ استعمال کی لیکن راقم کی تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دیرینہ روایت خسرو سے منظر تک اردو شاعری میں کہیں عیاں کہیں نہاں رواں دواں ہے۔

غالب نے کہا تھا:

مسنج شوکت عرفی کہ بود شیرازی — مشو اسیر زلالی کہ بود خوانصاری
بہ سومنات خیالم درآی تا بینی — روان فرو بر دوشھای زناری

یعنی عرفی کے شیرازی ہونے سے مرعوب ہو کر اس کے کلام کا تعین نہ کر۔ زلالی چونکہ خوانصاری ایرانی تھے اس لیے ان کے کلام کی عظمت کے گن مت گاؤ۔ تم میرے سومناتی خیال کی دنیا میں سیر کرو جہاں میرے زناری کاندھوں پر روح افزا سرِ تخیل کی آماجگاہ ہے۔

منظر کہتے ہیں:

اذانیں ہیں بھجن ہیں عید ہے ہولی ہے راکھی ہے
مرے رنگوں بھرے بھارت تیری انگنائی اچھی ہے
پھر اُس نے وفاؤں کی سند مجھ سے طلب کی
پھر آ گیا اک آگ کا دریا مرے آگے
دیکھ کر آپ کے چہرے پہ اداسی کا دھواں
یاد ہم میر کا دیوان کیا کرتے ہیں

منظر کے کلام میں قنوطیت نہیں رجائیت ہے، حسرت زندگی نہیں بلکہ عزم تعمیر زندگی ہے وہ ماحول کی بدحالی کے نگران تو ہیں لیکن ان افراد کی نقاب کشی اور نشان دہی کرتے ہوئے جنہوں نے ریاکارانہ جارحیت سے خون کی ہولی کھیلی ہے وہ مقابلے پر داؤ اور دعا کے ساتھ موجود ہیں جو ان کا خاص اسلوب ہے:

قاتل کی حمایت میں ہیں خود اہل حکومت
انصاف کا انجام نظر آنے لگا ہے
پوشاک پہ ہیں جن کی مرے خون کے دھبے
آئے ہیں وہی بن کے مسیحا مرے آگے
یہاں گناہ ہوا کے چھپائے جاتے ہیں
چراغ خود نہیں بجھتے بجھائے جاتے ہیں
قانون کی پوشاک میں رہتا ہے وہ مستور
مجرم بھی ہے اور شہر میں رسوا بھی نہیں ہے

ظلم وتشدد سے مقابلہ صبر اور دعا کا انداز دیکھئے:

دامن پہ ترے داغ ابھر آئے ہیں خود ہی
اب رنگ ہمارا بھی لہو لانے لگا ہے
بددعاؤں نفرتوں کا شور ہے چاروں طرف

پھول بن کر اپنے ہونٹوں پر دعا کب آئے گی
آندھیاں مٹ جائیں ایسی جو بجھاتی ہیں چراغ
ہو چراغوں کی محافظ وہ ہوا باقی رہے
سپردگی کو ہماری شکست مت سمجھو
جو تم نے جیتا ہے وہ دل ہم نے ہارا ہے

عربی اور فارسی شاعری میں واقعہ کربلا اور اس کے جزئیات اس طرح سے استعارہ بن سکے جس طرح اردو شاعری میں ہوا۔ صدیوں سے حق و باطل، ظالم و مظلوم پائے عالی حقوق انسانی، جبر و تشدد، آزادی حریت وغیرہ کی نگارش ایک آدھ کربلا کے لفظ سے تکمیل کو پہنچتی ہے۔ میرؔ ہوں کہ غالبؔ، اقبالؔ ہوں کہ جوشؔ سب شاعروں نے اسے محراب شاعری میں سجایا ہے جس کا مفصل بیان پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی عمدہ کتاب ''کربلا بطور استعارہ'' مثالوں سے واضح کیا ہے۔ منظرؔ بھوپالی نے بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ مطالب کو فلک بوس کیا ہے۔ جب منظرؔ کربلا سے مربوط استعارہ استعمال کرتے ہیں تو اس کی تاثیر اور حرارت کو پڑھنے اور سننے والا محسوس کر سکتا ہے یہ عمل صرف ترسیلی کامیابی کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ معانی شاعرانہ کی دین ہوتا ہے جو فطری شاعر کے ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ کچھ اشعار بطور نمونہ ہماری گفتگو کے ثبوت میں بغیر کسی تشریح اور توضیح کے پیش کیے جا رہے ہیں:

ہماری جیب سے جب بھی قلم نکلتا ہے
سیاہ شب کے یزیدوں کا دم نکلتا ہے
کیا ہے ثابت یہ کربلا نے کہ مومنوں کو
سوا خدا کے جھکانے والا کوئی نہیں ہے
نرغے میں یزیدوں کے کھڑا ہوں میں اکیلا
ہمراہ مرے اب مرا سایا بھی نہیں ہے
ہر طرف گھیر رکھا ہے یزیدوں نے ہمیں
آج پھر اس قوم کو عزم بہتر (۲) چاہیے
تاریخ نے کربل میں اُسے دیکھا ہے منظر
پیاسا بھی وہی شخص ہے دریا بھی وہی ہے
رکھتے ہو کسی شمر سے کیوں رحم کی امید
صحرا میں فقط ریت ہے دریا نہیں ملتا
نبی نے جنگ بھی انسانیت سے جیتی ہے
یزیدیت کے فسانے کو مت بڑھاؤ تم
شہید ہو کے سبق دے گئے حسین ہمیں
جوخوں بہانا ہے حق کے لیے بہاؤ تم

تاج محل کی خوبصورتی، شاہ جہاں کی فراخ دلی اور سلطان و ملکہ کی عاشقی پر درجنوں اشعار اردو شاعری میں نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی طنزیہ اور مزاحیہ شعر بھی سنائی دیتے ہیں لیکن اس شاہکار عمارت کے معمار کی ان کہی کہانی دو مصرعوں میں منظرؔ کی زبان سکّہ کے دونوں رخوں کی عکاسی کرتی ہے۔ شیشے کے گلاس میں آدھے بھرے پانی کو سب دیکھتے ہیں لیکن آدھے خالی گلاس پر توجہ صرف چشم بینا ہی کر سکتی ہے۔ یہ شعر سہل ممتنع کی مثال ہونے کے ساتھ ساتھ صنعت ابداع میں شمار کیا جاتا ہے یہاں شاعر نے قطرے میں دجلہ صرف دیکھا نہیں بلکہ دکھایا بھی ہے۔ سلیس اور سادے الفاظ میں تاریخ کے دفتر کو بند کرنا منظرؔ بھوپالی جیسے کہنہ مشق عمدہ شاعر کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ شعر سنیے اور سر دھنیے:

بنا یئے نہ کسی کے لیے بھی تاج محل
ہنر دکھایا تو دست ہنر بھی جائے گا

یہ شعر زبان زدعام ہونے کے ساتھ ساتھ محاورے مقولے اور ضرب المثل کے طور مستعمل ہے۔

برصغیر میں شادی کے موقع پر لڑکیوں کے جہیز کا مسئلہ تمام اخلاقی حدوں کو پار کر گیا ہے۔ منظرؔ کی کئی نظمیں اور کئی غزلوں کے اشعار اس سماج کی لعنت پر لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں ہم اس موقع پر صرف ایک دو شعروں پر اکتفا کرتے ہیں:

عمر بھر جو کچھ کمایا بھوک نے سب کھا لیا
اب بدائی کے لیے بیٹی کو زیور چاہیے
یوں اس کے گناہوں کی سزا مل گئی اس کو
بیٹی کے لیے اب کوئی رشتہ نہیں ملتا

عزتِ نفس کی تاکید اور ضرورت انسانیت کی ضمانت سمجھی جاتی ہے اور یہ جواہرات بڑے فطری شاعروں کے کلام کی شناخت بھی ہوتے ہیں۔ منظرؔ اس دور کے ان چند گنے چنے شاعروں میں ہیں جنہوں نے انمول اور ان مٹ نشان چھوڑے ہیں۔ مضمون کی طوالت تشریح و تفسیر کی مانع ہے اس لیے صرف چند اشعار ذہن کی جلا کے لیے یہاں سجا رہے ہیں:

بلندیوں پہ پہنچنے کو سہل مت سمجھو
بلندیوں پہ پہنچ کر سنبھلنا پڑتا ہے
اس دنیا کو ٹھوکر میں جو رکھتا ہے
یہ دنیا تو اس کے قابو آتی ہے
جب تلک تسبیح تھے دنیا تھی اپنے زیر پا
ٹوٹ کر تسبیح سے اب دانے دانے ہو گئے

شعر میں حسن تخلص دیکھئے:

دیکھ کر جس کو ابھی تک آئینے حیران ہیں
لامکاں کو پھر وہ صورت پھر وہ منظر چاہیے

حسین خوابوں کا گھر نہیں ہے عمل کا میدان ہے یہ دنیا
جو وقت کے ساتھ چل رہے ہیں انہیں کی تقدیر بن رہی ہے

دل اپنے ہی خالی ہوئے اخلاص و یقیں سے
اللہ بھی قرآن بھی کعبہ بھی وہی ہے

باقی صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

اوراقِ رخشندہ

سید وارث شیر (کینیڈا)

انگریزی سے ترجمہ:

آمنہ علی (اسلام آباد)

(جناب وارث شیر نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یونیورسٹی آف لندن اور نیٹل ہوشول، Technische Hochschule, Aachen جرمنی سے حاصل کی۔ وہ حساب، بین الاقوامی امور اور تعلیمی مستقبل: پوسٹ سیکنڈری ادارے کے پراسپیکٹس کی آٹھ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے کئی سال یونیورسٹی آف منی ٹوبا، کینیڈا اور ریڈرور کالج، کینیڈا میں حساب کا مضمون پڑھایا۔ بین الاقوامی امور کے تنقیدی مسائل پر اُن کا کام دنیا بھر میں شائع ہوا۔ انہیں اُبھرتا ہوا بین الاقوامی نظام، سیکورٹی اور مشرقی، مغربی تعلقات کے امکانات اور تعلیم کے لیے حکمتِ عملی بنانے کے مسائل میں دلچسپی ہے۔)

اس عظیم ادارے میں میری چار سال کی پڑھائی نے ایسی یادیں اور جذبات پیدا کیے ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مجھے ایک دیرپا تاثر چھوڑے جانے کی چاہت کا جذبہ دیتی ہے۔ ایک میراث جو یونیورسٹی کے اپنے متمدن اور طبع کے مساوی۔ ایسی گہری اور گھری ہوئی یہ ایک شخص کو اپنا مستقبل خود تراشنے کا تاکیدی جذبہ دیتی ہے مگر صرف تشبیہاتی طور پر۔ دنیا کے اس مشہور ادارے کی بنیاد ایک عظیم مسلمان سماجی مصلح سرسیّد احمد خان نے رکھی تھی۔ انہوں نے اس عظیم علمی ادارے کا نمونہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی طرح کا رکھا۔ یہ وہی آدمی تھے جنہوں نے جدید تعلیم کی ضرورت محسوس کی اور ۱۸۵۷ء میں ایک سکول کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بنا اور آخر کار ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گئی۔ ان کی پہلی منزل ایک ایسا کالج تعمیر کرنا تھا جو انگریزی تعلیمی نظام کے ہم آہنگ ہو مگر اسلامی اقدار سے سمجھوتہ کیے بغیر اور ساتھ ہی ساتھ بھارت کے عام لوگوں کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ بہت سارے نمایاں رہنما اردو کے مصنف اور برصغیر کے علماء نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویٹ کیا ہے۔ جب میں اس ادارے میں تھا تو ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ انہوں نے دسمبر ۱۹۴۸ء سے ۱۵ ستمبر ۱۹۵۶ء تک پانچویں وائس چانسلر کے طور پر اس ادارے کی خدمت کی۔ وہ ۱۹۶۷ء میں بھارت کے تیسرے صدر مملکت بنے اور ''بھارت رتنہ'' کے فاتح بھی، جو کہ ملک کا سب سے بڑا غیر فوجی اعزاز ہے۔

وہ بہت بڑے ماہرِ تعلیم تھے اور انہوں نے تعلیمی نظام کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جبکہ کالج میں انہوں نے پلاٹو کی ''ریپبلک'' کا ترجمہ کیا۔ (''ریپبلک'' پلاٹو کے پختگی کے سالوں کی سوچ اور انداز کی بہترین پیداوار ہے اور اس میں عملاً پلاٹو کی مکمل فلسفی دنیا ہے)۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۳۷ء میں وارد ھا میں ہونے والی مہاتما گاندھی کی بلائی ہوئی تعلیمی مجلسِ مشاورت میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوئے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی کی پیشہ ور تعلیم کے تصور کی پرزور حمایت کی اور انہیں نئے تعلیمی نظام کے نصاب کا مسودہ تیار کرنے کا کام سونپا گیا۔ بعد میں انہیں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، یونیورسٹی کارنٹس کمیشن، ورلڈ یونیورسٹی سروس، یونیسکو اور دیگر کئی بڑے تعلیمی محکموں کی خدمت سرانجام دینے کے لیے کہا گیا۔ ملک کے دانشوروں کے درمیان اُنکا رتبہ غیر متنازع ہو گیا۔ جرمنی میں اُن کے تین سالہ قیام کے دوران انہوں نے یورپین فنون ادب اور موسیقی سے لگاؤ حاصل کیا۔ انہیں یونیورسٹی آف برلن سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ سے نوازا گیا۔ یہ اُن کا تجربہ اور ساتھ ہی تعلیم کے فلسفے کا گہرا مطالعہ تھا جس کی وجہ سے انہیں بنیادی قومی تعلیم کے منصوبے کی ذمہ داری دی گئی جو کہ ۱۹۳۸ء میں جاری ہوئی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین تہذیب اور شائستگی کا شاندار مجسمہ تھے۔ اُن میں برتری کا شاندار جذبہ تھا۔ ان کے مختلف مشغلے اور شوق، اُن کا غیر مستعمل چیزوں کا انتخاب، اُن کی رنگ آمیزیاں اور کیلیگرافی کے نمونے، چیزوں کی طرف بڑھنے کا تجسس اور سب سے بڑھ کر مطالعہ اور تحقیق کے لیے اُن کا قیمتی کتب خانہ اُن کی ہمہ گیر شخصیت کا ثبوت ہیں۔ وہ میرے والد صاحب اور عجائب گھر کے نگران سید

احسن بشیر جو کہ ایک علی علیگ تھے کے ذاتی اور قدر دان دوست تھے۔ دونوں میں مشترکہ اتحاد کی تکمیل ہوئی اور وہ باقاعدگی سے مشترکہ دلچسپی کے اُمور کو نئی بحث اور زاویہ نگاہ دیتے تھے۔ اُن کی رہنمائی سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی عالمی یونیورسٹی بنی جس نے اندرون ملک اور بیرون ملک سے علما کو لیا۔ اُن کے وائس چانسلر ہونے کے دوران لیبارٹری، کتب خانے، جماعتوں اور کسرت جیسی سہولیات کو پھیلایا گیا۔ یقیناً ڈاکٹر ذاکر حسین نہ صرف تعلیمی اصلاحات بلکہ ترقی پسند تحریک کے مقاصد کے لیے بھی ایک دلیر سپاہی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ایک ایسی مشہور شخصیت تھے جن کی رائے مختلف عالمی مسائل پر لی جاتی اور اُس کا احترام کیا جاتا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آپ کو کوئی ایک چیز نہیں سکھاتی اس عظیم ادارے میں آپ سیکھنے کے لیے پڑھتے ہیں اور جو کچھ آپ نے کرنے کا ارادہ کیا ہے اُسے اچھی طرح نبھا سکتے ہیں۔

عظیم مسرت کے ساتھ اب میں بہار اور دنیا بھر کے پڑھنے والوں کو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور اُس کے بانی کے بارے میں بتانا چاہوں گا جس کا اندراج میرے مشہور والد صاحب نے کیا تھا۔ یونیورسٹی آف لندن کے اورینٹل سکول میں پڑھائی مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں وہ بھارت واپس آئے تو میرے والد صاحب نے پٹنہ عجائب گھر کے نگران کے طور پر کام کیا اور بعد میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے سیکرٹری بن گئے۔ حالانکہ میں سائنس کا طالب علم ہوں لیکن مجھے تاریخ میں بھی گہری دلچسپی ہے۔ مجھے اپنے والد صاحب کی آپ بیتیوں کو جاننے کا نمایاں اور امتیازی موقع ملا اور یہ کرنے سے مجھے دنیا کی مشہور، منفرد اور غیر معمولی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور اُس کے بانی کی ایک جھلک دیکھنے کو ملی۔

خدا بخش ۲/اگست ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد صاحب کی رہنمائی میں پلے بڑھے جنہوں نے اپنی زندگی انسانیت کی بہتری کے لیے وقف کر دی۔ اُن کے والد صاحب کی وفات سے پہلے انہوں نے اپنے بیٹے کو ایک پبلک لائبریری کھولنے کی ہدایت دی۔ اس طرح خدا بخش کا کتابوں سے لگاؤ اور پبلک سروس کے لیے خود کو وقف کرنے کا جذبہ اپنے والد سے ورثے میں ملا۔ انہوں نے ایک پبلک لائبریری کا قیام اپنے والد کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ انہوں نے گاہے گاہے ملنے والی کتب اور مسودے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۸۹۱ء میں قائم ہوئی۔

یہ لائبریری عربی اور فارسی کے نادر مسودوں، خوبصورت رنگ آمیزیوں اور متعدد تعداد کی نادر کتب کی وجہ سے مشہور ہے۔ جہانگیر نامہ، شاہ نامہ، قرآن، تاریخ خاندان تیموریہ، کتاب الحشائش اور المانی التصوف، ایسی قیمتی ذخیرے کے نادر مسوّدے ہیں۔ مغل بادشاہوں، ہمایوں اور جہانگیر کے ذاتی مجموعوں کے مسودہ دیوانِ حافظ بھی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ کتاالحشائش گریک کی طب کی اصل لغت کا دوہرایا ہوا عربی ترجمہ ہے جس میں شفا بخش پودوں کی خصوصیات درج ہیں۔ کتاب التعریف کا مسوّدہ فن جراحی کے متعدد طریقے اور اوزار نہایت عمدہ طریقے سے بہت تفصیل میں بیان کرتا ہے اور یہ عربی زبان میں مغربی حروف سے لکھا گیا ہے۔

کچھ شاذ و نادر مجموعے بھی انور کھے ہیں جیسا کہ ایک انچ چوڑا قرآن مجید۔ اس کتب خانے میں عربی اور فارسی کے مسوّدوں کا ۱۸۰۰۰ (اٹھارہ ہزار) سے زائد کا نہایت بڑا ذخیرہ ہے اور مغل اور راجپوت کے دور کی ۲۰۰۰ (دو ہزار) سے زائد کی نادر ملنے والی رنگ آمیزیاں بھی موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ ۲۱۰۰۰ (اکیس ہزار) سے زائد غیر معمولی مسودوں کے ذخیرے کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ انتہائی شاذ و نادر پائے جانے والی اور بہت مثالی مسودوں جو کہ عربی، پالی، پشتو، فارسی، سنسکرت، ترکی اور اردو زبان میں ہیں اور مغل، ایرانی، وسطی ایشیائی اور راجپوت کی رنگ آمیزیوں کی وجہ سے بھی مشہور ہیں۔ یہ اسلامیات، بھارتی تاریخ، مغرب، جنوب اور وسطی ایشیائی تعلیم، مغل فن تعمیر، اسلامک سائنس اور مغل، ایرانی، وسطی ایشیائی اور راجپوت رنگ آمیزوں کے علماء کے لیے تحقیق کا مرکز بن گیا ہے۔ یہ کتب خانہ اسلامیات، طب (یونانی دوا)، تذکیرہ (سوانح حیات)، تصوف (اسلامک مسٹزم)، متناسب مذاہب، زمانہ وسطی کی تاریخ، جنوب مشرقی ایشیائی تاریخ، مغربی ایشیائی تاریخ، وسطی ایشیائی تاریخ، زمانہ وسطیٰ کی سائنس، تحریک آزادی کا ادب اور قومی وحدت، اردو فارسی اور عربی ادب کا خاص ہے۔ یقیناً خدا بخش اورینٹل لائبریری دنیا میں اپنی طرح کی ایک ہی لائبریری ہے۔ وی۔ سی سکاٹ اوکونر جو کہ ایڈنبرگ، انگلینڈ کے اورینٹلسٹ ہیں نے رائے زنی کی کہ ''پٹنہ اورینٹل پبلک لائبریری دنیا میں مسلم ادب کا عمدہ ذخیرہ ہے''۔

خدا بخش نے اپنے اس قیمتی ذخیرے کو بنانے کے لیے بہت سالوں تک کڑی محنت کی اور نادر پائی جانے والی کتب اور مسودوں کے لیے اچھی قیمتیں ادا کیں، ایک مرتبہ برطانوی عجائب گھر نے اُن کے اس ذخیرے کے لیے عمدہ پیشکش دی لیکن انہوں نے رد کر دی۔ انہوں نے اوکونر سے کہا ''میں ایک غریب آدمی ہوں اور جو پیشکش انہوں نے مجھے کی اور وہ ایک شاہانہ قیمت تھی لیکن کیا میں پیسے کے لیے اپنی اور اپنے آباؤ اجداد کی قربانیوں سے الگ ہو جاؤں؟'' اور جیسا ہی انہوں نے یہ کہا، ان کے ناک نقشے نے ایک ہی واضح جذبہ ظاہر کیا اور اُن کی بڑی بڑی چمکدار آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ''نہیں'' انہوں نے کہا: ''یہ ذخیرہ پٹنہ کے لیے ہے اور یہ تحفہ پٹنہ کے لوگوں کے قدموں میں رکھا جائے گا''

واقعی ہم خوش قسمت ہیں کہ انوکھے مجموعوں والی دنیا کی مشہور لائبریری/کتب خانہ پٹنہ میں موجود ہے۔

خوشونت کی کالم نویسی اور نشاطیہ کلچر

زبیر رضوی (دہلی، بھارت)

خوشونت سنگھ پورے سو برس کی زندگی جی لیتے تو اُن کی ہفت رنگ سوانح کا آخری ورق اور بھی دلچسپ ہو جاتا۔ ننانوے برس کی کہانی سناتے ہوئے راوی کا خاموش ہو جانا اور آخری سین کے ادھورے بیانیے پر اچانک پردے کا گر جانا، صرف ایک برس کی زندگی مانگنے والے دستِ دعا کا عرش سے محروم ہو کے لوٹ آنا اس رازِ سربستہ کا انکشاف تھا کہ زمین کی چاروں سمتوں کے آفاق تو انسانی زندگی کے نام لکھ دیے گئے تھے لیکن موت کے بعد کی خلوتوں کا جلال و جمال مشیت نے اپنے ہی اختیار میں رکھا تھا۔ خوشونت سنگھ اس ''جہانِ معلوم'' کے سارے گُل بوٹے اپنے دامن میں سجاتے رہے تھے۔ انہوں نے ''جہانِ نامعلوم'' کو اپنی تیسری آنکھ سے دیکھنے کی کوشش بھی کی وہ اس طرح کہ اپنا ''وفاتیہ'' بھی لکھا اور ''موت میری دہلیز پر'' والی تحریر بھی لکھ ڈالی مگر وہ زندگی کے نعمت کدوں اور راحت کدوں میں اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے آئینہ بردار بنے رہے تھے انہوں نے دانستہ اپنی اُفتادِ طبع اور طرزِ حیات کو ایک دہریے اور ناستک کا نام دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک بے حد خدا پرست اور رسم و رواج پرستی سے کاربند معاشرے کے پروردہ ہیں یہاں عقیدہ، لوگوں کی پیشانیوں پر بندیا اور سجدہ بن کر دمکتا، چمکتا رہتا ہے گھر اور گھر سے باہر، مندر، مسجد اور گوردوارے اپنے ماننے والوں کو آوازیں دیتے رہتے ہیں۔ ''دہریت'' اور ''ناستک'' ہونے کا اعلان دراصل ایک ایسی محفوظ پناہ گاہ ہے جس کی کنجی خود آپ کی جیب میں پڑی رہتی ہے۔ خوشونت سنگھ نے اَن گنت مکھوٹے پہنے، کئی طرح کی زندگی جی، کبھی ایک مشغلہ اپنایا تو کبھی دوسرا، کبھی ٹینس اور بیڈمنٹن کے چھوٹے Space میں بلے بازی کرتے رہے اور کبھی عالمی نقشے پر نظر ڈال کر اپنی پسند کے ساحلوں اور بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے رہے خوش حال اور باعزت خاندان میں پلے بڑھے جس معاشرے کے روز و شب کی رونقیں اُن کے حصے میں آئیں وہ نسبتاً کشادہ دل، خوش پوش اور نشاطیہ کلچر کا دلدادہ تھا۔ خوشونت سنگھ نے جن گلیاروں سے گزر کر زندگی کے کشادہ میدانوں میں آ کر سانس لینے اور زندگی کو سیاست، ثقافت اور تخلیقی فنون سے ہم آہنگ کر کے اپنی زندگی کے خالی Space کو جن رنگوں سے سجانے اور سنوارنے کی کوشش کی اُن میں شراب اور شاہد رعنا کے تصور کو شہ نشینی ملی۔

خوشونت سنگھ نے اپنے دہیرے پن، میخواری، حسن پرستی، رعنائیوں سے ہم کلامی اور ہم آغوشی کے لیے اپنے صحافتی پیشے کو پہلے تو بے حد دل کش اور مرکزِ توجہ بنایا اور پھر اس کی مقبولیت کی فضا سازی کے لیے اس میں نسائی حسن اور اس کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ میخواری کی چاشنی بھی چھڑک دی۔ خوبصورت جوڑوں کے ساتھ شامیں گزارنے کی جلوہ سامانیوں کو بھی رواج دیا ''کسولی'' میں جو اُن کا گرمائی مستقر تھا وہ حسن پرور منظروں سے ہر شام سنور اٹھتا تھا کہا جاتا ہے کہ عرب کے ایّام جاہلیت میں، امرؤالقیس کی شاعری کا گھر گھر چرچا تھا وہ اور اس کی شاعری بے حد پسند کی جاتی تھی یہاں تک کہ ماں اپنی جوان اور شادی کے لائق لڑکیوں کے رشتوں کی فضا سازی کی درخواست لے کر امرؤالقیس کے پاس جاتی اور اسے اپنی لڑکی دکھا کر اس پر توصیفی نظم لکھنے کی فرمائش کرتی۔ خوشونت سنگھ کے کالم ہمارے ہندوستانی معاشرے میں اسی طرح کی مقبولیت کے حامل تھے میں ایسے اَن گنت ناموں اور دوستوں سے واقف ہوں جن کے لیے خوشونت سنگھ نے اپنے سنڈیکیٹ کالم کو گلیمر بھی دیا اور اسے فیشن کلچر کی طرح مقبول بنایا۔ خوشونت کے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا۔ انہیں کہانی لکھنے اور سنانے کا فن آتا تھا وہ جب جب کسی مرد یا عورت کو اپنے کالم میں محوری کردار بناتے تو ایسے دلچسپ انداز میں کردار سازی کرتے کہ وہ کردار کالم پڑھنے والے قارئین کے حافظوں میں دیر تک روشن رہتا۔ خوشونت سنگھ کو کالم نویسی میں اپنی عمر کے شاداب دنوں کے رائیگاں جانے کا شدید احساس تھا کیونکہ افسانہ نگاری ان کی پہلی پسند اور اُن کی آنکھوں کا پہلا خواب تھا۔ ان کی افسانہ نگاری کا یہ وہ ابتدائی زمانہ تھا جب میری اُن سے پہلی ملاقات ترقی پسندوں کے مقبول اور محبوب رسالے ''شاہراہ'' کے دفتر میں ہوئی تھی۔ پرکاش پنڈت ''شاہراہ'' کے مدیر تھے۔ پاکستان سے ہجرت کر کے اردو ادیبوں کا ایک بڑا گروپ دلّی آ کر بس چکا تھا، ان کے لیے دلّی، لاہور جیسا ہی ادب پرور شہر بے مثال تھا۔ خوشونت اردو افسانے پر اور اردو میں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے اکثر نظر آ جاتے وہ ان دنوں بھی اپنی صحافیانہ اور خلاّقانہ ذہانتوں کی بنا پر خاصے معروف تھے۔ سجان سنگھ پارک ان کی قیام گاہ تھا اور تب ان کے دروازے پر بلا وقت مقرر کیے Bell نہ بجانے کی سختی آویزاں نہیں تھی لیکن بعد کے دنوں میں انہوں نے خود کو منظم کر لیا تھا اُن کے کاموں اور سرگرمیوں میں ترتیب آ چکی تھی وہ فون خود اٹھاتے تھے اس لیے ان سے کام کی اور مطلب کی بات کرنے میں سہولت میسر تھی۔ وہ صحیح کاز کی حمایت کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے اور بلا کسی تامّل اور جھجک کے اُس بات کی تائید کرتے تھے جو انہیں پسند ہوتی اُن سے

اُس بیان پر اُن کے اور نکھل چکرورتی اور گلدیپ نیّر کے دستخط حاصل کرنے کی ڈیوٹی میری لگائی گئی جب ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل کی پوسٹ کے لیے L.A.S آفیسر کا تقرر کرنے کے بجائے ایک مستحق براڈ کاسٹر کا تقرر کرنے کے لیے ہم پروگرام والوں نے میڈیا میں مہم چلا رکھی تھی۔ خوشونت سنگھ نے نہ صرف یہ کہ آمادگی کے ساتھ ہماری اپیل پر سب سے پہلے دستخط کیے بلکہ متعلقہ وزیر سے میرے سامنے زوردار لفظوں میں ہمارے کاز کی حمایت بھی کی۔

خوشونت سنگھ کی مقبولیت اور اُن کی جمہوریت پسندی والے امیج کو اُس وقت ٹھیس لگی جب انہوں نے مسز اندرا گاندھی کے ملک پر ایمرجنسی لگانے کی پرزور حمایت کی اور پدم بھوشن کا خطاب بھی قبول کیا۔ انہوں نے گولڈن ٹمپل پر بلو اسٹار نامی کارروائی کے خلاف احتجاجاً لوٹا دیا۔ وہ سلمان رُشدی کو ہندوستانی انگریزی ادب کا صفِ اوّل کا ناول نگار مانتے تھے لیکن جب ان سے پینگوئن نے اس کے ناول ''شیطانی آیات'' پر رائے مانگی تو خوشونت نے ناول نہ شائع کرنے کی رائے دیتے ہوئے یہ انتباہ دیا کہ اس ناول کی اشاعت سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے مگر ''انڈیا ٹوڈے'' نے اس ناول کے کچھ حصے چھاپ دیے تو ناول کے خلاف احتجاج کی آگ بھڑک اٹھی، رُشدی نے اس سب کے لیے خوشونت کو ذمے دار ٹھہرا دیا۔

خوشونت سنگھ کا ایک پڑاؤ آل انڈیا ریڈیو بھی رہا تھا۔ اُن کے ساتھ مراسم میں یہ بھی ایک حوالہ اور کڑی بنا رہا۔ یہ نومبر ۱۹۹۰ء کی بات ہے جب چھہتر سالہ خوشونت سنگھ اپنی سجان سنگھ پارک والی رہائش گاہ پر میرے ریڈیو مائیک کے روبرو باتیں کرنے اور میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے آ بیٹھے تھے۔ یہاں اُس انٹرویو کو دہرانے کا موقع نہیں لیکن اس انٹرویو میں پوچھے گئے بیشتر سوالوں کے جواب میں انہوں نے عادتاً سچ بولنے کو ترجیح دی۔ جب میں نے شکایت کے لہجے میں کہا کہ آپ نے پاکستانی ڈپلومیٹ جو اردو کے ممتاز افسانہ نگار بھی تھے جن کا نام منیر احمد شیخ تھا، آپ نے یہ لکھا کہ آپ کے اور ان کے درمیان اردو، شراب اور حسین عورتیں وجہِ دوستی تھیں تو خوشونت کا جواب تھا ''میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کسی کے بارے میں حلفِ رازداری اُٹھایا ہو، میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ہوتا ہے جو میرے علاوہ کچھ اور لوگوں کے علم میں بھی ہوتا ہے، میں ممنوعات (Taboos) کا قائل نہیں ہوں اور جو خوبیاں میں نے منیر کی ذات سے منسوب کی ہیں وہ بُری ہیں؟'' اس آخری جملے پر میں بھی قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔

خوشونت نے بچوں کے ممتاز شاعر شفیع الدین نیّر سے اردو پڑھی اور ان کی رہنمائی میں اُس پر عبور حاصل کیا تھا۔ وہ برملا کہتے تھے کہ اردو ان کی مادری زبان جیسی ہے۔ انہوں نے اپنا مشہور ناول ''دلّی'' پچیس برسوں کے مطالعے کے بعد لکھا تھا۔ وہ اعتراف کرتے تھے کہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے بارے میں میر کی آپ بیتی اُن کا کلیدی ماخذ تھا۔ ناول کا ایک کردار قمر النساء بھی میر کی شاعری میں جگہ پانے والی ایک نسائی شبیہ کی دین تھا۔ ناول میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا سارا پس منظر بہادر شاہ ظفر پر چلائے جانے والے مقدمے کی کارروائی سے لیا گیا تھا، غالب اور اقبال سے فکری قربت کا احساس خوشونت کو بہت تھا، دیوانِ غالب ان کے مطالعے میں رہتا تھا اور غالب کے بیشتر اشعار ان کی روزمرہ کی گفتگو کا حصہ بن جایا کرتے تھے۔ انہوں نے اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا، فیض، مخدوم اور راشد کی شاعری کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔

ممبئی میں قیام کے دوران خوشونت سنگھ کی سردار جعفری اور رفیق زکریا سے ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ اُن ملاقاتوں کے درمیان اُن کی بات چیت اردو ہی میں ہوا کرتی تھی۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ خوشونت سنگھ پنجابی بولتے تھے مگر وہ گورمکھی لپی سے نابلد تھے۔ جب ولایت پہنچ کر اپنی ماں سے خط و کتابت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہیں پنجابی یعنی گورمکھی لپی سیکھنی پڑی اُس پر انہوں نے اتنا عبور حاصل کرلیا کہ وہ گورمکھی بھی اردو اور انگریزی کی طرح لکھنے لگے۔ ان کی شخصیت بہت سوں کے لیے نزاعی تھی اور بہت سوں کے نزدیک وہ بے حد محبوب شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے اور ''ٹرین ٹو پاکستان'' جیسا مقبول ناول بھی اور ''نیچر واچ'' پرندہ شناسی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جو نیچر پرستوں میں پسند کی گئی اور تنقید کا نشانہ بھی بنی۔ انہوں نے ایک ڈائری بھی لکھی تھی لیکن ان کی ادارت اور کالم نویسی نے بڑی دھوم مچائی۔ السٹر یٹڈ ویکلی کی تعداد ان کے زمانے میں ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ان پر بہت کچھ لکھا بھی گیا، پنجابی فکشن نگار اجیت کور نے ان پر ایک طویل خاکہ بھولا بادشاہ لکھا تھا جو خاصا مقبول ہوا تھا۔ مذہب اور اُس کے حوالے سے ملاّ، پنڈت کا مذاق اور اُن کی تضحیک کے پس منظر میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خوشونت نے سکھوں کی روشن تاریخ بھی لکھی تھی اور اپنی خواب گاہ میں آویزاں پکاسو کی تصویر کے فریم میں مصورہ ارپنا کور کی بنائی گورونانک جی کی تصویر لگائی تھی، ان کی سوانح Not a nice man to know والے عنوان کی بازگشت کشور ناہید کی سوانح ''بُری عورت کی کتھا'' میں بھی سنائی دی تھی۔ خوشونت سنگھ نے اپنے بے حد مقبول انگریزی کالم کا عنوان With Malice Towards one and All مارٹن لوتھر کنگ اور ولیم فاکنر کے سوانح نگار Stephen B.Oates سے ذراسی تبدیلی کے ساتھ مستعار لیا تھا۔ انگریزی صحافت میں جس شخصی طرز کی کالم نویسی کو خوشونت سنگھ نے رائج کرنے کی کامیاب اور مقبول کوشش کی وہ اگلے کسی ایسے ہی تسلسل میں زندہ رہ پائے گی؟ اس کا جواب مجھے اس مصرعے سے ملتا ہے ''اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے''۔ خوشونت سنگھ کی حسِ مزاح خاص طور سے لطائف کے تعلق سے غضب کی تھی۔ لطائف جمع کرنے کا انہیں بڑا شوق تھا اور ان کے کئی انتخاب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اپنا مشہور کالم وہ ایک لطیفے پر ختم کیا کرتے تھے۔ اس تحریر کو ختم کرتے ہوئے سعدیہ دہلوی کا ایک لطیفہ نما جملہ بھی سن لیجیے۔ انہوں نے کہا تھا اگر خوشونت عورت ہوتا تو وہ ہمیشہ ''حاملہ'' ملا کرتا، کہ اسے نہ کہنے کی عادت نہیں!''

زمین کھا گئی۔ آسماں کیسے کیسے

کرشن نندہ
(چندی گڑھ، بھارت)

عصر حاضر کے ممتاز و معروف ادیب، ہندو پاک کے ہر دلعزیز قلمکار جناب ڈاکٹر بھگوان داس شباب للت پچھلے دنوں شملہ میں وفات پا گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کی اچانک رحلت کے سبب اُردو تحقیق کا کوہِ گراں زمین بوس ہوگیا۔ وہ عظیم عمارت جس کے بننے سنورنے میں تقریباً اَسّی سے زیادہ سال لگ گئے وہ پل جھپکتے ہی منہدم ہوگئی۔ ڈاکٹر شباب للت کا وجود اردو کے قحط سالی کے دور میں ہوا کے ایک ٹھنڈے جھونکے کی مانند تھا۔

مجھے تو جناب انور انجم کے حوالے سے اُردو اخبار ''ہند سماچار'' میں چھپی ایک خبر کے ذریعہ اطلاع ہوئی۔ پہلے تو یقین ہی نہیں ہوا لیکن جب کئی اعزاء و اقارب نے اس المیہ کی تصدیق کردی تو آنسوؤں نے ضبط کا دامن چھوڑ دیا۔

چند روز پہلے کی بات ہے جب ڈاکٹر شباب للت دہلی سے واپس شملہ جا رہے تھے تو چندی گڑھ میں تھوڑی دیر کے لیے جناب کرشن گوتم کے دولت خانہ پر رکے تھے۔ شاید علالت اور تعب زدہ ہونے کی وجہ سے مجھ ناچیز کے غریب خانے پر تشریف نہ لا سکے۔ مجھے جیسے ہی اُن کے چندی گڑھ میں رُکنے کی اطلاع ملی میں نے فوراً شملہ فون کر کے اپنی شکایت درج کرائی۔ اس پر انہوں نے نہایت شائستگی سے نہ مل سکنے پر افسوس ظاہر کیا اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اگلے چکر میں دہلی آتے جاتے میرے غریب خانے پر ضرور رُکیں گے۔ مجھے زندگی بھر یہ ملال رہے گا کہ اُن کا یہ وعدہ وفا نہ ہو سکا مجھے اُن سے ذاتی طور پر کبھی ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس دائماً رہے گا۔

میں نے اُن کو اُن کی تحریروں میں دیکھا ہے۔ پڑھا ہے، جانا ہے۔ مجھے جب ۲۰۰۹ء میں کچھ لکھنے کا شوق ہوا تو اپنی تخلیقات کے چند خاکے ترمیم کے لیے اُن کی خدمت میں ارسال کیے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر صاحب میری تحریروں کو کانٹ چھانٹ کر کے ردی کے ٹوکری میں نہ ڈال دیں مگر میں حیران رہ گیا جب انہوں نے میری کہانیاں معمولی سی نوک پلک سنوارنے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر مجھے واپس بھیج دیں۔ لال سیاہی کے ساتھ ایک نوٹ بھی لکھا ہوا تھا:

''آپ کی اردو بہت اچھی ہے بلکہ کئی لکھنے والوں سے بہتر ہے۔ آپ کی کہانیوں کو ترمیم کی ضرورت نہیں ہے آپ سیدھے ہی اشاعت کے لیے بھیج سکتے ہیں اِملا کی کچھ غلطیاں ضرور آ رہی ہیں آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔''

شباب للت

میں نے اُن کا مندرجہ بالا نوٹ اور اُن کی دیگر خط و کتابت بہت سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے اس کے بعد بھی کئی دفعہ اس موضوع پر اُن سے رابطہ قائم کیا انہوں نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے میرے ہر سوال کا جواب دیا۔ میری حوصلہ افزائی کی۔ میں اسی لیے آج بھی اُن کو اپنا مُرشد مانتا ہوں۔ میں اپنی متعدد کہانیوں کے عنوان اُن کے کہنے پر اُن کی تجویز کے مطابق بدل دیئے۔ میری ایک کہانی ''نا خدا'' پر انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ یہ کہانی بزرگ ایک بزرگ جوڑے کے متعلق ہے جو بالکل بے بس، بے سہارا، لاچار اور نادار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے تمام سگے سمبندھی منہ موڑ لیتے ہیں۔ دہلی کے ایک معزز رسالے کی ایڈیٹر نے جب یہ کہانی پڑھی تو کہنے لگیں کہ یہ تو فلم ''باغبان'' کی نقل ہے۔ حالانکہ اس کا فلم باغبان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُن ایڈیٹر محترمہ کا بہت نام ہے اردو ادب میں ایک اونچا مقام ہے۔ میں بھی اُن کی بہت عزت کرتا ہوں۔ جب میں نے یہ واقعہ جناب شباب للت کو سُنایا تو انہوں نے باغبان والی بات کی تردید کرتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے جناب نند کشور وکرم صاحب کا حوالہ دیا کہ انہوں نے اسی موضوع پر ایک مکمل ناول لکھا ہے۔ انہوں نے ٹیلیفون پر ہی اُس ناول کے چند Extract بھی سُنائے۔ محترمہ رینو بہل جی نے بھی اس موضوع پر ایک کہانی لکھی ہے۔ اس طرح کے قصے آج کل عام ہیں لیکن سب باغبان کی نقل تو نہیں ہو سکتے۔ اس لیے مجھے ہدایت دی کہ میں اس طرح کی نکتہ چینی اور عیب بینی کو درکنار کرتے ہوئے اپنا کام کرتا رہوں۔

ایک دن اچانک اُن کا شملہ سے فون آیا ''میں تمہاری کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں اچھا لکھ رہے ہو۔ آگے بڑھتے رہو''

اُن سے بات کر کے میں بہت شرمندہ ہوگیا۔ فون تو درحقیقت مجھے کرنا چاہیے تھا تاخیر تو میری ہی جانب سے ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنا بڑکپن قائم رکھا اور میری پیٹھ تھپتھپائی۔

میں تو درحقیقت جناب شباب للت کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ ''چہارسُو'' نے اُن کے لیے قرطاس اعزاز کا اعلان کیا۔ جب میں نے محترمہ عروب شاہد کا تحریر کردہ ''دولتِ یقیں'' جناب گلزار جاوید کا ''براہِ راست'' جناب محمد انعام الحق کا ''دل کے دروازے'' اور دیگر کئی حضرات کے مضامین پڑھے تب اُن کی اصلی شخصیت پر پڑا ہوا پردہ اٹھ گیا۔ اندھیرے چھٹ گئے روشنی ہو گئی۔ جناب رشی پٹیالوی نے خوب کہا ہے میرے خیالات کی ترجمانی کی ہے:

اللہ اللہ یہ عروج نیاز
میرا سر اور آستانِ شباب
مُنہ ہے چھوٹا مگر ہے بات بڑی
کس طرح مجھ سے ہو بیانِ شباب

پہلا افسانچہ

نقشبند قمر نقوی بخاری

(امریکہ)

عنوان سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں ''افسانچہ'' کی تاریخ یا اس کی ہیئت کے بارے میں مضمون قلم بند کر رہا ہوں، ایسا نہیں ہے، لوگوں کے پاس علم وادب کے مطالعے کے لیے فی الحال وقت کی شدید قلت ہوگئی ہے۔

میں افسانچہ لکھ رہا ہوں، یعنی ایک نہایت مختصر قصہ! عنوان ہے ''اتحاد باہمی''۔ رسالوں میں پہلے تو مختصر افسانوں کا رواج ہوا وہ بھی طویل ثابت ہوئے اور قارئین کو وقت کے مزید اختصار کی ضرورت محسوس ہوئی، لوگوں کے پاس کام ہی اتنا زیادہ ہوتا ہے، اس میں سب سے اہم کام ٹوٹی وی دیکھنا ہے، اس کے بعد جو وقت بچے اس میں اس قدر کام ہوتے ہیں کہ کچھ کرنے کو موقع ہی نہیں ملتا، ایک دوسرے کی عیب جوئی، سازشیں، باہمی فساد، اکھاڑ پچھاڑ، تاک جھانک۔۔۔ انسان کس قدر مصروف ہوگیا ہے۔

اگر کسی طرح کرۂ ارض کی گردش کی رفتار کم ہوسکے تو دن بھی طویل ہوسکتے ہیں اور رات بھی، ممکن ہے چھتیس یا اڑھتالیس گھنٹے کا دن ہونے لگے تو کام کا زیادہ وقت مل سکتا ہے، ٹی وی زیادہ دیکھا جاسکتا ہے، زیادہ سویا جاسکتا ہے، زیادہ دل آزاری کی جاسکتی ہے، تعصب اور مذہبی غیر رواداری کے لیے زیادہ وقت مل سکتا ہے۔

فی الحال یہ امید برنہیں آنے کی!

لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے، کوئی طویل افسانہ نہیں لکھوں گا، افسانچہ لکھنا شروع کرنا چاہیے، چنانچہ یہ پہلا ''افسانچہ'' لکھ رہا ہوں۔

افسانچے کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی کہانی ہو، کتنی چھوٹی ہو؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا، بس یہی کہ چھوٹی ہو، چند سطروں میں سارا واقعہ مفصل بیان ہو جائے اور اس خوبی کے ساتھ بیان ہو کہ قاری اس کی ساری تفصیلات خود ہی مہیا کرلے، کم از کم سوچ ہی لے۔۔۔ مثلاً اگر افسانچہ لکھنے والا لکھے۔۔۔ عورت نے بغور مرد کی طرف دیکھا تو قاری کو اس کا تانا بانا فوراً ہی بن لینا آسان ہو جائے، وہ جان جائے دیکھنے والی ایک عورت ہے جو کم عمر۔۔۔ بلکہ کم سن ہے (دوشیزہ سمجھ لینا زیادہ بہتر ہے) عاشق مزاج ہے، حسین تو ضرور ہے، اس لیے کہ دوشیزہ قدرتاً حسین ہوتی ہے، دوشیزہ کے لفظی معنی ہیں، عاشقی مزاج مؤنث فرقے کمسن، حسین، ذی روح۔

اور مورد تذکرہ دوشیزہ یقیناً کشیدہ قامت، غزال چشم، ہلال نما ابرو، لعل جیسے سرخ ہونٹ۔۔۔ ہونٹ نہیں ''لب''۔۔۔ کشمیری سیب جیسے رخسار۔۔۔ سب کچھ وہی ہوگا جیسا قاری کا تصور!

اور۔۔۔ یقیناً کنواری۔۔۔ کنواری کا تصور ہی بہت عشق آفریں ہوتا ہے! اس نے جس کی طرف دیکھا، وہ یقیناً مرد ہی ہوگا۔۔۔ اور قاری فوراً اس کی جگہ اپنے کو جما دیتا ہے وہ مرد جو قاری کا ہم شکل وہم عمر ہے، جوان (خود اسی کا جیسا) وجیہ، اس لیے کہ قاری بزعم خود وجیہ ہے، دل دینے کے معاملے میں قاری کی طرح فیاض، کوئی دوشیزہ ذرا متبسم نظروں سے دیکھ بھر لے، وہ تو فوراً دل نذر کرنے پر آمادہ نہیں ''مجبور''۔۔۔ مشرقی مرد وے اسی فطرت پر تخلیق کیے گئے ہیں، سبھی دل پھینک ہوتے ہیں۔ اور سبھی کو اپنے بارے میں بے حساب خوش فہمیاں بھی ہوتی ہیں۔

چنانچہ افسانچے کے صرف ایک جملے نے قاری پر مفاہیم کے بے شمار دروازے پاٹوں پاٹ کھول دیے۔

اس نے یہ بھی یقیناً سوچا۔۔۔ ابھی گذشتہ دن کی ہی بات تھی۔۔۔ اس حسینہ جمیلہ نے مجھے بغور دیکھا تھا، میں ہوں بھی اتنا جاذب نظر۔۔۔ لڑکیاں تو مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ زندگی گزارنے (یا کم از کم رات گزارنے) کے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ بیشک وہ منہ سے کچھ نہیں کہیں!!! میں سب سمجھتا ہوں، ان کے دل میں تو مجھے دیکھ کر لڈو پھوٹنے لگتے ہیں اور میں۔۔۔ میں تو ہر وقت آمادہ رہتا ہوں، کوئی مہرباں ہو کر مجھے بلائے تو!

پھر۔۔۔ قاری یہ بھی سوچتا ہے اس عورت نے۔۔۔ یعنی اس حسین وجمیل دوشیزہ نے اس۔۔۔ میرے جیسے دلکش شخص کو۔۔۔ بغور دیکھا۔۔۔ یقیناً میرے جیسے دلکش چہرے پر اس کی نگاہیں مرکوز ہوگئی ہوں گی، بلکہ اس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئی ہوں گی، یقیناً میرا ہی چہرا کہنا چاہیے، وہ مرد مجھ سے زیادہ پرکشش تو ہرگز نہیں ہوسکتا، میں بہت ہی پرکشش ہوں۔۔۔ خیر تو وہ عورت بغور دیکھنے لگی، اس کی نظریں مرد پر جم گئیں، اور ان نظروں میں یقیناً کوئی پیغام بھی ہوگا۔۔۔ میں ان دوشیزاؤں کو جانتا ہوں، یہ جس کی طرف بھی دیکھتی ہیں کوئی نہ کوئی پیغام ارسال کرتی ہیں۔۔۔ مشہور ہے عشق اول در دل معشوق پیدا می شود۔۔۔ چنانچہ ''شوذ'' ضرور ہوگیا ہوگا تبھی اس عورت نے مرد کی طرف بغور دیکھا اور وہ پیغام ارسال کیا جسے مرد۔۔۔ یعنی قاری۔۔۔ فوراً سمجھ گیا، لہٰذا اس نے بھی عورت۔۔۔ یعنی حسین وجمیل دوشیزہ۔۔۔ کو دیکھا اور بغور ہی دیکھا ہوگا، بیشک قلم کار یعنی ایں جانب نے یہ بات نہیں لکھی اس لیے کہ میں تو افسانچہ لکھ رہا ہوں، اگر مکمل افسانہ لکھتا تو یہی بات کہتا جو قاری سمجھ رہا تھا۔

افسانچے نے کمال ہی کر دیا۔۔۔ کتنی مختصر عبارت میں کس قدر طول طویل داستان کو سمو دیا۔۔۔ کوزے میں سمندر اسی کو تو کہتے ہیں، بلکہ سمندر کیا۔۔۔ پورا بحر ہند۔

اور پھر دیکھنے۔۔۔ یعنی بغور دیکھنے۔۔۔ کا یہ مطلب ہے، عورت

---یعنی دوشیزہ---کے لبہائے لعلیں پر---افسانچہ نویس (یعنی میں) نے لبہائے لعلیں کا ذکر ہی نہیں کیا---لیکن اس کے ہونٹ---توبہ---لب---لعلیں تو ضرور ہوں گے، کسی دوشیزہ کے لب اس کے علاوہ کچھ اور تو ہو ہی نہیں سکتے۔لعل بدخشاں کو دلنشیں قاشیں---کہنا یہ تھا اس دوشیزہ کے لبہائے لعلیں پر بجلی کا کوندا ہوا ہوگا---یہ ایک شاعرانہ بات ہے، ہر کس و ناکس اسے کیا سمجھے گا---مراد یہ ہے، اس دوشیزہ کے لبہائے لعلیں پر مسکراہٹ آئی، بیشک افسانچہ نویس نے واضح نہیں لکھا، اس سے کیا ہوتا ہے، افسانچہ نویس کا یہی تو شعبدہ ہے، اس نے کچھ نہ لکھ کر بھی سب کچھ لکھ دیا---کس غضب کی قلم کاری ہے---اسی کو کہتے ہیں اللہ کی دین---خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال---!

اسی لئے تو بعض لوگ اپنا نام ''اللہ دتہ'' رکھ لیتے ہیں۔

تو جب دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا تو کیا ہوا؟

ہوا یہ کہ افسانچہ نویس نے لکھا ہے---مرد مسکرایا---بس یہیں افسانچہ نویس سے غلطی ہوگئی---مرد پہلے نہیں مسکرایا تھا---میں یعنی قاری کسی عورت یعنی دوشیزہ کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر مسکراتا تھوڑی ہوں---پہلے وہ عورت---دوشیزہ---مسکرائی، افسانچہ نویس کا یہی مطلب تھا---تب مرد مسکرایا---

اب یہ کہ دوشیزہ کیوں مسکرائی---افسانچہ نویس اگر یہ بات کہہ دیتا تو پھر وہ افسانچہ کیسے لکھتا---یہ تو کہنا ہی نہیں تھا---وہ مسکرائی اس لئے کہ وہ مرد کو---یعنی مجھے---بتانا چاہتی تھی---ہائے تم کتنے اچھے ہو---میں واقعی اچھا ہوں---قاری نے سوچا!

اور ممکن ہے قاری نے اٹھ کر آئینہ بھی دیکھا ہو، اور اپنی شکل دیکھ کر شاید مایوسی بھی ہوئی ہو مگر اس کے آئینے کی اس غلط نمائی کا جواز بھی تھا، آئینہ کوئی اصلی شکل تو نہیں دکھاتا، ہر آئینہ وہ تو نہیں ہوتا جس کے بارے میں زیب النساء نے کہا تھا---خوب شد اسباب خود بینی شکست!

صحیح شکل تو حلب کا آئینہ ہی دکھا سکتا ہے، یا چینی آئینہ---اس لیے کہ زیب النساء کا جو آئینہ ٹوٹا تھا وہ ''چینی'' آئینہ تھا، جیسا کنیز نے کہا تھا ''از قضا آئینہ چینی شکست''

بات وہاں پہنچی تھی کہ قاری نے سوچا---افسانچہ نویس نے صرف بغور دیکھنا ہی لکھ کر سب کچھ لکھ دیا، مراد یہی تھی کہ دوشیزہ مسکرائی، ایسی مسکراہٹ جس میں ایک پیغام تھا---اور وہ پیغام---صرف پیغام محبت ہی ہو سکتا ہے---اس کے جواب میں مرد بھی ضرور مسکرایا ہوگا---اس کا فرض تھا کہ مسکرائے، اگر وہ نہ مسکرایا تو میں اس کا سر توڑ دوں گا، احمق، دوشیزہ مسکرا رہی ہے اور تو بدتمیز کہ جواباً مسکراتا بھی نہیں۔میں تو ایسا نہیں ہوں، میں ضرور مسکراؤں گا۔ بلکہ مسکرا کر سلام بھی عرض کر دوں گا۔یعنی سلام محبت---وہ جو فلم ایکٹرس ثریا نے گانا گایا تھا---لگا پہلی نظر کا تیر---بس وہی!

حیرت انگیز یہ وہ دونوں پبلک بس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ویسے افسانچہ نویس نے یہ بات واضح نہیں کی۔لیکن افسانہ پڑھنے والے کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ افسانچہ نویس سے تعاون کرے اور جہاں خلا رہ جائے تو اس کو پُر کرے، اگر قاری اتنا بھی کام نہ کر سکے، تو اس کو ''قاری'' کے بجائے ''بیماری'' کہنا ہوگا۔ہت تیرے کی، بھئی تُو اتنی سی بات بھی نہیں جانتا کہ افسانچہ لکھنے والا کن خطوط پر سوچ رہا ہے، خطوط سے مراد وہ خط نہیں جس کے ضمن میں غالب نے دھمکایا تھا کہ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، بیوقوف---لیکن میرا سلام کیہو اگر نامہ بر ملے---اور اس کے ایک چپت بھی لگائیو کہ اُلّو، اب تک تو نے میرا خط میرے محبوب کو کیوں نہیں پہنچایا، ادھر اُدھر جھک مار رہا ہے۔

جن خطوط کا یہاں تذکرہ ہے وہ خط جدی اور خط سرطان سے متعلق ہے---! انگریزی میں انہیں ٹراپک آف کینسر اور ٹراپک آف کیپریکارن کہتے ہیں۔

اب کوئی ان خطوط کی تفصیلات نہ سوچنے لگ جائے!

افسانچہ نویس نے اس دوشیزہ---ہائے وہ---کے مسکرانے کا تذکرہ نہیں کیا، لیکن وہ مسکرائی ضرور---میں کہتا ہوں وہ مسکرائی، ردوکد کی ضرورت نہیں، مان لیا جائے کہ وہ مسکرائی---اور جواباً وہ مرد---یعنی قاری ---بھی مسکرایا قاری تو ایسے مواقع پر مسکرانے کا دلدادہ ہے۔

اس مسکراہٹ کا کوئی نہ کوئی نتیجہ تو برآمد ہونا ہی تھا۔مراد یہ کہ جو ''برآمد'' ہوتا ہے وہ ''درآمد'' ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے، یعنی پہلے ''در'' اس کے بعد ''بر'' یہ بات بھی افسانچے کا ایک اہم نکتہ ہے۔

اب یہ قاری کی سمجھ کی بات ہے، افسانچہ تو افسانچہ ہوتا ہے، اس میں اگر ساری بات بتا دی جائے تو پھر کوئی خوبی ہی نہ رہے، افسانچے میں بات ''در پردہ'' کہی جاتی ہے مختصر کہی جاتی ہے، اشارتاً کہی جاتی ہے۔

اور جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ سارا ہی اشارتاً و کنایتاً ہی ہے۔ البتہ---مسکراہٹوں کے اس ارادی تصادم اور تبادلے کا کوئی نہ کوئی نتیجہ تو نکلنا ہی تھا۔

اب تک افسانہ نویس (یعنی اِس جانب) کے صرف ایک ہی جملے کی تشریح کی گئی، افسانچہ جو ہوا، افسانچے میں تفصیلی قصہ تھوڑی بیان کیا جاتا ہے، افسوس قاری کو اتنی سی بات نہیں معلوم، اس دور کا قاری ہی ناکارہ ہو گیا ہے!

افسانچے کا یہ جملہ ہی کمال کا تھا۔

دوسرا جملہ ہے---

پھر ان دونوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا (مصافحہ کو ایسا نہ ہو کوئی مذائقہ پڑھ لے)

افسانچے میں لفظ ''مصافحہ'' نہیں ہے۔افسانچہ نویس اتنا لکھا پڑھا بھی نہیں کہ ایسے دقیق الفاظ لکھنے لگے---آخر لوگ سمجھتے کیوں نہیں--- افسانچہ نویس شاید میٹرک بھی پاس نہ ہو، وہ بھی اس نے ہندی پڑھ کر نقل کے

ذریعے پاس کیا تھا۔۔۔اب تو پانچویں درجے تک پڑھے ہوئے صاحبانِ قلم کو ''ڈاکٹر'' کا لفظ اپنے نام نامی اور اسم گرامی کے ساتھ جوڑ دینے کا شرف بھی اچھا خاصا حاصل ہو گیا ہے۔اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔

لندن کی ایک دکان سے جو ڈگری درکار ہو، وہ بعوض کچھ پاؤنڈ خریدی جاسکتی ہے،افسانچہ نویس کے پلے تو وہ زرخرید ڈگری بھی نہیں ہوسکتی!

بات یہ تھی کہ اس مرد۔۔۔قاری جیسا وجیہ مرد۔۔۔نے بڑھ کر اس عورت یعنی دوشیزہ حسین جمیل سے ہاتھ ملایا۔۔۔یہ الگ بات ہے کہ اس اتصال دستی میں معمول سے زیادہ وقت لگا،اب کیا یہ بھی کوئی تفصیل طلب بات ہے؟

دنیا کے کسی ملک کے قانون میں بھی ہاتھ ملانے کی مدت کا تعین نہیں ہے، جتنی دیر جس کا دل چاہے ملائے رہے۔

یہ بھی جان لینا ضروری ہے۔۔۔وہ مرد مذہبی نہیں ہوسکتا، بعض مذہبی لوگ، کسی عورت سے۔۔۔خواہ وہ دوشیزہ ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ہاتھ ملانا، یا اتصال جسم وجاں روا رکھنا، مناسب نہیں سمجھتے۔۔۔یعنی سرِعام۔۔۔خلوت میں تو۔۔۔خیر۔۔۔اہلاً وسہلاً مرحبا!

وہ عورت بھی مذہبی نہیں ہوگی۔۔۔دوشیزہ رہی ہوگی، اس عمر میں کیسا مذہب اور کیا قانون۔۔۔!

اب جو کچھ ہوا وہی افسانچہ نویس کے کمال فن کی دلیل ہے۔

جیسے ہی بس سٹاپ آیا، وہ دونوں وہیں اتر گئے۔

تین جملے ہو گئے۔۔۔

قاری پر یہیں پہنچ کر رازہائے دروں پردہ افشا ہو گئے!

لیکن افسانچہ نویس کو چوتھا جملہ بھی لکھنا تھا۔

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک طرف چل دئے۔

کہانی ختم۔

افسانچہ نویس کس سہولت کے ساتھ سارے واقعے کی تفصیل بیان کرنے سے صاف بچ گیا اور قاری ساری بات صاف سمجھ گیا یہی کہانی کا وصف ہے۔

اب یہ کہ افسانچہ پڑھنے کا وقت بھی نکلنا بند ہو جائے گا۔۔۔کچھ بھی پڑھنے کا وقت نہیں رہے گا۔۔۔جو دیکھنا یا سننا ہو وہ ٹی وی پر دیکھا اور سنا جاسکتا ہے، یا کمپیوٹر پر معلوم کیا جاسکتا ہے۔

عجیب واقعہ ہوا۔۔۔میں نے تو سوچا تھا ایک افسانچہ لکھوں، اگر میں کسی عظیم ادیب کے وہ چار جملے نہ لکھتا جسے لکھنے والے نے ''اتحاد باہمی'' کا عنوان دیا ہے، تو مجھے یہ سب نہ لکھنا پڑتا۔ ویسے عنوان میں ذرا سی اصلاح مناسب معلوم ہوتی ہے۔لفظ ''باہمی'' غیر ضروری ہے۔۔۔صرف ''اتحاد'' کافی تھا، اگرچہ اب نہ اتحاد کا مفہوم کوئی سمجھتا ہے نہ کسی کو ''باہمی'' کی ہی خبر ہے۔

میں نے ''افسانچہ'' لکھ ہی دیا!

اب میں صرف ''افسانچہ'' ہی لکھا کروں گا۔

اینٹی غزل

اچھا پتّہ کھُل جائے گا
سر البتہ کھُل جائے گا
شہد اکٹھا کرنے والوں
اک دن چھتّہ کھُل جائے گا
جام لگا ہے اب دلّی میں
اب کلکتہ کھُل جائے گا
داؤں لگایا ہے پنجے پر
چھکّا ستّہ کھُل جائے گا
جلد بہت نازک باندھی ہے
اس کا گتّہ کھُل جائے گا
اُس نے تان لیا ہے گھونسہ
میرا ہتّہ کھُل جائے گا

پرویز مظفر (برمنگھم)

''لیلیٰ کے رنگ''

دنیائے محبت نے جب اپنی بِنا ڈالی
کوئی مجنوں بنا ڈالا، کوئی لیلیٰ بنا ڈالی
لیلیٰ کے اشکوں سے تو پریشان تھا ایک عالم
مجنوں کے نالوں نے تو دنیا ہی ہِلا ڈالی

○

سندھ میں تو ساتھ ساتھ تھے سسّی اور پُنوں
پنجاب میں ہمیشہ سے اکیلے ہیں میاں چنوں

○

ایران میں جیسے ہیں شیریں اور فرہاد
پاکستان میں ویسے ہی سَہتی اور مُراد

○

نہ تم حسیں ہو اور نہ جواں ہو
کس بات پہ صابر تم نازاں ہو
چہرہ تمہارا مرجھا رہا ہے
جاتی بہاروں کی تم خزاں ہو

صابر چھتاروی (راولپنڈی)

ایک صدی کا قصہ

دادامنی اشوک کمار

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

اشوک کمار کا اصلی نام کمند لال کنج لال گنگولی تھا لیکن سرکاری ریکارڈ کے مطابق اُن کا نام اشوک کمار گنگولی ہے۔ فلم انڈسٹری کے لئے وہ دادا منی تھے۔ یعنی بڑا بھائی اور اپنوں کے لئے وہ اشوک بھیا تھے۔ اشوک کمار کا جنم 13 اُکتوبر 1911 کو بھاگل پور (بہار) میں ہوا۔ دادامنی کے پتا کا نام کنج لال گنگولی تھا جو کہ ایک جانے مانے وکیل تھے۔ اُنکی ماں گوری دیوی ایک صاحب ثروت بنگالی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خاندان کھنڈوا (مدھیہ پردیش) میں آباد تھا۔ دادامنی کی اپنی ابتدائی تعلیم بھاگل پور میں ہوئی اور آگے کی پڑھائی اُنہوں نے پریذیسی کالج کلکتہ میں پوری کی۔ اُنکے بہنوئی سبودھ مکھرجی صاحب جن کا بیاہ اُنکی بڑی بہن ستی دیوی کے ساتھ ہوا تھا ہمانشو رائے کی فلم کمپنی بمبئی ٹاکیز میں بطور ساونڈ ریکارڈسٹ کام کرتے تھے۔ اشوک کمار کے دو اور بھائی تھے۔ مجھلے کا نام (ابھاس کمار گنگولی) جو بعد میں کشور کمار کے نام سے جانے گئے جب کہ چھوٹے کا نام انوپ کمار تھا۔ دادامنی کا بمبئی آنا ایک اتفاق تھا۔ وہ قانون دان بننا چاہتے تھے مگر اُنکے جیجاجی کے اصرار پر وہ کلکتہ سے بمبئی چلے آئے اور بمبئی ٹاکیز میں بطور ہلپر کام کرنے لگے۔ اُنہیں اس کام میں کوئی دلچسپی نہ تھی مگر کاتب تقدیر نے انکے لئے پہلے سے ہی کچھ اور لکھ کے رکھا تھا۔

1936 میں ہمانشو رائے فلم ''جیون نیا'' کی تکمیل میں مصروف تھے۔ اس فلم میں نجم الحسن اور دیوکا رانی کام کر رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ایک دن جب یہ خبر پھیل گئی کہ دیویکا رانی فلم کے ہیرو نجم الحسن کے ساتھ بھاگ گئی تو بمبئی ٹاکیز میں جیسے بھونچال آ گیا۔ سب سے زیادہ جو شخص دیویکا رانی کی اس بے وفائی اور بے حیائی سے دکھی اور پریشان تھا وہ تھے بمبئی ٹاکیز کے روح رواں اور مالک ہمانشو رائے جو کہ دیوکا رانی کا شوہر بھی تھا۔ ششدھر مکھرجی جو کہ ساونڈ ریکارڈسٹ ساوک واچا کا اسسٹنٹ تھا، ایک بنگالی ہونے کے ناطے ہمانشو رائے سے پوری پوری ہمدردی رکھتا تھا اور وہ دیوکا رانی کو نجم الحسن کی بانہوں سے نکال کر ہمانشو رائے کے پاس واپس لانا چاہتا تھا۔ کسی کو بتائے بنا وہ کلکتہ پہونچ گیا اور اُسنے دیوکا رانی پر نہ جانے کیا منتر پھونکا کہ وہ اپنے عاشق کی بانہوں سے نکل کر اُسکے ساتھ بمبئی لوٹ آئی۔ ہمانشو رائے جو کہ اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا، وہ اپنی بے وفا بیوی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ ششدھر مکھرجی تھے جس نے ہمانشو رائے کو اس بات کے لئے آمادہ کر لیا کہ وہ دیکا رانی کی خطا معاف کر کے اسے قبول کر لیں۔ جس فلم کے لئے نجم الحسن نے چند سین شوٹ کئے تھے وہ سارے سین تلف کر دئے گئے اب سوال یہ تھا کہ اُسکی جگہ کسے ہیرو لیا جائے۔ اشوک کمار جسنے ہیلپر کے طور پر بمبئی ٹاکیز میں جوائن کیا تھا، وہ خوبرو تھا اور تھوڑا بہت گا بھی لیتا تھا۔ ششدھر مکھرجی نے اپنے باس کو تجویز پیش کی کہ کیوں نہ وہ ایک بار اشوک کمار کا اسکرین ٹسٹ لیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نجم الحسن کا بدل ثابت ہو۔ ہمانشو رائے جس نے ہمیشہ نئے نئے تجربے کئے تھے اُسنے مکھرجی کی تجویز مان لی اور اُس نے اپنے جرمن کیمرہ مین ویریچنگ سے کہا کہ وہ اشوک کمار کا اسکرین ٹیسٹ لیں۔ اشوک کمار کا سکرین ٹیسٹ لیا گیا۔ جب یہ رشز ہمانشو رائے کو دکھائے گئے تو ہمانشو رایے کو یہ لڑکا ٹھیک ٹھاک لگا۔ حالانکہ اُنکے جرمن ڈائرکٹر کو اشوک کمار کے چناؤ پر اعتراض تھا مگر ہمانشو رائے اپنے فیصلے بدلتے نہیں تھے۔ اُنکی بات پتھر کی لکیر ہوا کرتی تھی۔ ۲۲ سال کے اشوک کمار کو دیویکا رانی کے مد مقابل ہیرو کا رول ادا کرنے کے لئے چنا گیا تھا۔

اشوک کمار ایکٹنگ سے بالکل کورا تھا جب کہ دیویکا رانی اُس سے میلوں آگے تھی۔ وہ اشوک کمار کو چاکلیٹ ہیرو کہا کرتی تھیں۔ اُسے لگتا تھا جیسے یہ آدمی چاکلیٹ سے بنا ہو۔ پہلی فلم بنی ریلیز ہوئی۔ اُسکے بعد 1937 میں ''عزت'' اور ''ساوتری'' بن کر ریلیز ہوئیں۔ اُسکے بعد 1938 میں ''نرملا'' ریلیز ہوئی۔ اسکے بعد یکے بعد دیگرے اُسکی تین فلمیں لیلا چٹنس کے ساتھ ریلیز ہوئیں۔ یہ فلمیں تھیں 1939 کی ''کنگن'' 1940 کی ''بندھن'' اور 1941 کی ''جھولا''۔ یہ فلمیں کامیاب رہیں۔ اُس زمانے میں اشوک کمار کا یہ گانا ''میں بن کا پنچھی'' زبان زد عام ہو گیا تھا۔

ہر نئی فلم کے ساتھ اشوک کمار کی اداکاری میں نکھار آتا گیا۔ اشوک کمار کی تنخواہ پچھتر روپے ماہانہ طے ہوئی تھی۔ اتنے سارے پیسے اُن دنوں ایک بھری پری فیملی کو چلانے کے لئے کافی تھے۔ منٹو لکھتے ہیں کہ جب اشوک کمار کی تنخواہ پچھتر سے بڑھا کر سو کر دی گئی تو وہ بہت خوش ہوا۔ جب اشوک کمار کی تنخواہ اڈھائی سو روپے کر دی گئی تو وہ خوش ہونے کی بجائے کافی پریشان ہوا۔ اپنے دوست سعادت حسن منٹو کو وہ واقع بیان کرتے ہوئے دادامنی نے کہا۔ ''اوہ مائی گاڈ۔ جب اسٹوڑیو کے خزانچی نے میرے ہاتھ میں ڈھائی سو روپے تھمادئے تو میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میں اس تردد میں پڑ گیا کہ میں اتنی ساری رقم کہاں چھپا کے رکھ لوں، کیونکہ میں ملاڈ کے جس کمرے میں رہتا تھا اُسکی چھت ٹین کی تھی۔ اس کمرے میں ایک کھاٹ اور تین چار کرسیاں تھیں۔ آس پاس گھنا جنگل تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر چوروں کو خبر لگ گئی کہ میرے پاس اتنی بڑی رقم ہے تو میں چوروں سے اپنا دفاع کیسے کر پاؤں گا۔ سچ کہوں مجھے چوروں سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ میں نے وہ ساری رقم اپنے گدّے کے نیچے چھپالی اور میں ساری رات مارے خوف کے سو نہ سکا۔ طرح طرح کے خوفناک خواب مجھے رات بھر ڈراتے رہے۔ وہ رات میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی'' جب وہ یہ واقع مجھے بیان کر رہا تھا تبھی کلکتہ سے ایک فلمساز اُسے سائن کرنے کے لئے آیا تھا۔ وہ اُسے اسی ہزار میں سائن کرنا چاہتا تھا مگر اشوک کمار ایک لاکھ کی مانگ کر رہا تھا۔ وقت کا کھیل دیکھئے جو آدمی اڑھائی

سوروپے دیکھ کے اتنا پریشان ہوا تھا آج وہ اسی ہزار کی رقم دیکھ کے بھی للچا نہیں پا رہا تھا۔

1943 میں قسمت کی دیوی اشوک کمار پر پوری طرح مہر بان ہوگئی۔ اُنکی فلم ''قسمت'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کو وہ کامیابی ملی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ فلم کلکتہ کے ایک ہی سینما ہال میں مسلسل تین سال تک چلتی رہی۔ اس فلم میں اشوک کمار کے مدمقابل ممتاز شانتی نے ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کا صدا بہار سنگیت انل بسواس نے دیا تھا۔ اس فلم کی کامیابی کے ساتھ ہی اشوک کمار کی مقبولیت ساتویں آسمان پر پہونچ گئی۔ اس بیچ ہمانشو رائے کا دیہانت ہوگیا۔ دیو کا رانی نے اپنے شوہر کی موت کے بعد کمپنی کو اچھے ڈھنگ سے چلانے کی کوشش کی مگر سبودھ مکھرجی اور اُن کے بھائی گیان مکھرجی بمبئی ٹاکیز پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتے تھے اسلئے اندر خانے سازشیں چلتی رہیں۔ ہمانشو رائے کی موت کے ساتھ ہی بمبئی ٹاکیز میں سازشوں کا دور شروع ہوگیا۔ دیوکا رانی بڑی بھنٹ عورت تھی۔ اُس نے باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور بمبئی ٹاکیز میں اشوک کمار کا جو رتبہ تھا اُسے کم کردیا۔ اتنا ہی نہیں، ششادھر مکھرجی کے بھائی گیان مکھرجی کو سائڈ لائن کر کے امیہ چکرورتی کو بنگال سے بلا کر اُسے ڈائرکٹر بنادیا گیا۔ اشوک کمار کا خیمہ یہ سب دیکھ کر خون کے گھونٹ پیتا رہ گیا۔ اُنہوں نے بمبئی ٹاکیز سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور فلمستان کے نام سے اپنی کمپنی کھولی اور اس کے بینر تلے کئی فلمیں بنائیں۔ جن میں 1949 کی ''محل'' اور اُسکے بعد ''مجبور''، ''مشعل'' اور ''ضدی'' ہیں۔ فلم ''محل'' سے دو ستاروں کا ظہور ہوا۔ ایک مدھو بالا اور دوسری لتا منگیشکر۔ دادامنی کا ہم دلیپ صاحب کے گھر پر ایک بار انٹرویو کر رہے تھے تو اُنہوں نے لتا منگیشکر کے بارے میں یہ بتا کر ہمیں چونکا دیا کہ جب کھیم چند پرکاش نے لتا منگیشکر کو گنوانے کی مجھ سے اجازت مانگی تو میں نے شروع میں منع کردیا۔ بعد میں میں اُس سے ایک گانا گنوانے پر تیار ہوگیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ دبلی پتلی سی لڑکی جسکی عمر اُسوقت محض تیرہ سال تھی گانے نکلی تھی۔ ہم نے اُسے سے پہلا گانا ''آئے گا آنے والا۔ آئے گا'' گنوایا تو میں اُسکی آواز سن کر دنگ رہ گیا۔ میں اُسکے گانے سے اتنا خوش ہوا کہ میں نے اُس سے پوچھا کہ تمہیں کیا انعام چاہئے تو اُسنے کہا چاکلیٹ۔ اُسے چاکلیٹ بہت پسند تھے۔ میں نے کھیم چند پرکاش کو لتا سے ایک اور گانا گنوانے کی اجازت دے دی۔ اُنہوں نے ایک اور خوبصورت گانا لتا کی آواز میں ریکارڈ کیا جس کے بول ہیں ''مشکل ہے بہت مشکل چاہت کو بھلا دینا''۔ ان دو گانوں نے لتا کو کروڑوں دلوں کی ملکہ بنادیا۔ یاد رہے کہ اُن دنوں ریکارڈ پر گانے والے کا نام نہیں دیا جاتا تھا بلکہ اُس ہیرو یا ہیروئن کا نام دیا جاتا تھا جس پر یہ گانا پکچرائز ہوتا تھا۔ جب آئے گا آنے والا گانا ریڈیو پر بجنے لگا تو سننے والے اس آواز کا نام جاننے کے لئے اتنے بے تاب تھے کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں آل انڈیا ریڈیو میں خطوط بھیجنے لگے۔ مجبوراً آل انڈیا ریڈیو کو لتا منگیشکر کا نام ظاہر کرنا پڑا۔ یہاں سے وہ برسوں کی روایت ٹوٹ گئی اور آگے سے ہر ریکاڑ پر گانے والے کا نام چھپنے لگا۔

اسی طرح فلم ''مشعل'' کے سیٹ پر اُنہوں نے ایک لڑکے کو نوٹ بک لے کے ڈائرکٹر کے پیچھے کھڑا پایا۔ بمبئی ٹاکیز کا ایک اصول تھا کہ کوئی بھی باہر کا آدمی فلم سیٹ پر نہیں آسکتا تھا۔ فلمستان میں بھی یہ روایت قائم رکھی گئی۔ جب اُنہوں نے ایک اجنبی کو سیٹ پر دیکھا تو وہ کافی برہم ہوئے اور ڈائرکٹر نتن بوس سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے تو اُس نے بتایا کہ یہ اُسکا بھانجا ہے۔ میں نے یہ سن کر اُسے سیٹ پر رہنے کی اجازت دے دی۔ یہ لڑکا کوئی اور نہیں بلکہ ستیہ جیت رائے تھا جس نے اس واقعے کے ٹھیک تین سال بعد ایک فلم بنائی جاسکا نام ''پاتھر پنچالی'' تھا جس نے اُسے بین الاقوامی شہرت دلادی۔

اشوک کمار کی مقبولیت دن بہ دن بڑھتی چلی جارہی تھی۔ وہ جہاں سے بھی گزرتے تھے لوگ اُن پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے تھے۔ اگر کبھی ٹریفک سگنل پر دادامنی کی گاڑی رکتی تھی تو سارا ٹریفک رک جاتا تھا۔ پولیس کو بھیڑ ہٹانے کے لئے لاٹھی چارج کرنا پڑتا تھا۔ دادامنی کو اپنے چاہنے والوں سے ڈر لگتا تھا۔ وہ اپنے پرستاروں کے ساتھ بڑی رکھائی سے پیش آتے تھے۔ دادامنی کو لگتا تھا جیسے اُسکے چاہنے والے اُسے گالیاں دے رہے ہوں۔ سعادت حسن منٹو اشوک کمار کے بہت ہی عزیز ترین دوست تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے دادامنی کو کئی بار سمجھایا کہ وہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ اس طرح رکھائی سے پیش نہ آیا کریں۔ وہ اسے چاہتے ہیں اسلئے اسکے قریب آکر اُسکی جھلک پانا چاہتے ہیں۔ میری نصیحت کا دادامنی پر کوئی خاصا اثر نہ ہوا۔ اُنکا وطیرہ ویسا ہی رہا۔ وہ اپنی خو بو بدلنے کے لئے تیار نہ تھے۔

اشوک کمار کی ہر طرف طوطی بول رہی تھی۔۔ اُنہوں نے بمل رائے کو بلا کر اُن سے ''پرنیتا'' بنانے کے لئے کہا۔ سارے لوازمات پورے ہونے کے بعد بمل دا ''پرنیتا'' پر کام کرنے لگے۔ ایک دن اُنہوں نے دادامنی سے کہا کہ وہ کچھ سین کلکتہ میں شوٹ کرنا چاہتے ہیں تو دادامنی نے اُسے وہ سین شوٹ کرنے کی اجازت دی۔ بمل دا اشوک کمار جی کا یونٹ لے کر کلکتہ نکل گئے۔ پتا چلا کہ وہ وہاں پر اپنی فلم ''دو بیگھہ زمین'' شوٹ کر کے آگئے۔ اشوک کمار کو جب یہ معلوم پڑ گیا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ بمل دا نے آکر دادامنی سے معافی مانگی اور اُنہیں یقین دلایا کہ وہ بس ''پرنیتا'' شروع کردیں گے اور اسے ایک زبردست فلم بنائیں گے۔ دادامنی نے کہا کہ تم مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ پہلے ''پرنیتا'' ریلیز ہوگی اُسکے بعد ''دو بیگھہ زمین''۔ بمل دا نے وعدہ خلافی کی اور اپنی فلم پہلے ریلیز کی۔ ''پرنیتا'' 1953 میں ریلیز ہوئی اسمیں اُن کے مدمقابل مینا کماری تھی جو اپنے زمانے کی بہترین اداکارہ مانی جاتی تھی۔ ''پرنیتا'' اشوک کمار اور مینا کماری کی زندگی کی سب سے بہترین فلم مانی جاتی ہے۔ دادامنی نے مینا کماری کے ساتھ بیس فلمیں کیں۔

اپنا پروڈکشن ہاوس فلمستان بنانے کے باوجود وہ بمبئی ٹاکیز وہ کبھی نہیں بھولے۔ جب بمبئی ٹاکیز پر زوال کے بادل منڈلانے لگے تو اشوک کمار نے اسے خریدنے کا فیصلہ کیا۔ اسے خریدنے کے لئے اُنہیں چھبیس لاکھ ادا کرنے تھے۔ اس رقم کو چکانے کے لئے وہ مسلسل فلمیں بناتے گئے جو قسمت سے چل بھی پڑیں اور اس طرح اُنہوں نے اپنا دیرینہ خواب پورا کیا۔ اُسکے بعد آئی اُن کی ذاتی فلم ''چلتی کا نام گاڑی''، جسمیں تینوں بھائی ایک ساتھ پہلی بار

کام کررہے تھے۔ یہ فلم 1958 میں ریلیز ہوئی اور اسنے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ اشوک کمار اپنے بھائی بہنوں کو جنون کی حد تک چاہتے تھے۔ کشور کمار تب چھوٹ پنے میں تھا جب اشوک کمار ایکٹر بن چکا تھا۔ اشوک کمار دونوں بھائیوں کو فلموں میں لے آئے۔ کشور کمار ایکٹنگ سے دور دور بھاگتا تھا۔ ایک بار اشوک کمار کے کہنے پر اُسے ایک چھوٹا موٹا رول دیا گیا۔ شوٹنگ سے پہلے وہ ڈریس پہن کے کھڑا رہا۔ جونہی کیمرہ چلا وہ ایسے غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اتنا وہ ایکٹنگ سے خائف تھا۔ اسی سال اشوک کمار کی ایک اور فلم بھی ریلیز ہوئی جس کا نام ''ہوڑہ برج'' تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ان دونوں فلموں کی ہیروئن مدھو بالا تھی جس نے غضب ڈھایا تھا۔

اشوک کمار نے انڈسٹری کو کئی اداکار دئے جن میں دیوآنند، پران اور کشور کمار کے نام اہم ہیں۔ دیوآنند دو تین فلمیں کر چکا تھا مگر اُسے کوئی خاص کامیابی نہ ملی تھی۔ جب اشوک کمار نے اُسے اپنی فلم ''ضدی'' میں کاسٹ کیا تو دیوآنند راتوں رات اسٹار بن گیا۔ وہ اس احسان کو زندگی بھر نہیں بھولا۔ اسی طرح جب پران لاہور سے اُجڑ کے آیا تو بمبئی میں کسی نے اُسے پوچھا نہیں۔ یہ منٹو تھے جو اُسے اشوک کمار کے پاس لے آئے۔ اشوک کمار نے اُسے اپنی نگرانی میں بننے والی فلم ''ضدی'' میں ولین کے طور پر سائن کیا۔ پران صاحب کی تقدیر بھی اس فلم سے بدل گئی۔ اشوک کمار ہر ایک کی مدد کرتے تھے۔ دلیپ صاحب جب نئے نئے آئے تھے تو دیوکارانی نے اُنہیں ''جوار بھاٹا'' کے لئے سائن کیا تھا۔ دادامنی تو بمبئی ٹاکیز کے روح رواں تھے۔ اُنکی دلیپ صاحب کے ساتھ دوستی ہوگئی۔ اُن دنوں دلیپ صاحب کے پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ دادامنی اُنہیں اپنی گاڑی میں اسٹوڈیو لاتے اور لے جاتے تھے۔ وہ احترام سے دادامنی کو اشوک بھیا کہہ کر بلاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم اُنکا انٹرویو کر رہے تھے تو بولتے بولتے اُن کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ دلیپ صاحب اُٹھے اور اپنی جیب سے رومال نکال کر اُنکا منہ پونچھنے لگے۔ ایسا گہرا رشتہ تھا اُن دونوں کے بیچ۔ یہ رشتہ مرتے دم تک قائم رہا۔

دادامنی بڑے ہی سخی اور رحمدل انسان تھے۔ اُنکے سیکرٹری خورشید بھائی برسوں انکے ساتھ کام کرتے رہے۔ اُنہوں نے خورشید بھائی کو اپنے ہی بنگلے کے صحن میں ایک کاٹیج بنا کے دیا جو اُنہوں نے قانونی طور پر اُسکے نام کر دیا۔ آج وہ اُسی کاٹیج میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہ رہا ہے۔ دادامنی نے واقعی حاتم کا دل پایا تھا وہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

منٹو صاحب لکھتے ہیں کہ 1948 تک میرے بمبئی چھوڑنے سے قبل دادامنی پیار کے نرم و نازک ولذیذ احساس سے بے بہرہ تھے۔ پیار جیسا لفظ اُنکی ڈکشنری میں تھا ہی نہیں۔ دادا کی زندگی میں ہزاروں لڑکیوں نے قریب آنے کی کوشش کی مگر دادامنی نے کسی ایک کو قریب آنے نہ دیا۔ دیوکارانی نے اُس سے جسمانی رشتہ بنانے کی کوشش کی۔ دادامنی نے نے اُسے دھتکار دیا۔ اسی طرح ایک اور ہیروئن نے ہمت کر کے اُسے ایک دن اپنے گھر پر مدعو کیا۔ جب وہ وہاں پہونچا تو اُس ہیروئن نے اُسے شیشے میں اُتارنے کی کوشش کی۔ دادامنی اُسکی ان حرکتوں سے اسقدر برہم ہو گئے کہ وہ اُس ہیروئن پر ایسے برس پڑے کہ اُسکے لئے اپنا بچاؤ کرنا مشکل ہو گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ دادامنی اس ہیروئن کو پسند کرتے تھے مگر بقول دادامنی کے اُسکے چہرے سے ہمیشہ وحشت برستی رہتی تھی جو اُسے پسند نہ تھی۔ جب اُس ہیروئن نے دیکھا کہ بات بگڑ چکی ہے تو اُس نے فوراً پینترا بدلا اور اشوک کمار سے کہا کہ وہ اُسے آزمانا چاہتی تھی جب کہ وہ اُسے ایک بڑے بھائی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بھائی کا خطاب پا کر اشوک کمار تلملا اُٹھے ورنہ وہ وہاں سے خفا ہو کے چلے گئے۔

اشوک کمار ایک پیشہ ور عاشق نہیں تھا۔ گو کہ وہ بھی عام مردوں کی طرح عورت کو پسند کرتا تھا مگر اُنہیں کیسے اور کب پٹانا چاہئے یہ ادائیں وہ نہیں جانتا تھا۔ کچھ عورتیں اُسے پسند تھیں مگر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا اُسمیں یارا نہ تھا۔ پیار محبت کے معاملے میں مرد کو ہمیشہ پہل کرنی پڑتی ہے جب کہ وہ چاہتا تھا کہ یہ کام عورت ہی کرے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا تھا۔ ''یار منٹو مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں کسی عورت کے سامنے جا کر اُس سے پیار کا اظہار کروں۔'' یہی سچ تھا۔ اس معاملے میں وہ بڑا ڈرپوک اور بزدل تھا۔ ایک طرح سے اُسکی شادی شدہ زندگی کے لئے اور شوبھا بھابی کے لئے یہ اچھا ہی ہوا۔ یاد رہے کہ اُنکی شادی شوبھا دیوی سے ہوئی تھی۔ فلم فیئر میں دئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں دادامنی نے کہا کہ جب اُنکی ماں کو پتا چلا کہ میں فلموں میں کام کرنے لگا ہوں تو اُنہوں نے مجھ سے پوچھے بنا میری شادی طے کر دی تا کہ میں غلط عورتوں کی سنگت میں نہ پڑ جاوں۔ مجھے ماں کا حکم ماننا پڑا۔ میری شادی ہوگئی شوبھا سے۔ سہاگ رات کو پہلی بار میں نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ ماں نے جس ارادے سے میری شادی کروائی تھی اُسکا نتیجہ اُلٹا ہی نکلا۔ میں تو نہیں بگڑا البتہ شوبھا بہت جلد غلط سنگت میں پڑ گئی۔ اُسے شراب نوشی کی لت لگ گئی۔ میں جب رات کو کام سے لوٹتا تھا تو وہ نشے میں دھت ہوتی تھی۔ وہ ڈھنگ سے بات نہیں کر پاتی۔ اُن دنوں میں ملاڈ میں رہتا تھا۔ شوبھا سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے چمبور میں ایک پلاٹ خرید لیا اور اُس پر قسطوں میں گھر بنانا شروع کیا۔ جب میں اس بنگلے میں منتقل ہوا تو کچھ مہینوں کے بعد شوبھا بھی یہاں چلی آئی۔ اُسنے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اب شراب نہیں پیئے گی مگر وہ اپنے وعدے پر زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ حالات ایسے ہو گئے کہ ہم ایک ہی مکان میں الگ الگ رہنے لگے۔ پچاس سال تک میں اس رشتے کو چپ چاپ نبھاتا رہا۔ اس سے پہلے کہ ہم گولڈن جوبلی مناپاتے شوبھا کو اسپتال میں بھرتی کرانا پڑا۔ میں جب اُسے دیکھنے گیا تو اُسکی آنکھیں ادھ کھلی تھیں جو نہ پوری طرح کھل پا رہی تھیں اور نہ ہی بند ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے تو اُسنے مجھے بتایا کہ جس کی کوئی خواہش ادھوری رہ گئی ہو اُسکی آنکھیں ایسے ہی ادھ کھلی رہتی ہیں۔ میں نے اُسکی پیشانی کو چوما اور اُسکے بعد میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اُسکی آنکھیں نہ صرف بند ہوئیں بلکہ اُسنے آخری سانس بھی چھوڑ دی وہ بھی شادی کی گولڈن جوبلی سے دو دن پہلے۔ شوبھا دیوی سے اُنکے تین بچے ہوئے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔

منٹو لکھتے ہیں کہ اشوک جیوتش ودیا میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ یہ ہنر اُسنے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ جب بھی اُسے موقع ملتا تھا وہ اپنے دوستوں کی جنم کنڈلیاں دیکھتا تھا اور اُنہیں قسمت کا حال احوال بتا دیتا تھا۔ ایک روز اُسنے مجھ سے میرے جنم دن کی تاریخ پوچھی۔ اُسکے بعد اُسنے کاغذ پر کچھ لکیریں کھینچیں اور پھر مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے شادی کی ہے۔ میں نے کہا کہ تم تو جانتے ہو کہ میں شادی شدہ ہوں پھر بھی پوچھ رہے ہو۔ اُسنے کہا کہ وہ گرہوں کے حساب سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اُس کے بعد اُس نے کہا کہ تمہارا کوئی بچہ نہیں ہے اور ستاروں کی رو سے تمہارا جو پہلا بچہ ہوگا وہ زیادہ دن تک جی نہیں پائے گا۔ اشوک یہ بات نہیں جانتا تھا کہ ہمارا پہلا بچہ ایک سال سے زیادہ جی نہیں پایا تھا۔ اشوک جیوتش ودیا کو کافی مانتا تھا۔ اُسے ریس کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ گھوڑوں پر علم نجوم کے حساب سے پیسے لگاتا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ سو روپے سے زیادہ نہیں لگاتا تھا اور وہ ہمیشہ دس بیس روپے جیت لیتا تھا۔ وہ کبھی ریس میں نہیں ہارا تھا۔ وہ اپنی بیوی شوبھا کے ساتھ ریس کورس پہنچ جاتا تھا اور اُسی کے ہاتھوں ایسے گھوڑوں پر پیسہ لگواتا تھا جن پر بہت کم لوگ داؤ کھیلتے تھے۔ بعد میں جیتی ہوئی رقم لینے کے لئے وہ اپنی بیوی کو ہی کھڑکی پر کھڑا کر دیتا تھا۔

اشوک کمار کا پورا گروپ بمبئی ٹاکیز سے الگ ہو چکا تھا۔ ایک دن ساوک صبح صبح میرے گھر پر آکے مجھ سے کہنے لگا۔ ''یار سعادت۔ گنگولی کے لئے ایک کہانی لکھو۔ میں اُسکی بات سمجھ نہیں پایا۔ میں بمبئی ٹاکیز کا ملازم تھا اور اُن کے لئے ہی کہانیاں لکھ رہا تھا۔ مجھے واچا کی سفارش کی ضرورت نہیں تھی کہ میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ بمبئی ٹاکیز کے کسی ذمہ دار شخص نے مجھ سے اس طرح کوئی کہانی لکھنے کے لئے کہا ہوتا تو میں فوراً اُس پر عمل کرتا۔ واچا کون ہوتا ہے مجھے حکم دینے ولا۔ بعد میں یہ بات صاف ہوگئی کہ کہانی اشوک کمار کو درکار تھی۔ وہ اپنے نام سے فلم پرڈیوس کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ایک ایسی کہانی لکھوں جو لاجواب ہو۔ ہم سب لوگ واچا کی بھتیجی کے فلیٹ پر جمع ہوگئے۔ میں نے اشوک سے پوچھا کہ وہ کس طرح کی کہانی چاہتا ہے۔ وہ بولا مجھے خود نہیں معلوم ۔بس اتنا ہی میں جانتا ہوں کہ کہانی کچھ سنسنی خیز قسم کی ہو۔ یاد رکھنا کہ میں پہلی بار پرڈیوسر بن رہا ہوں۔ میں نے خوب سر کھپایا۔ کئی خیال میرے ذہن آتے رہے اور جاتے رہے۔ جس طرح کی کہانی اشوک چاہتا تھا وہ بن نہیں پا رہی تھی۔ ساوک واچا نے شام کو جب بوتل کا منہ کھولا اور ہم نے برانڈی کے دو دو پیگ اندر ڈال دئے تو میرا تخیل زقند مارنے لگا۔ میں نے کئی آئیڈیا اشوک کو سنائے مگر بات بنی نہیں۔ اسی طرح کئی روز گزر گئے۔

ایک روز میں ایک کہانی کا خاکہ تیار کر کے اشوک کو سنانے گیا۔ اُسے کہانی پسند آگئی مگر اس کہانی کا جو اینڈ تھا وہ المیہ تھا جو اُسے پسند نہ تھا۔ اُسنے مجھے کلائمکس بدلنے کے لئے کہا۔ فلم کا نام ''آٹھ دن'' تھا۔ اسمیں اشوک کے علاوہ راجہ مہدی علی خان، اُپندر ناتھ اشک اور محسن عبداللہ تھے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کی جانکاری ہوگی کہ اس فلم کی ڈائرکشن اشوک کمار نے کی تھی۔ وہ ایک عمدہ ایکٹر کے ساتھ ایک ذہین ڈائرکٹر بھی تھا۔ یہ فلمستان کی پہلی فلم تھی۔ جسطرح بمبئی ٹاکیز میں یہ روایت رہی تھی کہ جب فلم مکمل ہوتی تھی تو یونٹ میں ہی کسی ایک ٹیکنیشن کا نام بطور ہدایت کار دیا جاتا تھا یہی روایت فلمستان میں بھی دہرائی گئی۔ یہ فلم تو اشوک کمار کی محنت کا ثمرہ تھا مگر نام ڈی این پائی کا دیا گیا جو کہ ایک قابل ایڈیٹر تھا۔ یہ فلم ایک بھرپور کامیڈی تھی۔ فلم بینوں نے اس فلم کو بیحد پسند کیا۔ میں اور اشوک فلم کی کامیابی سے بیحد خوش تھے۔ اس فلم کے بارے میں میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ اس فلم میں ایک اہم کردار تھا جو کہ اشوک کے جیجا اور جانے مانے فلمساز ایس مکھرجی کے لئے لکھا گیا تھا۔ عین وقت پر مکھرجی صاحب مکر گئے۔ اُن کے انکار کی وجہ سے شوٹنگ کئی روز تک ملتوی رہی۔ ایک دن کی بات ہے کہ میں آفس میں بیٹھا اسکرپٹ پر کام کر رہا تھا کہ اشوک میرے پاس آیا اور مجھے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ مجھے لگا کہ شاید وہ مجھے تازہ ریکارڈ کیا ہوا گانا سنانا چاہتا ہے۔ جب مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ مجھ سے ایک رول کروانا چاہتا ہے تو میں نے ہڑبڑا کر اشوک سے کہا۔ ''پاگل ہوگئے ہو کیا۔ میں اور ایکٹنگ۔ ناممکن'' اشوک تو ٹھان کے بیٹھا تھا کہ یہ رول میں ہی ادا کروں گا۔ اشوک کی ضد کے آگے میری ایک نہ چلی۔ جتنی دیر میں کیمرہ کے سامنے رہا، میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ پر کسقدر ہیبت طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مجھے کسی بھوکے شیر کے آگے ڈال دیا گیا ہو۔

ملک میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ ایکدن کی بات ہے کہ ہم بمبئی ٹاکیز سے گھر لوٹ رہے تھے۔ میں بہت دیر تک اشوک کے گھر پر رکا۔ جب شام ہوئی تو اشوک نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے گھر پر چھوڑ کے آئے گا۔ اُسنے ایک مسلم اکثریت والے محلے سے شاٹ کٹ مارا جہاں کوئی بھی ہندو جانے سے احتراز کرتا تھا۔ ہماری بدبختی دیکھئے کہ سامنے سے ایک بارات ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے جب لوگوں کا ہجوم دیکھا تو میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہوا اُٹھا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ ایک ہندو ہے۔ اگر اسے قتل کیا گیا تو ایک طوفان کھڑا ہوگا۔ میں من ہی من میں اپنے مولا سے یہ دعا مانگنے لگا کہ اے میرے مولا آج میری لاج رکھنا۔ اگر اشوک کو کچھ ہوگیا تو پوری ہندو قوم مجھے کوستی رہے گی۔ میں اتنا بڑا الزام اپنے ساتھ قبر میں لے کر نہیں جا پاؤں گا۔ اتنے میں لوگ ہماری کار کے قریب پہونچ گئے۔ کسی باراتی کی نظر اشوک کمار پر پڑی۔ بس پھر کیا تھا، لوگ اشوک کمار کی جھلک دیکھنے کے لئے اک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ تبھی ایک لڑکے نے اشوک کمار سے کہا۔ ''اشوک بھیا آپ غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ آپ اس گلی میں گھس جایئے۔ یہ آپ کو مین روڈ پر لے جائے گی۔'' میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان نوجوانوں کو دیکھ رہا تھا جو اشوک کمار کو بھیا کہہ کے بلا رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر وہ اشوک بھیا ہے تو پھر میں کون ہوں؟ ہم جب گلی سے باہر آگئے تو میری جان میں جان آگئی۔ اشوک اطمینان سے بیٹھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کے ہنسا

اور پھر بولا۔تم میرے لئے پریشان تھے نا؟ لوگ آرٹسٹوں کو تنگ نہیں کرتے۔''

1960 کے بعد اشوک کمار نے ہیرو کا رول چھوڑ کے کیرکٹر رول کرنے شروع کر دئے۔پہلی فلم جس میں اُسنے کیرکٹر رول کیا تھا وہ تھی بی۔آر۔ چوپڑہ کی ''قانون''۔یہ فلم پوری کی پوری اسکے گرد گھومتی تھی مگر اسمیں رومانٹک رول راجندر کمار نے ادا کیا تھا۔اس فلم کی کامیابی کے بعد دادامنی کے پیچھے پرڈیوسروں کی لائن لگ گئی۔اُنہوں نے بڑے بھائی، باپ، شوہر یا دوست کا رول اتنی خوبی اور سچائی سے نبھائے کہ فلم بین اُسکی اداکاری دیکھ کر عش عش کر اُٹھے۔دادامنی نے سینکڑوں فلمیں کیں۔ان میں سے بیشتر فلمیں کامیاب رہیں۔جب بمل رائے ''بندنی'' بنانے جارہے تھے تو اُنہوں نے نوتن کو مرکزی کردار کے لئے سائن کیا۔نوتن نے بمل رائے سے کہا کہ وہ دادامنی کو اُنکے مدمقابل سائن کریں۔جب بمل رائے دادامنی کو سائن کرنے گئے تو دادامنی بمل رائے سے اس حد تک ناراض تھے کہ اُنہوں نے بمل دا کو گھر سے فوراً باہر جانے کے لئے کہا۔وہ پچھلے گلے شکوے اب تک بھولے نہیں تھے۔بہرحال رشتہ داروں اور خیرخواہوں کی مدد سے اشوک کمار کو منایا گیا اور اُنہوں نے بمل رائے کے ساتھ فلم میں کام کیا۔اس فلم نے نہ صرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے بلکہ اسے کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

دادامنی کے دونوں چھوٹے بھائی اُس سے پہلے چلے گئے۔کشور کمار کے جانے سے اُنہیں اتنا گہرا صدمہ لگا کہ اُنکے جانے کے بعد دادامنی نے پھر کبھی اپنا جنم دن نہیں منایا۔شوبھا کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلے ایک نرس کے ساتھ رہتے تھے۔وہ دمہ کے مریض تھے پھر بھی سگریٹ نوشی سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔اُنکے بچے اور خیرخواہ ہر روز اُنکا حال چال پوچھنے آجایا کرتے تھے۔ایک دن اُنہوں نے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا۔''یہ لو۔یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے۔اب اس پیسے کو تم اپنے رشتہ داروں میں بانٹو یا اپنے دوستوں میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس جب تک میں زندہ ہوں، میرے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔

دادامنی ایک بھرپور زندگی جئے۔انڈسٹری نے اُنہیں ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا۔اُنہوں نے اپنی زندگی کے پینسٹھ سال فل انڈسٹری کو دئے۔ اُنہیں بے شمار اعزازات سے نوازا گیا۔وہ صحیح معنوں میں ایک صدا بہار ہیرو تھے۔1988 میں اُنہیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا اور 1998 میں پدم بھوشن سے۔اُنکی بڑی بیٹی روپا نے کاڈین دیون ورما سے شادی کی تھی جس کا حال ہی میں دیہانت ہوا۔اُنکی چھوٹی بیٹی پریتی گنگولی نے کئی فلموں میں ایکٹنگ کی۔اُسکے بعد وہ اشوک کمار ایکٹنگ اسکول چلاتی رہیں۔اُنکا بیٹا ارون گنگولی ایک دو فلموں میں آیا فلموں میں وہ کامیاب نہ رہا اسلئے اُسنے پھر کبھی فلموں میں کام کرنے کی کوشش نہیں کی بہت کم لوگوں کو اس بات کی جانکاری ہوگی کہ دادامنی ہیمو پیتھک کے ماہر ڈاکٹر تھے۔اُنہوں نے بہت سارے مریضوں کو اپنے ہیمو پیتھک علاج سے ٹھیک کیا۔دادامنی اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن ٹلنی جیونت کو بیحد چاہتے تھے۔یہ بیل دادامنی کی بزدلی کی وجہ سے منڈھے نہیں چڑھ پائی اور دونوں ساری زندگی ایک دوسرے کے لئے تڑپتے رہے۔

10 دسمبر 2001 کو دادامنی نے نوے سال کی عمر میں اس دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہا۔وہ جسمانی طور پر آج ہمارے ساتھ نہیں ہیں مگر جب تک فلمیں ہیں دادامنی اشوک کمار ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔

- بقیہ -

''منظر نگاری کا حاصل''

بڑے شاعروں نے یہ بھی گلہ کیا ہے کہ میرا شعر مدرسہ کیوں گیا؟ دراصل مدرسے کی قیل وقال ہی شعر کو آب حیات پلاتی ہے۔اچھا شعر عوام کے ذریعے مدرسہ پہنچ کر خواص کا دل نشین ہو جاتا ہے۔منظر کے کئی اشعار اردو شعری دستاویز میں محفوظ ہو کر عوام وخواص کو محظوظ کرتے رہیں گے۔

اس مختصر سی تجلیلی اور تحلیلی تحریر کے آخیر میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس ایک گلشن کے گوشے میں جو منظر نے گلزار سجائیں ہیں اور ہمیں دعوت دیتے ہیں کہ تمام گلستان یعنی ان کے تمام تر کلام کا مطالعہ کیا جائے۔وہ ایک من علم سے سو من تخلیق کا کام کرتے ہیں اور یہی فطری شاعر کی فطرت اور شناخت ہے جبکہ اکتسابی شاعر سو من علم سے ایک من تخلیق بھی کر نہیں پاتا۔سچ ہے:

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ
این سعادت بزور بازو نیست

ہم اس نامکمل مضمون کو منظر کی سوچ کے جدید تجربے پر تکمیل کرتے ہیں:

میں تجھ کو چاند کہہ دوں — لیکن یہ سوچتا ہوں
بے داغ روپ تیرا — میں داغ کیوں لگاؤں
میں تجھ کو خواب کہہ دوں — لیکن یہ سوچتا ہوں
تو زندگی کا سچ ہے — میں جھوٹ کیوں بناؤں
کہہ دوں میں تجھ کو خوشبو — لیکن یہ سوچتا ہوں
تو ساتھ عمر بھر کا — پل بھر میں کیوں گنواؤں
میں تجھ کو شمع کہہ دوں — لیکن یہ سوچتا ہوں
پروانہ بن کے تیرا — میں کیوں تجھے جلاؤں
تجھ کو شراب کہہ دوں — لیکن یہ سوچتا ہوں
تجھ کو نشہ بنا کر — رندوں میں کیسے لاؤں

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

☆

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

جناب گلزار جاوید، سلام و نیاز۔

چہارسو کا تازہ شمارہ جس میں میرے متعلق گوشہ شامل ہے، نظر سے گذرا۔ گوشے کی ترتیب میں آپ نے جس محبت اور دلچسپی سے کام لیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ اس کرم فرمائی کے لیے میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ میری نیک خواہشات قبول فرمایئے۔

منیب الرحمٰن (امریکہ)

بھائی جان گلزار جاوید، آداب۔

آج ای میل سے ''چہارسو'' کا نیا شمارہ پہنچ گیا، شکریہ۔ منیب الرحمٰن صاحب کا حق تھا کہ ان کو قرطاس اعزاز آج سے برسوں پہلے ہی دیا جاتا لیکن دیر آید درست آید۔ اب فون بھی نہیں سن سکتے، لیکن ہم سب کو یہاں امریکہ میں بہت خوشی ہوئی کہ دیر سے ہی سہی حق بہ حقدار رسد۔ آپ کو بھی یہ فرض ادا کرنے کی مبارکباد۔

ستیہ پال آنند (امریکہ)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

منیب الرحمان کے گوشے والا ''چہارسو'' ملا۔ اس دریافت سے بہت لطف آیا کہ منیب الرحمان پر لکھنے والوں نے محترمہ زیبا کے ذکر کا التزام ملحوظِ خاطر رکھا۔ منیب الرحمان ن صاحب کی آنکھوں کو آپ کے فوٹو گرافر آرٹسٹ نے بند کر رکھا ہے۔ یا خود انہوں نے ہم کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھا۔ مجھ کو درگزر کر دیجئے لیکن شمس الرحمان فاروقی اور بیدار بخت سے کیسی بے رخی۔ اور ہاں بیدار بخت تو وہ ہیں جن کا میں ان دنوں فون کھڑکھڑاتا ہوں جب اپنے بخت بیدار کرنا اشد ضروری ہو جاتا ہے۔ نسیم سحر سے میں اختلاف کروں گا ایک ہی تحریر ایک سے زائد پرچوں میں چھاپی جائے تو برا نہیں۔ آپ اسے مکرر نہ پڑھیں آپ کا مسئلہ ختم۔ احمد ندیم قاسمی (مرحوم) کا موقف یہ تھا کہ اسے مسئلہ نہ بنایا جائے۔ مجھ ہیچ مایہ کا بھی یہی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر ادبی مجلّے کا حلقہء قارئین ایک ہی ہو۔ شہناز خانم عابدی آپ کو سلام بھجوا رہی ہیں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

گلزار بھائی جیتے رہیے، خوش رہیے۔

وقت شام جانے کیوں دل کو مٹھی میں بھینچ کر مسلنے لگتا ہے۔ پتہ نہیں یہ صرف میرا احساس ہے یا شام کا وقت ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ کراچی شہر گھروں کے اندر لان اور صحنوں کی کمی شاید اداسی پھیلاتی ہے اور ذرا سوچیے ایسے سمے میرے جیسا بندہ کمرے میں بیٹھا ہو اور چہارسو کے مطالعہ میں مصروف ہو اور منیب الرحمٰن صاحب کی دل گداز شاعری پڑھ رہا ہو۔ ان کے بیتے دنوں کو کھوج رہا ہو تو دل اداسیوں کے جنگل میں نہیں بھٹکے گا تو کیا ہوگا؟

بیدار بخت صاحب کہتے ہیں ''منیب صاحب شاعری سے باہر کی دنیا میں بھی ایک دلکش اور پراثر جزیرہ ہیں جو منکشف نہیں ہوتا مگر جن پر عیاں ہو جاتا ہے اُن کی زندگی کو محبت اور علم کی زندگی سے مالا مال کر دیتا ہے۔'' گلزار جاوید آپ بھی ایک ایسا ہی جزیرہ لگتے ہیں جو اپنے انکشافات معدنیات کے ذخیرے سے ہر دو ماہ بعد چہارسو کے اوراق پر پیش کرتے ہیں۔ کہاں سے لاتے ہیں یہ علم و ادب کے خزانے؟ آپ کی جستجو اور تلاش کو سلام۔

چہارسو ابھی تمام نہیں کیا تین افسانے خوبصورت معنی خیز اور دلچسپ ''خواہش'' نیّر اقبال علوی ''معدوم'' شاہد جمیل اور ''مجھے ماروی نے مار ڈالا'' کے علاوہ ''ہوا کے دوش پر'' فیروز عالم صاحب کا سفرِ میراث سب سے پہلے پڑھا۔ سلمیٰ اعوان کا ''عراق جل رہا ہے'' بات ہے اُن کے منفرد انداز کی۔

عذرا اصغر (کراچی)

محترم گلزار صاحب، سلام و دعا۔

چہارسو کا برقی ایڈیشن تو اپریل کے وسط میں مل گیا تھا۔ اس وقت میں ہندوستان کے دورے پر تھا اس لیے زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ اب چھپا ہوا رسالہ دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے قرطاس اعزاز منیب الرحمٰن کے نام کر کے ہم سب اردو والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس شمارے کے صفحہ ۱۰۸ پر ناصر عباس نیّر صاحب کا مختصر تبصرہ/مضمون/انشائیہ ''غاشیہ'' پسند آیا لیکن انگریزی لفظ Archetype کو اردو میں پڑھنے میں دقت ہوئی۔ انگریزی اردو لغت میں یہ لفظ موجود نہیں ہے حالانکہ ہونا چاہیے۔ میری دانست میں اگر کسی اور زبان کے لفظ کا متبادل اردو زبان میں موجود نہ ہو تو پھر بریکٹ میں وہ لفظ اُسی زبان میں لکھ دینا چاہیے اور اگر متبادل لفظ موجود ہو پھر بھی انگریزی لفظ بریکٹ میں لکھ دینا ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ اردو زبان میں سمو جائیں گے اور پھر بریکٹ میں لکھنے کی ضرورت بھی ختم ہو جائے گی۔ غور کیجیے گراج، لاؤڈ سپیکر، ڈپٹی کمشنر، پولیس، روڈ، گیٹ وغیرہ اب اردو زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔

امجد حسین (امریکہ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (مئی، جون ۲۰۱۴ء) نظر نواز ہوا۔ شکریہ! آپ یقیناً اردو ادب کے محسن ٹھہرائے جائیں گے کہ تلاش و جستجو کے بعد ''چہارسو'' کے قارئین کو بالخصوص اور اردو ادب کے قاری کو بالعموم شعر و ادب کی اُن عظیم شخصیتوں سے شان کے ساتھ متعارف کرواتے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے گوشۂ گمنامی

کی چادر اوڑھے کہیں پڑے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ ''قرطاسِ اعزاز'' ڈاکٹر منیب الرحمٰن الرحمٰن کے نام دیکھ کر حیرت و مسرت کے جذبات سے دوچار ہوا۔ اردو نظم کو جدید رجحانات سے متعارف کروانے والے یہ ڈاکٹر صاحب آج اگر امریکہ میں گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں تو اس میں کس کا قصور ہے؟ ''براہِ راست'' میں ان کے جوابات سے کئی ادبی انکشافات ہوئے ہیں جنہیں محفوظ کیا جانا چاہیے۔ ان کی نظموں میں ایک دردناک ''سانحہ'' پسند آئی ''آرزوؤں کو سنبھل جانے دو'' پر ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کا تجزیہ سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بقیہ زندگی صحت مند عطا کرے۔ آمین! نیلم احمد بشیر کا مختصر ترین افسانہ ''فرق'' بہت پسند آیا۔ نجیب عمر ''خوابِ غفلت'' میں اداکاری کے فن پر اچھی دلیل دی ہے۔

غالب عرفان (کراچی)

گلزار بھائی، آداب۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ''براہِ راست'' چہارسو کا ایک اہم مضمون ہے۔ اس کے متن کے ذریعے اہم تخلیق کاروں سے فکری ملاقات ہو جاتی ہے۔ مزید یہ کہ ان کی تخلیقات کا فکری پس منظر کیا ہے، کون سے مشاہدے اور تجربے کارفرما ہیں، ان سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ منیب صاحب سے تفصیلی ملاقات کرانے کا بہت شکریہ۔ ایک ہی ملک میں رہنے کے باوجود ہنوز ان سے بالمشافہ ملاقات سے محرومی ہے۔ ان کی شخصیت و فن کے کئی پرت بیدار بخت، ولی عالم شاہین اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحبان نے اتارے ہیں۔ ٹورنٹو میں محمد عمر میمن صاحب کے ساتھ ایک شام میں مجھے اور بیدار بخت دونوں کو مضمون پڑھنا تھا مگر وہ کسی مصروفیت کی بنا پر شریک نہ ہو سکے یوں اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ ان کی عمومی مزاج کے خلاف بہت مختصر افسانہ ہے۔ یہ ان کی فنی پختگی کا ثبوت ہے کہ وہ بنت میں تجربے کرنے سے نہیں گھبراتیں۔ بظاہر کسی ''سامنے کی بات'' کے پس پردہ جھانک لینا ہی انہیں ایک اچھا افسانہ نگار بناتا ہے۔ شہناز خانم عابدی کا افسانہ ایک آوارد نہیں بلکہ زندگی کی حقیقت سے قریب ایک کہانی ہے۔ روزانہ کی زندگی میں جو بات انہیں غیر معمولی محسوس ہوتی ہے اسے کس مہارت کے ساتھ ہمارے ساتھ شریک کیا ہے۔ مراق مرزا کے افسانے کا جلاّد میں اور آپ سب ہی ہیں۔ یہ دعوت فکر ہے کسی فکر کو مصلوب کرنے سے پہلے اس کے سیاق و سباق پر بھی غور کر لیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی آپ بیتی سادہ اور رواں ہے۔ سوچ سمجھ کر بقراطیت ٹھونسنے کی کوئی کوشش نہیں۔ میرے لیے خصوصاً یہ یادوں کا ایک سرمایہ ہے کہ میں بھی اسی کالج میں علم کی دولت سے فیضیاب ہوا۔ سلمیٰ اعوان کا سفرنامہ ''عراق جل رہا ہے'' میرے نزدیک حاصل مطالعہ تھا۔ ان کا انداز بیاں تیکھا ''ماشاء اللہ، مسلمانوں میں غداروں کی کبھی کمی نہیں رہی'' یہاں ماشاء اللہ کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ زبان بہت روزمرہ کی اور بے ساختہ ہے۔ ''خدشات کی گھسن گھریاں'' میں آپ کو کتنی مثالیں دوں، بہتر ہے کہ خود ہی اس سفرنامے سے لطف اٹھائیے۔

سید سعید نقوی (نیویارک)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

لیجیے رسالہ پڑھ لیا۔ سب سے پہلے ''رابطے'' رابطے تنقید کا خزینہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے میری غزل کو پسند کیا۔ دل کی گہرائیوں سے اُن کا شکریہ۔ جناب انتظار باقی نے چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی غزل کو پسند کیا اُن کا بھی شکریہ۔ اسی طرح جناب ابراہیم عدیل صاحب کی غزل پسند آئی۔ شکریہ صد شکریہ۔

افسانے سارے پڑھ لیے، تین افسانے زیادہ پسند آئے ''فرق'' نیلم احمد بشیر، ''خواہش'' نیّر اقبال علوی اور ''تختہ دار پر کھڑا گاندھی'' وغیرہ۔

غزلوں کے تین چار شعر اچھے لگے جو درج ذیل ہیں۔

کیا ہو گئیں جو بستیاں آباد تھیں کبھی؟
سُن کر بھی یہ سوال کھنڈر بولتے ہیں (نسیم سحر)

اِک زمانہ تھا چہکتے تھے در و بام و شجر
ہول آتا ہے اب اِس شہر کی ویرانی پر (اشرف جاوید)

ماں کی دُعا کے صدقے
دُشمن بھی مہرباں ہے (نعیم الدین ظفر)

کاش! دُشمن ہمیں مارتے، کاٹتے
ہم تو اپنوں سے ہی زخم کھانے لگے (خورشید انور رضوی)

نظموں میں تین نظمیں زیادہ پسند آئیں ''جی بھی گئے'' عبد اللہ جاوید، ''نئی تخلیق'' انتظار باقی اور ''یہ سڑک'' فیصل عظیم وغیرہ۔ محترم انور سدید صاحب، ڈاکٹر نے قتیل شفائی کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اب آیئے ''قرطاس اعزاز'' کی طرف۔ یہ آپ کی ہمّت ہے کہ آپ عجوبۂ روزگار ہستیوں کو کہاں کہاں سے تلاش کر لیتے۔ ''براہِ راست'' میں سوالات بھی اچھے ہیں اور ڈاکٹر منیب الرحمٰن نے جواب بھی کافی سوچ سمجھ کر دیئے ہیں۔ جناب فاری شا (لندن) نے ''سُرخ آنکھوں کا تقاضا'' کے تحت ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی نظموں کا اچھا انتخاب دیا ہے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ ''چہارسو'' ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے بارے بہت سی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ میں ان کی نظموں کا تو پہلے سے مداح ہوں مگر ان کی زندگی، احوال و آثار، ادب سے محبت اور فارسی زبان پر دسترس اور فارسی سے محبت کا اب پتہ چلا، اللہ ان کو صحت اور زندگی سے رکھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب چونکہ برصغیر پاک و ہند کا ایک بڑا اور مستند نام ہے اور اُن کا کام بھی اتنا وقیع، جامع اور موثر ہے وہ ہمارے عہد کا اہم ترین نقاد، دانشور اور ادیب کہلانے کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ اللہ انہیں زندگی دے اُنہوں نے اردو کو بہت گراں مایہ تحریروں سے نوازا ہے۔ اُن کا مضمون، بیدار بخت صاحب، ڈاکٹر عروج زیدی صاحب اور امتیاز عالم صاحب کی تحریریں پرچے کے معیار، وقار اور اعتبار کو بڑھا رہی ہیں۔

گردشِ لیل و نہار، اضطراب کا عالم، قلب و جاں کی حفاظت، کیا

انتخابِ کلام اور مرصّع تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں کہ تمام بڑے لکھاری اکٹھے کر لینا اور کہکشاں روشن کر لینا چہارسو کا حصّہ ہے۔ مشکور صاحب، حسن عسکری کاظمی صاحب، انتظار باقی صاحب، تشنہ بریلوی بطور خاص غرضیکہ تمام احباب کی تخلیقات پسند آئیں۔ رس رابطوں میں ڈاکٹر انور سدید صاحب ہمارے محسن ہیں، اُن کی تحریریں پڑھ پڑھ کر ہم نے لکھنا سیکھا ہے۔ اُن کا احسان انہوں نے میرے بارے کلمہ خیر و تحسین ارشاد فرمایا، اکثر پرچوں میں مجھے جونیئر چھاپ دیا جاتا ہے میری طبیعت میں احتجاج نہیں میں نے ۱۹۷۷ء سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا ہے۔ تقریباً ۳۷ برس بنتے ہیں جبکہ ۱۹۹۰ء کے بعد آنے والے لوگوں کو مجھ سے پہلے جگہ دے دی جاتی ہے۔ مگر میں نے اس کا کبھی ملال نہیں کیا میں نے نیرنگ خیال، اوراق، فنون اور نقوش سے آغاز کیا ہے ہمیں احساس ہے کہ اب وہ احتیاط نہیں برتی جاتی جو پہلے پرچوں میں تھی۔ بردارم انتظار نے اشعار پسند کیے اس کے لیے شکر گزار ہوں وہ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اور کلام کو سمجھتے ہیں۔

کرامت بخاری (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ مئی، جون ۲۰۱۴ء ہمیشہ کی طرح باقاعدگی سے ہمدست ہو گیا ہے۔ یہ تو آپ کے دلِ مضطرب، نگاہِ شفیقانہ ہی ہے جس کی بدولت ہمیں اتنا قیمتی نذرانہ عین وقت پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ جناب ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے نام قرطاس اعزاز دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اتنے عظیم فنکار، معتبر اور ہنرمند قلمکار، کہنہ مشق قادرالکلام شاعر کے ساتھ ساتھ علم و ذہانت کا مینار بھی ہیں اور بجا طور پر اس اعزاز کے حقدار ہیں۔ تہِ دل سے ڈاکٹر منیب الرحمٰن اور آپ کو بھی بہت بہت مبارکباد جناب محمد انعام الحق صاحب نے مختصر مگر بخوبی ڈاکٹر منیب الرحمٰن سے روشناس کرایا ہے۔ اس لیے وہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پچھلے چہارسو کے شمارے (مارچ، اپریل ۲۰۱۴ء) میں آپ کی ایک تخلیق ''شبھ چنتک'' دیکھی یہ آپ کے منفرد طرزِ بیان کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ عمدہ درجے کی ہنرمندی کا معیار ہے۔ مجھے تو یہ اب معلوم ہوا کہ آپ مدیر مسوؤل کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی میں بھی یکتا زمانہ ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ کی توانائیوں میں برکت دے تاکہ آئندہ بھی آپ اسی طرح بہترین تخلیقات اپنے قارئین کے لیے لکھ سکیں۔ میں نے بھی ایک پنجابی ہونے کے ناطے آپ کی جا بہ جا ٹھیٹھ پنجابی کا دل کھول کر لطف اُٹھایا۔ جیسے ''گونگلو'' شلجم کو بھی کہتے ہیں۔ سادہ بندے کو ڈب کھڑب سمجھتے ہوئے گونگلو سے ملا دیتے ہیں۔ اب ڈب کھڑب کا مطلب نہ پوچھنا۔ یہ ٹیڑھے میڑھے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میں کافی دیر تک اپنی ''ماتری بھاشا'' پڑھ کر ہنستا رہا۔ اچانک بچوں نے دیکھا تو پوچھ لیا ''ڈیڈی آپ کو کیا ہو گیا ہے ہنس کیوں رہے ہو؟'' ''پاکستان میں بیٹھا میرا ایک بھائی مجھے ہنسا رہا ہے'' میں نے اپنی ہنسی پر بریک لگاتے ہوئے جواب دیا۔

آپ نے بجا فرمایا ہے میرے بھائی! پنجابی زبان چاہے جتنی بھی کھردری بولی جائے بہت میٹھی اور سوادی زبان ہے۔ جتنا بندہ اس کے اندر گھستا ہے اُتنی ہی یہ اُس میں رچتی ہے۔ اردو دماغ اور پنجابی دل کی زبان ہے۔ مرحبا۔ یقین جانیے اس افسانے کا لطف میں نے شاید سب سے زیادہ اٹھایا ہے جہاں پورے افسانے میں جا بہ جا آپ نے شگوفے کھلائے ہیں وہیں اس کا دوسرا پہلو بھی ہے جو انسان کو رُلا دیتا ہے۔ یعنی اس افسانے کی آخری سطور کہ ایک اُگروادی جس کا سمبندھ پاکستان سے تھا پولیس کسٹڈی میں مردہ پایا گیا۔۔۔ اور دوسری خبر کہ اُتر پردیش کے پوروآئی جی پولیس بنواری لال چوہان کا میڑھ شہر کی کوتوالی میں دل کا دوراہ پڑنے سے دیہانت ہو گیا۔ خوشی اور غمی کی ملی جُلی خبر یعنی پاکستان سے چل کر ایک دوست اپنے دوسرے دوست سے ملنے ہندوستان آ تو گیا مگر افسوس دونوں کی ملاقات زندگی میں نہ ہو سکی۔ یعنی ''بجّی پسلی سے خوشی کی لہر اٹھی اور کھبّی پسلی میں جا کر درد کی ٹیس میں تبدیل ہو گئی''

''شبھ چنتک''

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

''محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

منیب الرحمٰن صاحب کا گوشہ پڑھا۔ انٹرویو میں ترقی پسندی سے متعلق جوابات اچھے لگے۔ ان کا منتخب کلام پڑھ کر وہ شعر یاد آ گیا ''مرے قلم پہ زمانے زمانے کی گرد ایسی تھی۔۔۔'' ان کے کلام میں مختلف ادوار کے درمیان سفر نظر آتا ہے مگر مجھے ان کی نظم ''بے گھر'' زیادہ پسند آئی جو عروج اختر زیدی صاحب کے مضمون میں شامل ہے۔ نیلم احمد بشیر کے افسانے ''فرق'' میں خلوص اور بے ساختگی نمایاں ہیں ورنہ یوں کھل کر ہم اپنے تعصّبات کا اظہار کہاں کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اسے پڑھ کر لگا کہ ''ایک اچھی کہانی ملی تھی مجھے'' کو اتنی آسانی سے سپردِ قلم نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سعید نقوی کا ''ڈھائی خانے کی چال'' دلچسپ افسانہ ہے۔ مراق مرزا کا ''تختۂ دار پر کھڑا گاندھی'' بھی اچھا لگا۔ نیر اقبال علوی کا ''خواہش'' اب کالے گورے کے جھگڑے کے بجائے ہمارے اپنے تعصّبات کو سامنے رکھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہو گا کیونکہ مغرب اس معاملے میں ہم سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ سلمیٰ اعوان کا ''عراق جل رہا ہے'' پر رائے دینے کی ہمت نہیں' تکلیف دہ حقائق ہیں اور اب یہ بھی پتہ چل گیا کہ انسانی المیوں کی یہ داستانیں محض اڑائی ہوئی باتیں نہیں' اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ انور سدید صاحب کا مضمون ''قتیل شفائی کی کہانی'' دلچسپ ہے۔ عبداللہ جاوید صاحب کی نظم اچھی تھی جبکہ ناصر عباس نیّر کی وہ چند لائنیں اور ان میں علی محمد فرشی کی نظم کا اقتباس پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ایک چیز نے حیران کیا کہ دو غزلیں نظم کی طرح باقاعدہ عنوان کے ساتھ دوسری نظموں کے ساتھ چھپی ہیں۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

محترم گلزار بھائی، آداب۔

چہارسو سے اعلیٰ ادبی تخلیقات لیکر اور دل و دماغ کو تازگی بخشتا ہوا

موصول ہوا۔ پرچہ ہذا پچھلے پرچوں کی طرح بلا مبالغہ اعلیٰ سطح کا ادب پیش کر رہا ہے۔اس دفعہ قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے نام ہے جس میں محمد انعام الحق کا پیش لفظ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ حصّہ براہ راست میں آپ نے اپنے قارئین اور تخلیق کاروں سے جو عمومی سوال پوچھا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تنزلی کی وجہ کیا ہے؟ اور پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیا ہے یقیناً قابل توجہ ہے۔اس حصے میں آپ کے سوالات اور ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے جوابات ادب کے طالب علم کے لیے ایک وقیع دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو اردو ادب پر آپ کی گرفت و باریک بینی اور ڈاکٹر صاحب کی راست گوئی اور اچھی یادداشت پر دال ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا اعتراف کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے ترقی پسند تحریک کا حصّہ رہے ان کی راست گوئی کی دلیل ہے لیکن فن کے حوالے سے ان کا جواب کافی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تمام نظمیں خصوصاً ''یہ شہر''، ''انتقاضہ'' اور ''نام کا پتھر'' قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے فن کے حوالے سے موجود مضامین ان کے فن کے مختلف گوشوں کو خوبصورت انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔ خصوصاً شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''آرزوؤں کو سنبھل جانے دو'' قابلِ توجّہ ہے۔ گردشِ لیل و نہار کی حمد اور نعت پڑھے جانے کے قابل ہیں۔

شہناز خانم عابدی کا ''ایسا بھی ہوتا ہے'' اصل میں ایک واقعہ ہے جو بیانیہ انداز سے پیش کیا گیا ہے اور اس میں مصنف نے افسانوی رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کی۔ نیلم احمد بشیر کے ''فرق'' میں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ سید سعید نقوی کا افسانہ ''ڈھائی خانے کی چال'' ایک جدید افسانہ ہے جو شروع میں بے جا طوالت اور بوریت لیے ہوئے ہے مگر بعد میں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اس کا اختتام خوبصورت ہے اور اختتام سے محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے استعاراتی انداز اپنانے کی کوشش کی ہے۔ مراق مرزا کا افسانہ ''تختۂ دار پر کھڑا گاندھی'' اچھا افسانہ ہے جو انسانی، نفسیاتی کشمکش کو پیش کرتا ہے لیکن اس کا اختتام بڑا عجیب ہوا ہے اور یہ سوال چھوڑ گیا ہے کہ کیا جلاّد کی خودکشی سے گوپال گاندھی کی پھانسی ملتوی ہو جائے گی؟

گوشہ ''اضطراب کا عالم'' میں موجود غزلوں کے درج ذیل اشعار خوب لگے۔

ایک ایک در پہ صبح نے دستک بھی دی مگر
گھر کا دریچہ ڈر سے کوئی کھولتا نہیں (سرور انبالوی)

گہرے سمندروں میں مچاتے ہیں شور و غل
ساحل کے آس پاس بھنور بولتے نہیں (نسیم سحر)

تو اُسکی دید کی خواہش میں جل رہا ہے کیوں
کبھی ہوا کا بھی جھونکا دکھائی دیتا ہے (پرواز انبالوی)

جانے کس پیار سے چومادمِ رخصت ماں نے
پھول جھڑنے لگے اُجڑی ہوئی پیشانی سے (اشرف جاوید)

ڈاکٹر انور سدید کی ''قتیل شفائی کی کہانی'' قتیل شفائی کے حوالے سے کافی معلومات افزا ہے۔ خصوصاً اردو ادب میں صنفِ سوانح نگاری کے حوالے سے بھی وقیع اور دقیق معلومات بہم پہنچاتی ہے۔

انتظار باقی (جھنگ)

برادرم گلزار جاوید صاحب، دعائے صحت و عافیت۔

چہارسو کا ڈاکٹر منیب الرحمٰن والا شمارہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ منیب الرحمٰن صاحب کو صحت کی دعا پہنچے۔ میں ان کے کلام کا مداح ہوں۔ بیماری نے بہت ستایا۔ ۱۰ اپریل کو اس حالت میں ہسپتال لے جایا گیا تھا کہ لگتا تھا کہ بجنے کو ہے کوچ نقارہ۔

شائد دس دن بعد بہت سی شرائط پر رہائی ملی کہ یہ نہیں کروں گا وہ نہیں کروں گا چنانچہ گھر میں محدود چلت پھرت ہے، لیٹنا زیادہ پڑتا ہے اور آج یہ پہلا خط لکھ رہا ہوں۔ میرے دوست پروفیسر مسکین احمد منصور میری صحت کے بارے میں بھی آپ کو بتا چکے ہیں اور چہارسو کے ملنے کی رسید بھی سُنا چکے ہیں۔ کئی ماہ سے ارادہ تھا کہ چہارسو کے لیے ایک مضمون چند فلموں کے اسکرین پلے کے حوالے سے لکھوں۔ تکمیل شدہ فلم پر کم اس کے اسکرین پلے پر جم کر، لیکن یہ کام نہ ہو سکا۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ چہارسو اپنی نوعیت کا ایک ہی ادبی پرچہ ہے جو اس مہنگائی کے دور میں نہ صرف یہ کہ ادبی ذوق والوں کو مفت ملتا ہے خود اپنی بقا کے لیے اشتہاروں کا بھی محتاج نہیں ہے۔

حسن منظر (کراچی)

دل و جان سے عزیز گلزار! خوش رہو اور ہمیشہ خوشیاں بکھیرتے رہو۔

ہمارے اشتیاق سے سوا آپ کی پیشکش جناب منیب الرحمٰن کی شخصیت و فن سے آراستہ چہارسو ایسی ادبی، علمی اور معلوماتی دستاویز ہے جس کی تعریف کرنا روشنی کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی جس دور میں ادب کا روبار بن گیا ہو وہاں آپ نادر و نایاب لوگ تلاش کر کے لے آتے ہیں اور قارئین کو نئے ذائقوں سے سرشار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر منیب الرحمٰن اپنے دور کے ادبی نابغہ ہوا کرتے تھے جنہیں زمانے نے فراموش کر دیا تھا مگر آپ نے فرض شناسی کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے فن اور شخصیت کو اس قدر بھرپور انداز میں پیش کیا کہ پڑھنے والا داد اور دعا دیئے بنا رہ ہی نہیں سکتا۔ شمارے کے دیگر مشمولات بھی خوب بلکہ بہت خوب ہیں۔ افسانے سبھی اپنی جگہ خوب ہیں مگر نیئر اقبال علوی اور مراق مرزا زیادہ داد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کے اندر ایک ماہر قلم کار نہ جانے کب سے چھپا بیٹھا تھا۔ ہر نئی قسط اپنے اندر قاری کے لیے دلچسپی کا سامان لئے ہوتی ہے۔ اس

طرح اپنے دیپک کنول بھی نئی شخصیت اور نئے کارناموں کے ساتھ قاری کی دلچسپی کا خوب خوب سامان کر رہے ہیں۔ اس بار محترمہ سلمیٰ اعوان کے سفرنامے کا اضافہ کر کے آپ نے چہارسو کے قاری کو بہت عمدہ تحفہ پیش کیا ہے۔ سلمیٰ صاحبہ کا قلم اور آنکھ دونوں نہ صرف چوکنے ہیں بلکہ نہایت باریک بیں بھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس سلسلے کو مزید جاری رکھا جائے۔ خط کی طوالت شاعری پر اظہار خیال سے روک رہی ہے وگرنہ دل دماغ اور قلم بہت کچھ تحریر کرنے کے خواہش مند ہیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

پیارے گلزار بھائی! آداب۔

تازہ شمارہ (بابت ماہ مئی رجون ۲۰۱۴ء) کا عطیہ موصول ہو گیا تھا۔ ''براہِ راست'' کے ساتھ ساتھ عزیزی فاری شا کے شعری انتخاب اور بیدار بخت صاحب کے مفصل مضمون کے ذریعے ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی شخصیت اور فن سے متعلق آپ نے کلی طور پر متعارف کرا دیا ہے۔ ان سے متعلق دیگر مضامین بھی خاصے معلوماتی ہیں۔

سبھی افسانے بہت خوب ہیں لیکن میری نظر میں نیئر اقبال علوی صاحب کی کہانی ''خواہش'' حاصل شمارہ ہے۔ ہاں مگر میں اس کی وجہ بھی جانتا ہوں لیکن اس بار آپ کی تحریر کی کمی بُری طرح کھٹک رہی ہے۔ میں نادم ہوں کہ دوبار لاہور جانے کے باوجود میں پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب کی قدم بوسی کے لیے حاضر نہ ہو سکا۔ اب کی بار یعنی دسمبر ۲۰۱۳ء کی عالمی کانفرنس کے دوران عزیزی شعیب بلوچ ملنے کے لیے آئے تو ان کے ہاتھ بس ''نشاطِ قلم'' کا ایک نسخہ ہی ان کی خدمت میں بھیج پایا تھا۔ میں پروفیسر صاحب کے تئیں دلی طور پر اظہار ممنونیت کرتا ہوں کہ انہوں نے اسے شرفِ قبولیت عطا فرماتے ہوئے میری حقیر تحاریر کے لیے تحسین آمیز کلمات سے نوازا ہے۔ انبالہ کے مسلم شعراء و ادبا کے ذکر میں ترتیب ماہ و سال کا لحاظ نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ میں نے ان تمام حضرات کے تخلص کو ملحوظ رکھ کر انہیں حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ پروفیسر کاظمی اس وقت جس وطن میں ہیں وہیں کے ایک قصبہ کی مٹی سے میرا خمیر اُٹھا تھا اور راقم السطور آج جس شہر میں مقیم ہے وہ پروفیسر کاظمی صاحب کی جنم بھومی ہے اور یہیں کے جس مسلم ہائی اسکول میں موصوف نے میٹرک تک کی تعلیم پائی تھی وہاں تقسیم وطن کے بعد لاہور والے ڈی۔اے۔وی کالج کو منتقل کر دیا گیا تھا جہاں پچھلے دس بارہ سال سے میری بیٹی بھی اپنی تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ اس مضمون کے سلسلے میں اپنی تحقیق کے دوران ظہیر بابر صاحب کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ کر پایا تھا اگر پروفیسر صاحب ان کے بارے میں کچھ تفصیلات اور ان کے کلام کے کچھ نمونے فراہم کرا سکیں تو میں شکر گزار رہوں گا۔ ڈاکٹر فیروز عالم اور دیپک کنول صاحب کے کالموں سے تو لطف اندوز ہو چکا ہوں۔ شعری حصہ کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

(گل خوبی) گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

میں فی الوقت نواں شہر (ایبٹ آباد) سے بول رہا ہوں۔ حالات ہی ایسے پیدا ہوئے کہ مجھے بے گھری کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ بوئی سے سفر اختیار کرنا پڑا ہے۔ نواں شہر کی طرف ڈاک یہاں منگوالی تھی۔ تازہ ''چہارسو'' کی قدر و قیمت معلوم ہوئی یعنی ''چہارسو'' کی سمتیں محدود نہیں وہ ''نواں شہر'' کا شہری نواں بھی کر لیتا ہے۔ محترم منیب الرحمٰن کی شخصیت اور ادبیت کی جان کاری مسرت انگیز ٹھہری۔ اس پر دیش (مقولہ) میں چہارسو کا مطالعہ دل بڑھاتا ہے۔ حیرت کی بات ہے۔ غزلوں کا دوسرا حصہ فنی اعتبار سے مستحکم ہے۔ اس میں خوبصورت شعری گل بوٹے سجے ہیں گل زار کی نسبت سے۔ قتیل شفائی کی کہانی دل و جاں سے پڑھی۔ قتیل حق مغفرت کرے ہمارے ہزارے کے ہیں ایک دور افتادہ علاقے سے ابھر کر یہ ''چاند'' چہارسو جگمگایا۔ اس کی چاندنی محو نہیں ہوئی۔ قتیل شفائی مرحوم نے تغزلانہ نغمگی کے جو اطوار وضع کیے ہیں وہ کہیں اور نہیں۔

''رس رابطے'' میں عبداللہ جاوید صاحب کے خط نے دل کے تار ہلا دیئے۔ امراض کے محاصرے اور لکھنے پڑھنے کے وقت والی بات نے دم بخود کر دیا۔ عبداللہ جاوید صاحب کی صحت اور سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ میں بھی تو ایک بہت بوڑھا شخص ہوں بد خطی کی وجہ سے ''بدوضعی'' کی سی صورتِ حال درپیش ہوتی ہے۔ وہ ''من آنم'' والی بات بھی ہے۔ کمپوزنگ میں خرابی ہو تو بعض ایسے لوگ بھی حرف گیری کرتے ہیں جو اپنے کہے سنے پر نظر ثانی نہیں کرتے۔ بہر رنگ میں ہر اس شاعر کا نوکر ہوں جس نے ایک بھی اچھا شعر کہہ رکھا ہو۔ ہر اس ادیب کا حامی ہوں جس نے ایک بھی خوب صورت جملہ لکھا ہو۔ یہ بات میں کئی بار کہہ چکا ہوں۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

مکرمی گلزار جاوید، سلام مسنون!

آپکی محنت اور خلوص کا مظہر نیا ''چہارسو'' میرے ہاتھ میں ہے۔ حسبِ معمول ''قرطاسِ اعزاز'' ایک منفرد شاعر و ادیب کے نام ہے۔ منیب الرحمٰن اپنے فن کے اچھوتے نمونوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں۔ سب سے پہلے ان کے انٹرویو کو پڑھا، بہت مزا دیا، عمدہ سوال، عمدہ جواب۔ صاحبِ اعزاز کی بہت سی کہی ہوئی اچھی باتوں میں سے یہ بات ''زندگی ایک بے حساب نعمت ہے، اسے گریہ وزاری میں صرف کرنا اپنے ساتھ ظلم کرنا ہے'' حاصلِ کلام ہے۔ منیب الرحمٰن کے قلمی شہہ پاروں کے پیش کردہ انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے جب بھی اور جس موضوع پر بھی لکھا، اسی ماحول کو اپنے سامنے رکھا جس میں وہ سانس لیتے ہیں۔ ہر بڑے تخلیق کار کی طرح وہ صرف انسانیت کی بات کرتے ہیں جس کے سامنے جغرافیائی حدود بے معنی ہیں۔ ایک خاص سوزِ دروں اور سوچ میں مشرقی تہذیب و معاشرت کا ایک خاص رنگ اس تخلیق کار کے قلم کو راستہ دکھاتا ہے۔ کینیڈا نشین اردو زبان و ادب کے عاشق، ولی عالم شاہین اپنے مضمون ''لوبان کا دھواں'' میں منیب الرحمٰن کے منتخب اشعار اور ان کے فنی محاسن سے

قارئین کو آگاہ کرتے ہیں اس طرح کہ ان کے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ تاہم منیب الرحمٰن کے فن کا احاطہ ایک نشست میں ممکن نہیں۔

شعری حصّے کے آغاز میں غالب عرفان کی حمد اور اس کا یہ دل نشیں شعر:

راہِ حیات ہو کہ سفر بعد موت کا　　اس کو خبر ہے سانس کے ہر تار کی

اسی کے ساتھ شفیق احمد شفیق کی نعت کا یہ تاب دار موتی:

ذرا دیکھئے سبز گنبد کی جانب　　نئی تابنا کی کی عجیب شان میں ہے

اور غزل میں سلیم ناز کی حقیقت پسندی:

اس آدمی کی بے بسی دیکھی نہ جائے ہے　　جس آدمی کو دوسرا نہلائے آدمی

افسانوں میں رچی بسی دنیا میں بھی بہت کچھ ہے۔ مراق مرزا کے پُرکار قلم سے نکلی تحریر ''تختہ دار پر کھڑا گاندھی'' نادر یہ قاری کو گنگ کئے رکھتی ہے۔ شہناز خانم عابدی کا ''ایسا بھی ہوتا ہے'' اور نیلم احمد بشیر کا ''فرق'' قاری کے لیے خوش ذوقی کے لیے دو چھوٹے مگر پُر اثر کیپسول ہیں لیکن نیئر اقبال علوی کے افسانے ''خواہش'' میں کالے اور گورے رنگ نے مل کر اودھم مچادی۔ بہت پہلے اسلام نے دنیا میں آتے ہی رنگ و نسل کے فرق کو بے معنی قرار دے کر مٹا دیا تھا دنیا اس بات کی اہمیت کو اب تک نہیں سمجھی خصوصاً مغربی دنیا۔ آخر میں ان سب حضرات کا شکریہ کہ جنہوں نے مارچ اپریل کے ''چہارسُو'' میں میرے افسانے ''جب جسم جاگتے ہیں'' کو پسند یا ناپسند کیا۔ تاہم محترم غالب عرفان کا الزام کہ یہ افسانہ یٰسین احمد صاحب کے افسانے ''کریچہ کافلیٹ'' کی ایک بھونڈی اور ناکام نقل ہے، ایک بغیر سوچے سمجھے اور BLUNTLY کہی ہوئی بات ہے اور حقیقت سے بعید۔ میں کوئی کچی سوچ والا نو عمر چھوکرا نہیں کہ محض نام چھپوانے کے شوق میں قلم کاری کی بنیادی اخلاقیات کا لحاظ نہ کروں۔ ''نقل'' اُن لوگوں کا کام ہوگا جن کے دماغ سوچ سے خالی ہوں۔ یٰسین صاحب کا افسانہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن اگر ایسا کوئی موقع ملتا تب بھی میں اپنا مذکورہ افسانہ ضرور لکھتا۔ میں کوئی بڑا تخلیق کار نہ سہی تاہم ہر قلم والے کی طرح میری اپنی ایک سوچ، رائے اور تحریر کا اپنا ایک انداز ہے۔ میں غالب عرفان صاحب کی محبت کی میٹھی آنچ پر پکی شاعری سے بہ خوبی واقف ہوں اور اس بات کا بھی ادراک رکھتا ہوں کہ میری تحریر کے بارے میں کہی ہوئی بات یقیناً اُن کی مخصوص فکری شائستگی سے مبرّا ہے۔

اردو افسانے کی عمر اب سو برس سے اوپر ہو چکی۔ اسے بلوغت بھی پچھلی صدی میں مل گئی تھی۔ حیرت ہے کہ بعض لوگ اب بھی اس میں ڈپٹی نذیر احمد کی کہانیوں ایسا ماحول اور سانچوں میں ڈھلے ڈھلائے کرداروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ زمانی فرق ان کے نزدیک کوئی بات نہیں۔ میرے مذکورہ افسانے میں جنسیت کا شائبہ تک نہیں البتہ موقع کی ضرورت کے تحت دو تین جملے ضرور ہیں لیکن اُسی خاص ذہن نے انہیں ''غلاظت'' شمار کیا۔ بات اپنے اپنے ذہن کی سہی لیکن بہر حال میرے لئے ہر قاری محترم ہے۔ خط کے اختتام کے ساتھ ہی میری جانب سے افسانے کا ذکر بھی ختم۔

محمد طارق علی　(راولپنڈی)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

اس مرتبہ رس رابطوں پہ گمان شبہ چٹک رابطوں کا گزرا کیونکہ بیشتر فیڈ بیک میں کہانی کے مختلف زاویوں اور ان گنت نہجوں سے بہت پذیرائی پائی۔ دراصل ایسی وسیع التنا ظر ہمہ گیر موضوعات پر مبنی شاہکار رکہانیوں کے تراجم کئے جائیں تو دوسری زبانوں کے توسط سے بھی قاری کے لیے مطالعے اور آگہی کی مزید راہیں کشادہ کی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر کمار پانی پتی اور تشنہ صاحب کے منظوم خراج تحسین قارئین چہارسو کی بھی بخوبی نمائندگی کرتے ہیں۔ کہ ادبی پارکھ کی کھوج ہمیشہ خوب سے خوب تر کا ارتکاز کئے رہتی ہے جس کی حالیہ مثال ڈاکٹر منیب الرحمٰن صاحب کا قرطاسِ اعزاز ہے ان کی شخصیت وفن کا ادراک ذہنی وسعتوں اور علمی کشادگی سے ہمکنار کرتا ہے۔

گل دوستی کے پر خلوص اسالیب کو سراہتے ہوئے بالخصوص چاند صاحب کے ''نشاطِ قلم'' کا سیر حاصل تجزیہ کیا گیا ہے۔ جناب قتیل شفائی ہمارے ایسے سدا بہار نغمہ نگار ہیں جن کے مصرعے گنگناتے تھے اور حرفوں سے غنائیت پھوٹتی تھی۔ ''ہمارے دیس کا خوشنوا فقیر'' میں محترم محمود ہاشمی صاحب کو اُن کی یادوں، باتوں اور ملاقاتوں کے حوالے سے سپرد قلم کیا گیا کہ وہ کشمیر کے احباب اپنے رفقائے کار اور حلقہ ارباب کو بھی اُداس کر گئے۔ تارا چند برجاتیہ جی کا فلم میکنگ کے لیے اعلیٰ گیان بصورت خوبصورت کہانی، مدُھر سنگیت اور اچھی ہدایت کاری نہایت توجہ طلب اہمیت کا حامل ہے۔

سلمیٰ اعوان صاحبہ سیاسی وسماجی حالات وواقعات، تہذیبی وثقافتی اقدار کا سچا وکھرا جائزہ لیتی ہیں اور اُن کی حقیقی تصویریں پیش کرتی ہیں ایک عراقی جرنلسٹ نے بھی روزنامچوں پہ مشتمل بغداد جل رہا ہے حقائق پر مبنی اچھا لکھا تھا۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب یادداشتوں کے تسلسل اور سال بسال ڈائریز کی معاونت سے مربوط ومنظم روداد حیات نہایت ہنروری وکامیابی سے قلمبند کرتے چلے جارہے ہیں۔ ''خوابِ غفلت'' کے حوالے سے حقیقت میں افسانوی رنگ تحلیل ہو جائے تو دلچسپی دوچند ہو جاتی ہے۔ دلیپ کمار صاحب سے خوابناک مکالمہ بالمشافہ گفتگو سے کہیں زیادہ مؤثر ومتاثر کن رہا۔ نظموں میں ''گلستانِ اردو کی گلیاں، جی بھی گئے، پھر بجی بزمِ فراز، صحرائے تھر پارکر، کمپیوٹرائیج، نئی تخلیق اور یہ سڑک'' زیادہ پسند آئیں۔

شگفتہ نازلی　(لاہور)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ حسب معمول وقت پر علمی وادبی تازگی کے ساتھ ملا۔ صاحبِ قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے ''براہِ راست'' کے جوابات میں بیزاری سی نظر آئی۔ ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی نظموں کا انتخاب جو قاری شانے کیا ہے نظموں کے پڑھنے کے بعد بیزاری ختم ہوئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے منیب الرحمٰن کی نظموں کے متعلق فیصلہ دینے والا انداز اپنایا ہے مثلاً ''منیب الرحمٰن نے کلاسیکی فارسی آمیز لفظیات کو فیض کے بجائے راشد کی

طرح برتا ہے'' (ص ۲۵) اسی طرح کے کئی اور جملے مگر مضمون اہم ہے۔ بیدار بخت نے تفصیل سے ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور نظموں کے پس منظر میں منیب صاحب کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون سے منیب الرحمان صاحب کی شخصیت اور فن کے کئی زاویے روشن ہوتے ہیں۔ ''ہجر و فراق کی نظمیں'' میں نظموں کی فنی پختگی اور شعری حسن پر مضمون نگار نے اس طرح اظہار کیا ہے کہ جس سے ''دکھ'' اور ''جدائی'' کی کیفیت نمایاں ہوگئی ہے۔ گو کہ یہ نظمیں منیب صاحب کی مرحومہ بیگم ''زیبا'' کی جدائی کے پس منظر میں تخلیق ہوئی ہیں۔

یعقوب نظامی نے محمود ہاشمی کا خاکہ نما مضمون محنت اور محبت سے تحریر کیا ہے ''محمود ہاشمی اور کشمیر اداس ہے'' لازم و ملزوم کی طرح زبان پر آتے ہیں۔ بہت پہلے ''چہارسو/گلزار جاوید صاحب'' محمود ہاشمی کو قرطاس اعزاز پیش کر چکے ہیں۔ نہ جانے کیوں احساس ہوتا ہے کہ ''مشرق'' کی مصروفیت میں صاحبِ اسلوب لکھاری کہیں گم ہو گئے تھے۔ گوجرہ نے ہاکی کے نامور کھلاڑی پیدا کیے ہیں مگر محمود ہاشمی پر گوجرہ کی خاک کو بھی فخر ہوگا۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول صاحب نے ''تارا چند برجاتیہ'' پر مفید معلومات جمع کی ہیں مگر اس بار انداز ذرا سپاٹ سا محسوس ہوا جو وہ افسانوی انداز اپناتے ہیں وہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے قتیل شفائی کی آپ بیتی ''اور گھنگھرو ٹوٹ گئے'' میں مصنف کی زندگی کے اہم واقعات اور کلام کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی کی کتاب ''پس نوشت اور پسِ پس نوشت'' آپ بیتیوں کے جائزہ کے حوالے سے اہم تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ مشکور حسین یاد، انتظار باقی، پروفیسر صدیق شاہد اور اشرف جاوید کی غزلوں میں کلاسیکی لفظی برتاؤ اچھا لگا۔ تشنہ بریلوی کا یہ شعر صنعتِ تعلّی کی اچھی مثال ہے۔

ہر شعر مرا حسنِ تغزل کا مرقع
رہتا ہے کوئی شاعرِ اعظم مرے اندر

ماں کی محبت و عقیدت کے حوالے سے یہ شعر پسند آیا:

جانے کس پیار سے چومادمِ رخصت ماں نے
پھول جھڑنے لگے اُجڑی ہوئی پیشانی سے (اشرف جاوید)

پروفیسر زبیر کنجاہی کی غزل ہمارے سماجی و سیاسی افراتفری کا نوحہ ہے:

طویل مدت گزر گئی ہے اُداس کتنی ہے پاک دھرتی

پرویز مظفر، سبھاش گپتا، سلیم ناز، عارف شفیق اور ظہیر اقبال کی غزلوں کی سلاست اور شعری نزاکتیں کمال کی ہیں۔ خطوط کے بعد ڈاکٹر فیروز عالم کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' کا مطالعہ ہر بار کی طرح دلچسپ رہا۔ موجودہ قسط میں ڈاکٹر صاحب نے کراچی کے اہم غیر سرکاری ہسپتالوں (اُس وقت کے) میں ملازمت کی تلاش کی روداد قلم بند کی ہے اس قسط سے واضح ہوتا ہے کہ اگر انسان باہمت ہو اور عزم و یقین کے ساتھ حوصلے بلند رکھے تو اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرماتا ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' ہاتھ میں آتے ہی ایک سرشاری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس بار قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے نام نکلا، جانے آپ کے پاس ایسی کون سی جادو کی چھڑی ہے جسے آپ گھماتے ہیں تو ایک نہ ایک ایسا نام تلاش لیتے ہیں جو ادبی دنیا میں معروف ہو یا نہ ہو لیکن اس کی ادبی خدمات قرطاسِ اعزاز کا تقاضا کرتی ہوں۔ ادب کے حوالے سے ڈاکٹر منیب الرحمٰن معمولی شخصیت نہیں ہیں، یہ محمد انعام الحق کی صاحبِ قرطاس کے متعلق فراہم کردہ تفصیلات سے پتہ چلتا ہے۔ آپ کی یہ گراں قدر کاوش ڈاکٹریٹ کے طلباء کے لیے سود مند ثابت ہوگی۔ براہ راست میں کیے جانے والے سوالات مرزا غالب کے غیب سے آنے والے مضامین کی طرح آپ پر بھی اُترتے ہوں گے۔ شاید یہ ہی باعث ہے کہ صاحبِ قرطاسِ اعزاز بعض سوالات سے کنی کتراتے نظر آتے ہیں۔

افسانے کے عنوان تلے حصہ اوّل میں چار افسانے شامل ہیں۔ شہناز خانم عابدی کا ''ایسا بھی ہوتا ہے'' ایک تقریب کا احوال ہے جسے پورے لوازمات کے ساتھ قلم بند کیا گیا۔ روانی تحریر اور Involvment بہت خوب ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جو نصف صدی گزرنے کے باوجود اپنے ہیروز کی تقریبات برپا کرتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ۔۔۔ ایسی تحریریں ہونی چاہئیں جو ہمیں اپنے موازنے اور محاسبے کی طرف لے جائیں۔ نیلم احمد بشیر نے چند سطروں کا تردد کر کے ''فرق'' لکھا۔ یہ آنکھوں دیکھا حال تو ہو سکتا ہے لیکن افسانے کی نسل سے خارج ہے، مصنف جب معروف ہو جائے تو محتاط ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ سیّد سعید نقوی نیویارک میں بیٹھے ''ڈھائی خانے کی چال'' چل گئے، کہانی پہلی قرأت میں اپنا گھونگھٹ نہیں اُٹھانے دیتی بلکہ مرعہ ثانی تک قاری کو مطالعہ کا کشت اٹھانا پڑتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ''تھامس'' ہے جسے اپنی ذہانت پر ناز ہے، یہی باعث ہے کہ وہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوا اور شطرنج جیسے پیچیدہ کھیل میں دلچسپی لینا شروع کی۔ کمپیوٹر بلاشبہ ایسی ایجاد ہے جس نے انسانی زندگی کے کئی بوجھ اُتار پھینکے ہیں تاہم ہر لحہ انسان کا مرہونِ محتاج ہے۔ جین Assistant Character ہے جس کی کتاب تھامس کے کام آئی اور شطرنج کے کھیل میں کمپیوٹر کو Divid & Rule کا اصول اپناتے ہوئے شکست دی۔ ذہانت کے ساتھ جہدِ مسلسل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی آپ کے قدم نہ چومے۔ اچھا افسانہ ہے۔

مراق مرزا نے چہارسو کے لیے ''تختۂ دار پر کھڑا گاندھی'' لکھا۔ جن وادیوں کے حقوق اور مسائل کے لیے آواز اُٹھانے والا گوپال گاندھی بالآخر حکومت کا معتوب ٹھہرا، عصرِ حاضر کا نوحہ ہے، LOC کے دونوں طرف یکساں حالات ہیں۔ افسانہ دو کرداروں پر مشتمل ہے، گوپال گاندھی جسے دس منٹ زندہ

رہنے کے بعد جل کر راکھ ہوجاتا ہے، کی خاطر جلاّد ابراہیم خان نے وہ پھندا اپنے گلے میں ڈال کر موت قبول کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ گوپال گاندھی راہِ راست پر ہے۔

اگرچہ طویل افسانوں سے میں بدکتا ہوں تاہم عظمیٰ صدیقی کا ''ماروی نے مجھے مار دیا'' پڑھ ہی لیا۔ اس افسانے میں عظمیٰ نے ایسے مسائل کی طرف اشارہ کیا جنہیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ دو مختلف النظریات کرداروں کی کہانی ہے۔ اردو افسانے میں شاعری عرصہ پہلے متروک ہو چکی ہے جب کہ افسانہ نگار نے امجد اسلام امجد، علامہ محمد اقبال اور ابنِ انشاء کی پوری نظمیں افسانے میں شامل کر لی ہیں جو کھٹکتی ہیں تاہم افسانہ مضبوط ہے۔ نجیب عمر نے ''خوابِ غفلت'' لکھا۔ آپ کہانی یا کہانی آپ کا ساتھ نہیں دے سکی، بوتل نئی نہ شراب، آپ اس سے بہتر افسانہ لکھ سکتے ہیں۔

احسان بن مجید (اٹک)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

نہایت شفقت و چاہت کے پھول اپنے دامن میں سموئے ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ گزشتہ روز موصول ہوا۔ ہر ماہ اتنے وقیع مضامین، شاندار ادب پارے اکھٹے کر کے قارئین کو طباعت کی آراستگی کے بعد خلوص و محبت کے ساتھ پیش کرنا آپ جیسے ادبی درویش ہی کا کام ہو سکتا ہے جس پر آپ کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ میں نے پورے انہاک اور دلجمعی کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ یہ چند سطور بطور شکریہ آپ کو تحریر کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ آئندہ بھی چہارسو ارسال فرماتے رہیں گے۔ زرِ سالانہ کے سلسلے میں ''دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' آپ کی فیاضی و اعلیٰ ظرفی کی غماز اصطلاح ہے۔ مگر اس کے باوجود مالی معاملات کو چلانے کے لیے کچھ نہ کچھ قیمت ضروری ہے۔

نیرؔ اقبال علوی (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، آداب و تسلیم۔

ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے نام قرطاسِ اعزاز ہمیشہ کی طرح ہمارے لیے بہت ساری معلومات لے کر آیا۔ ''براہِ راست'' کے ابتدائیہ میں جس دکھ کا آپ نے اظہار کیا وہ ہم سب کا سانجھا دکھ ہے۔ نوجوان نسل ادب سے بہت دُور ہے۔ مطالعے کا شوق اب نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالات دیگر گوں ہے اور اس کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہم نے نئی نسل کو کتاب سے روشناس ہی نہیں کروایا۔ ہمارے بزرگ ہمیں کتاب پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔ کتاب کی واپسی پر سوال جواب بھی ہوتے کہ کتاب واقعتاً پڑھی گئی یا نہیں۔ یہ متاعِ گم گشتہ ہی تو ہیں کہ بینائی جواب دے گئی۔ ۹۰ سال کی عمر لیکن ادب کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا انعام یافتہ افسانہ ''مرض'' جو گرچہ ماخوذ ہے لیکن اردو کے قالب نے اس میں جان ڈال دی۔ کردار نگاری ایسی، مانو صفحہ قرطاس سے نکل کر ہمارے سامنے متحرک ہوں۔

''ایسا بھی ہوتا ہے'' شہناز خانم عابدی کا مختصر لیکن پُر تاثیر افسانہ جس کا دور، انسان دوستی، تنظیمی صلاحیت سے مالا مال ایک مہذب انسان جسے پچاس سال بعد بھی علاقے کے لوگ نہیں بھولے۔ لیکن افسانے کا انجام قاری کو پیغام دیتا ہے کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ نیلم احمد بشیر کا ''فرق'' انسان کے اعلیٰ کردار اور ان اعلیٰ قدروں کا پتہ اس وقت چلتا ہے جو اس کی زندگی میں زرّیں اصول ہوتے جس کی ہم توقع نہیں کرتے۔ نیلم ایک معروف اور مستند افسانہ نگار ہیں جنہیں کہانی بننے کا فن آتا ہے۔ ایک صفحہ سے بھی کم طوالت کا اس قدر بھرپور افسانہ۔ ''ڈھائی خانے کی چال'' سیّد سعید نقوی کا خوبصورت افسانہ شطرنج میں گھوڑے کی چال ڈھائی خانے کی ہوتی ہے اور چاروں طرف آٹھ خانے اس کی زد میں ہوتے ہیں۔ سید صاحب نے عنوان کے لیے یہی پسند فرمایا۔ انسان کمپیوٹر کا خالق ہے پھر وہ کمپیوٹر سے کیوں کر ہار سکتا ہے۔ سیّد صاحب نے یہی ثابت کیا اور اصول ایک شیطانی چال Divide and rule۔

''تختۂ دار پر کھڑا گاندھی'' مراق مرزا کے اکثر افسانے حالات حاضرہ پر شدید طعن و تشنیع۔ جلاّد ابراہیم خان جلاد تو تھا، اس سے انکار نہیں لیکن وہ ناتھورام گوڈسے بننے کو تیار نہیں۔ مہذب دنیا کے عدالتی نظام پر ایک طمانچہ۔ نیر اقبال علوی کی ''خواہش'' سیاہ فام اور سفید فام تنازعے کا پاٹتا ایک پُر تاثیر افسانہ جہاں مصنف ثابت کرتا ہے کہ محبت فاتح عالم۔ اس طاقت سے سارے اختلافات اور تنازعات نمٹائے جا سکتے ہیں۔ عظمیٰ صدیقی کا ''مجھے ماروی نے مار دیا'' ماروی کی انسان دوستی انسان کی عظمت کے گیت الاپنے والی۔ تمام انسانوں کو ایک اکائی سمجھنے والی ماروی کے آگے عاشق کو اپنا عشق بہت بونا لگا۔ جس کے اغراض و مقاصد محدود، اسے ماروی تو آسمان سے باتیں کرتی نظر آئی اور وہ مصلحت کا مارا۔

راج شری پکچرز کے تاراچند برجاتیہ نے بمبئی کی فلم نگری میں جو جھنڈے گاڑے اور جس طرح کی کامیاب فلمیں دیں دیپک کنول کی زبانی جان کر ہم ماضی میں اترتے چلے گئے اور ماننا پڑا کہ یہ بڑے لوگ واقعی فنکار تھے جنہیں فلمیں بنانے کا فن آتا تھا۔

نجیب عمر (کراچی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس مرتبہ قرطاس کا اعزاز ڈاکٹر منیب الرحمٰن کو ملا۔ ڈاکٹر صاحب کے حالات و واقعات اور فتوحات سے بخوبی اندازہ ہوا کہ موصوف کے اردو زبان و ادب پر ان گنت احسانات ہیں۔ اس نوعیت اور ایسی سطح کا کام یقیناً ڈاکٹر منیب الرحمٰن ایسی نابغہ روزگار شخصیت کا خاصہ اور حصہ ہے۔ براہِ راست کا عنوان اس بار رہنمائی، آشنائی اور شناسائی کے ذیل میں دیکھا اور پڑھا گیا۔ گزشتہ شمارہ اس خصوص میں تشنگی کے ہزار ہا پہلو رکھتا تھا۔ بہرحال اپنی اپنی سوچ اپنا اپنا مزاج اور اپنا

اپنا انداز۔ زیرِ نظر شمارہ ہر لحاظ سے ایک مکمل دستاویز ہے۔ بامعنی نثری تحریریں علم اور معلومات کا خزانہ ہیں جبکہ منظومات (نظم وغزل) حسنِ انتخاب اور حسنِ ترتیب کی عمدہ اور زندہ مثال ہیں۔ غالب عرفان صاحب کی حمد، الفاظ کا خوبصورت اور برمحل استعمال غالب صاحب کو آسمان کی بلندیوں پر لے گیا۔ یوں غالب کا ''عرفان'' بلند ہوا۔ رس رابطے میں شامل ہر خط قاری اور لکھاری کے دل کی آواز ہے۔ دبے لفظوں میں ایک دوسرے پر تنقید کھلم کھلا اور آزادانہ نشتر چلانے سے بدرجہا بہتر ہے۔ کیونکہ عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ہر چھوٹا بڑا شاعر اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ کمپوزنگ کی وجہ سے لفظ آگے پیچھے اور کم یا زیادہ ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ایک حرف یا ایک نقطہ نا صرف معنی تبدیل کر دیتا ہے بلکہ پورا مصرعہ اس کی زد میں آجاتا ہے ایسے میں ایک تنقید نگار صرفِ نظر کرنے کے بجائے شاعر کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے اور بدگمانیاں جنم لیتی ہیں۔ حالیہ شمارے میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ مجھ ایسا مُبتدی تو تنقید کی زد میں آئے لیکن ایک کہنہ مشق اور استاد شاعران تیروں سے کیونکر بچ پائے؟

تصور اقبال (تلہ گنگ)

برادرم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

مئی، جون ۲۰۱۴ء کا ''چہارسُو'' نظر نواز ہوا۔ وصولیابی کی رسید تو میں نے آپ کو بروقت (ایس ایم ایس کے ذریعے) دے دی تھی۔ اب پرچے کا مطالعہ کر کے چند تاثرات رقم کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر منیب الرحمٰن کا ''قرطاسِ اعزاز'' دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ آپ نے Interview میں درست لکھا کہ بہت سے لوگ (جن میں یہ ناچیز بھی شامل ہے) ڈاکٹر صاحب کی علمی وادبی خدمات سے لاعلم ہیں۔ ''براہ راست'' میں آپ نے خود ان کی زبانی قارئین کے لیے ان کا تعارف بہت موثر انداز میں کرایا ہے۔ واقعی ڈاکٹر صاحب اردو ادب کے حوالے سے ایک نابغہ روزگار شخصیت ہیں۔ چونکہ وہ ٹھوس کام پر یقین رکھتے اس لیے ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''میں نے آج تک خود کو مقبول بنانے کی جدوجہد نہیں کی۔'' ڈاکٹر صاحب پر لکھے گئے مضامین میں سب سے زیادہ وقیع مضمون بیدار بخت صاحب کا ہے۔ میری ان سے پانچ چھ سال قبل کینیڈا میں اشفاق حسین صاحب کے گھر پر ایک ضیافت میں ملاقات ہوئی تھی جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی شامل تھے۔ بیدار بخت صاحب کی گفتگو انتہائی مدلّل اور فکر انگیز تھی۔ یہی خوبیاں مجھے ان کی تحریر میں بھی ملیں۔ دیگر مضمون نگاروں (شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر عروج اختر زیدی، امتیاز احمد، ولی عالم شاہین اور ڈاکٹر امجد حسین) نے بھی ڈاکٹر منیب الرحمٰن صاحب کی محبت اور عقیدت میں ڈوب کر لکھا ہے اور سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر منیب الرحمٰن کا افسانہ ''مرض'' بہت دل گداز ہے۔ شہناز خانم عابدی اور نیلم احمد بشیر کے افسانے (بالترتیب ''ایسا بھی ہوتا ہے۔'' اور ''فرق'') بھی خوب رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نظموں کا انتخاب بہترین ہے۔ ایک نظم ''نام کا پتھر'' کے آخری ''مصرعے'' یوں مجھیے کہ دل میں کھب گئے:

یہ زمانے کی اجاڑے ہوئے دالان و اُطاق
اب رہا کیا ہے یہاں نام کے پتھر کے سوا

انہیں پڑھ کر مندرجہ ذیل شعر میرے ذہن میں گونجنے لگا (شاعر کا نام یاد نہیں)۔

لوحِ مزار دیکھ کے میں دنگ رہ گیا
ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

''ہوا کے دوش پر'' (فیروز عالم) حسب سابق خاصے کی چیز ہے۔ مہندر پرتاب چاند، قتیل شفائی اور محمود ہاشمی پر بالترتیب حسن عسکری کاظمی، انور سدید اور یعقوب نظامی کے خاکہ نما مضامین پڑھ کر ذہن کو طمانیت کا احساس ہوا۔ ''ایک صدی کا قصہ'' میں اس بار دیپک کنول نے قارئین کو تارا چند برجاتیہ سے متعارف کرایا ہے۔ دیپک کنول کی دیگر تحریروں کی طرح یہ بھی قارئین کی بھرپور توجہ حاصل کرتی ہے۔ شعری حصے میں تشنہ بریلوی صاحب کی غزل میں الفاظ کی گھن گرج اور معانی کی تہ داری کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے اگرچہ دیگر شعرا کا کلام بھی معیاری، قابل داد اور لائق مطالعہ ہے۔

''رس رابطے'' سے علم ہوا کہ ''چہارسُو'' کے گزشتہ شمارے میں میر امضمون ''ہوئے مر کے ہم جو زندہ'' شایع ہوا تھا۔ (یہ شمارہ مجھ تک نہیں پہنچا)۔ چھ صاحب ذوق قارئین (یوگیندر بہل تشنہ، ڈاکٹر رینو بہل، آصف ثاقب، مہندر پرتاب چاند، ابراہیم عدیل اور سلیم ناز) نے مضمون کو پسند کیا اور اس کے لیے تعریفی کلمات سپردِ قلم کر کے میری عزت افزائی کی۔ میں ان حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ ایک صاحب (سید نصرت بخاری) نے میرے حق میں ''شعر فہمی'' کی دعا کی ہے۔ میں ان کی اس دعا پر آمین کہتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں حسِ مزاح کی دولت مرحمت فرمائے کہ آج کل کے حالات میں یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ کوئٹہ کے استاد رشید انجم (مرحوم) نے کہا تھا۔

رنج ہے، کرب ہے، اذیّت ہے
مسکرانے کی اب ضرورت ہے

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی)

محترم گلزار جاوید، آداب وسلام۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ہمہ دست ہوا۔ اس بار قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے نام ہے، ڈاکٹر صاحب ایک بلند پایہ قلم کار ہیں۔ ان کا سفر حیات اور ادبی فتوحات دونوں قابلِ رشک ہیں۔ براہِ راست کے تحت ڈاکٹر صاحب سے لیا گیا آپ کا انٹرویو بھی ہمیشہ کی طرح نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہے۔ دیگر مشمولات چہارسو کے علمی وادبی معیار و مزاج کے امین ہیں۔

مراق مرزا (ممبئی، بھارت)

..... مشہد جاں میں اُجالا .....

اچھا سفر نامہ وہی کہلاتا ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری یوں محسوس کرے کہ وہ بھی سفر پر نکلا ہوا ہے۔اب وہ زمانہ گیا جب مسافر کو گھر یاد آتا اور وہ کسی درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنی غریب الوطنی پر آنسو بہانے پر مجبور ہو،اب سفر کرنا جان جوکھوں میں ڈالنا نہیں بلکہ لطفِ سفر اٹھانا ہے البتہ جب کسی خاص مقصد کے پیشِ نظر سفر کیا جاتا ہے تو مقصدِ سفر سے پہلو تہی نہیں کی جاسکتی، چنانچہ ''مشہد جاں میں اُجالا'' ایسا ہی سفر نامہ ہے جس میں مشاہدہ اور مقصد کا حسین امتزاج ہر مرحلے میں نئے ذائقوں سے روشناس ہوتا ہے، میں ایران کئی مرتبہ جا چکا ہوں، اب سے پہلے ایران اور عراق کا سفرِ زیارت کرتے ہوئے یہ ارادہ کیا تھا کہ جس طرح شام کی زیارات کا سفر نامہ ''دیارِ زینب'' رقم کیا اسی طرح اس سفر کا احوال بھی تفصیل سے لکھا جائے گا چنانچہ ''تکمیل تمنا'' کے نام سے یہ سفر نامہ شائع ہوا، یہ دونوں سفر نامے قارئین نے پسند کیے۔اب اس مرتبہ ایرانی حکومت کی طرف سے جشنوارہِ امام رضا میں شرکت کی غرض سے ایک اور موقعہ میسر آیا، خانہ فرہنگ ایران کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر عباس فاموری کی طرف سے مطلع کیا گیا کہ وہ مجھے ظفر اقبال اور پروفیسر اقبال جسکانی کو مشہدِ مقدس بھیجنا چاہتے ہیں۔ہم سب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور رختِ سفر باندھا۔ .....حسن عسکری کاظمی

قیمت:۲۵۰ روپے، اظہار سنز، لاہور

..... تنقیدی و تجزیاتی زاویے .....

پیشِ نظر کتاب ''تنقیدی و تجزیاتی زاویے'' غازی علم الدین کی وہ پہلی کتاب ہے جس میں غازی کے وقفے وقفے سے لکھے گئے مختلف موضوع کی کتابوں اور رسالوں پر ان کے تنقیدی یا تجزیاتی جائزے پر مبنی مضامین ہیں۔ یہ تمام تحریریں مطبوعہ ہیں اور مختلف رسائل میں چھپ بھی چکی ہیں۔اس کتاب کی فہرست دیکھنے سے بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ غازی علم الدین کا تبحر علمی وسیع اور مختلف النوع ہے۔انہوں نے جہاں افسانوں کی بات کی ہے وہیں شاعری پر بھی محاکمہ کیا ہے، سفر نامہ، داستانِ حیات، ناول، دینی و مذہبی کتب اور رسائل کے مندرجات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ضروری نہیں ہے کہ آپ کو ان کی تمام تنقیدی نگارشات سے کلی اتفاق ہو یا ان کے تجزیے آپ کے لیے قابلِ قبول ہوں مگر جہاں جہاں غازی علم الدین نے محاکمہ کیا ہے اس سے اگر آپ اتفاق نہیں کرتے تو آپ کے اختلاف سے مزید تنقید کا در وا ہو سکتا ہے۔ .....سید معراج جامی

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۲۵۰ روپے، بزم تخلیق ادب پاکستان، کراچی۔

..... قندیلِ اقبال .....

''قندیل اقبال'' میں کچھ مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں جو ایم فل اقبالیات کے دوران لکھے گئے۔فکری نوعیت، تقریری انداز اور عصری تقاضوں کے مطابق مضامین کو الگ گوشہ میں شامل کیا گیا ہے۔یوں تو فکر اقبال کا کوئی گوشہ تشنہ کام نہیں ہے کیونکہ ایک ایک موضوع پر درجنوں کتب مختلف زاویہ میں موجود ہیں۔عصر حاضر مصروفیات کا دور ہے۔یہ مختصر مضامین اقبال شناسی کے باب میں نوجوانوں کے نئے قندیل خیال ہیں۔عابد قریشی، ذوالفقار احسن، اظہر امین شیخ، ذیشان ارشد، حمزہ سلیم، غلام عائشہ اور عظمیٰ عظیم نے کمپوزنگ کی خدمات انجام دیں۔صاحب زادہ شمشاد حسین شاہد اور غلام عائشہ نے حروف خوانی کا مشکل ترین مرحلہ طے کیا۔سعید اللہ صدیق کی شخصیت اور شفقت میرے لیے ہمیشہ حوصلہ افزائی کا باعث رہی۔میں ان تمام احباب کا سپاس گزار ہوں جنہوں نے ''قندیلِ اقبال'' کی اشاعت میں کسی نہ کسی طور پر میرا ساتھ دیا۔

لفظوں کو حسن سوچ کو رعنائی دے گیا اقبال میری قوم کو بینائی دے گیا

..... ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۷۰۰ روپے، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور۔

''چہارسُو''

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
NEW
دو
تاریخی
شاہکار
نظمیں
تحقیق تدوین اور تشریح
ڈاکٹر سید تقی عابدی